خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

اپریل 2013

سالگرہ نمبر



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

اپریل 2013
جلد 40 شمارہ 12
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی سُنی

خواتین ڈائجسٹ کا اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
41 واں سالگرہ نمبر۔
دن ہفتے بنے، ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوئے اور مہینے سالوں کی مسافت طے کرتے گئے۔
لمحہ لمحہ کرکے وقت کا سفر آگے بڑھتا گیا۔
زندگی نے کتنے رنگ بدلے، کتنے ساتھی راہ میں ساتھ چھوڑ گئے۔ بے شمار لوگ ساتھ شامل ہوئے۔ تبدیلی وقت کا لازمی امر اور اللہ تعالیٰ کا صد شکر و احسان ہے کہ یہ تبدیلی خوش آئند ہے۔ خواتین ڈائجسٹ وقت کے ساتھ مقبولیت، پسندیدگی اور کامیابی کی نئی منزلیں طے کرتا رہا ہے۔
خواتین ڈائجسٹ اپنی نوعیت کا پہلا پرچا تھا جس نے خواتین کو سوچ و فکر کی بلندیوں سے روشناس کرایا۔ اُن کی شخصیت میں مضبوطی پیدا کی، انہیں ٹوٹنے بکھرنے سے بچایا، ان کو اعتماد دیا کہ وہ اپنی صلاحیتیں دنیا سے منوا سکیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خواتین ڈائجسٹ نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے اور آج یہ تین نسلوں کا پسندیدہ ترین پرچا ہے۔ مائیں اپنی بچیوں کو خود پڑھنے کے لیے دیتی ہیں اور بچیاں اپنی ماؤں کو اس کی کہانیاں پڑھ کر سناتی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے اور ہم اس کے حضور سجدہ ریز ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی میں سب سے بڑا حصہ ہماری مصنّفین کا ہے۔ انہوں نے خواتین کو اپنی بہترین تخلیقات سے نوازا۔ اپنی تحریروں سے تعمیری اور مثبت طرزِ فکر پیدا کی اور تفریح اور دلچسپی کے عنصر کو بھی برقرار رکھا جو بلاشبہ بہت بڑا کام ہے۔
آج بہت سی مصنّفین ہمارے درمیان نہیں۔ محمود ریاض صاحب جنہوں نے یہ شمع روشن کی، محمود بابر فیصل اور محمود خاور بھی اس دارِ فانی کو الوداع کہہ چکے ہیں۔ ہم ان تمام لوگوں کی مغفرت اور دائمی زندگی میں سکون کے لیے دعاگو ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی ایک خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ ہمیں بہت باصلاحیت، ذہین اور تخلیقی صلاحیت رکھنے والی قارئین کا تعاون حاصل ہے۔ ہماری قارئین کی صلاحیتوں کے گواہ خواتین ڈائجسٹ کے خوبصورت اور منفرد سلسلے ہیں۔
ہم اپنی قارئین کی محبتوں کے مقروض اور تہہ دل سے ان کے ممنون ہیں۔
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ محبتیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں اور خواتین ڈائجسٹ ترقی کی منازل طے کرکے بڑھتا رہے۔
آمین۔

سالگرہ نمبر 2،

بہت سی مصنّفین کی تخلیقات تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر شامل نہ ہو سکیں۔ ان شاء اللہ یہ مئی کے شمارے سالگرہ نمبر 2 میں شامل ہوں گی۔

افسانہ اپنا پن،

بہن آسیہ رزاقی کا نام ہی اچھی تحریر کی ضمانت ہے۔ ایک خاص روایتی تہذیب و اقدار کے پس منظر میں لکھی گئی ان کی تحریریں بڑا بھرپور تاثر رکھتی ہیں۔ اس بار انہوں نے کہانی کے روایتی انداز سے ہٹ کر لکھا ہے۔ اپنائیت، محبت اور ممتا کے رنگوں میں گُھلی یہ تحریر بہن آسیہ رزاقی کے حقیقی رشتوں کی ایک جھلک دکھلاتی ہے۔

اس شمارے میں،

- نعیمہ ناز کا مکمل ناول — تخلیق،
- نگہت سیما کا مکمل ناول — زمین کے آنسو،
- سمیرا حمید اور آمنہ ریاض کے ناولٹ،
- عنیزہ سید اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- آسیہ رزاقی، سعدیہ عزیز آفریدی، عنبرین اعجاز، صباحت یاسمین اور سائرہ غلام نبی کے افسانے،
- باتیں شہزاد شیخ سے،
- کرن کرن روشنی — احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ۔
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

سالگرہ نمبر کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کے لیے منتظر ہیں۔ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دینِ اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگانِ دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کِرن کِرن روشنی

ادارہ

بھوک کی شدت

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو نماز پڑھاتے تو صف میں کھڑے بعض لوگ بھوک کی شدت سے گر پڑتے اور یہ اصحاب صفہ تھے، حتیٰ کہ دیہاتی لوگ کہتے کہ یہ دیوانے ہیں۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوتے تو فرماتے۔
"اگر تمہیں اس اجر کا علم ہو جائے جو تمہارے لیے اللہ کے پاس ہے تو تم اس بات کو پسند کرو کہ تم اس سے بھی زیادہ حاجت اور فاقے میں مبتلا ہو۔" (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا۔ یہ حدیث صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

(1) اس میں علم دین حاصل کرنے والے طلبا کے لیے بڑی نصیحت ہے کہ انہیں ایسے مدارس تلاش نہیں کرنے چاہئیں جہاں دنیاوی سہولتوں کی فراوانی اور وظائف وغیرہ کی ارزانی ہو' بلکہ ایسے مدارس میں تعلیم کے لیے جانا چاہیے جہاں تعلیمی اور تربیتی معیار اچھا ہو' چاہے کھانے پینے کی سہولتوں کی کمی ہو۔
(2) علاوہ ازیں طلبائے علوم دینیہ کے لیے اس میں ایک دوسرا سبق یہ بھی ہے کہ تنگی اور فقر و فاقہ سے وقت گزار لینا اچھا ہے لیکن لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے گریز کیا جائے' جیسے اصحاب صفہ رضی اللہ تعالیٰ نے کردار پیش کیا۔ زمانہ طالب علمی کی خودداری ساری عمر کے لیے انسان کو خوددار اور صابر و قانع بنا دیتی ہے اور اس عمر اور دور میں مانگنے کی عادت عمر بھر انسان کو مانگنے کی ذلت سے دوچار رکھتی ہے۔ علما کا وقار صبر' قناعت اور استغفار میں ہے نہ کہ لوگوں کی جیبوں پر نظر رکھنے اور ان کے سامنے دست سوال پھیلانے میں۔

پیٹ بھر کھانا

حضرت ابو کریمہ مقدام بن معدی کرب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"کسی آدمی نے کوئی برتن اپنے پیٹ سے زیادہ برا نہیں بھرا۔ آدمی کے لیے تو چند لقمے ہی کافی ہیں جو اس کی پشت کو سیدھا رکھیں اور اگر زیادہ ہی کھانا ضروری ہو تو پھر پیٹ کا تیسرا حصہ اپنے کھانے کے لیے تیسرا حصہ پانی کے لیے اور تیسرا حصہ سانس لینے کے لیے ہو۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حسن حدیث ہے۔)

فائدہ؛

اس میں بسیار خوری اور زیادہ شکم پروری سے روکا گیا ہے اور یقیناً "کم خوری صحت کے لیے مفید ہے۔" تمام ڈاکٹر بھی اس امر پر متفق ہیں۔

سادگی

حضرت ابو امامہ ایاس بن ثعلبہ انصاری حارثی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دنیا کا ذکر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا تم نہیں سنتے؟ کیا تم نہیں سنتے کہ سادگی ایمان کا حصہ ہے؟ یقیناً" سادگی ایمان کا حصہ ہے۔" اس سے آپ کی مراد تکلفات اور زیب و زینت کی چیزوں کا ترک ہے۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل؛

(1) اس میں عمدہ قیمتی لباس کے مقابلے میں سادہ لباس کی اور مرغوب، لذیذ اور انواع و اقسام کی خوراک کے مقابلے میں روکھی سوکھی اور سادہ خوراک کی ترغیب ہے کیونکہ انسان جتنا تکلفات دنیا سے اجتناب کرے گا، اتنا ہی وہ آخرت کی تیاری پر متوجہ رہے گا اور جس حساب سے وہ دنیا کی آسائشوں اور سہولتوں میں الجھے گا، آخرت کا دھیان کم ہوتا چلا جائے گا۔

(2) یہ خیال رہے کہ سادگی کا مطلب صفائی سے گریز نہیں ہے کیونکہ صفائی تو خود مطلوب اور نصف ایمان ہے۔ پاکیزگی اور صفائی سے ایک مومن کس طرح صرف نظر کر سکتا ہے۔ سادگی سے مراد تکلف و تصنع سے دامن بچانا ہے۔

صحابہؓ کی تنگ دستی

حضرت ابو عبداللہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بھیجا اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہمارا امیر مقرر فرمایا، (مقصد ہمارے بھیجنے کا یہ تھا کہ) ہم قریش کے ایک قافلے کا تعاقب کریں۔ اور زاد راہ کے طور پر کھجور کا ایک تھیلا ہمیں دیا۔

اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ اور میسر نہیں آیا (ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ضرور دیتے)۔

چنانچہ حضرت ابو عبیدہ ہمیں ایک ایک کھجور دیتے۔ ان سے پوچھا گیا۔

"آپ لوگ اس سے کیسے گزارہ کرتے تھے؟"

انہوں نے فرمایا۔ "ہم اسے اس طرح چوستے جیسے بچہ چوستا ہے، پھر اوپر سے ہم پانی پی لیتے، تو یہ ہمیں پورے دن رات تک کافی ہو جاتا۔ (یعنی ایک کھجور اور پانی ایک دن اور رات کی خوراک ہوتی۔) اور ہم اپنی لاٹھیوں سے درختوں کے پتے جھاڑتے، پھر انہیں پانی میں تر کرتے اور کھا لیتے۔"

راوی بیان کرتے ہیں کہ ہم سمندر کے ساحل پر چلے تو ہمارے سامنے ساحل سمندر پر ریت کے بڑے ٹیلے کی طرح ایک چیز بلند ہوئی، ہم اس کے پاس آئے تو دیکھا کہ ایک بڑا جانور ہے جسے عنبر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

(ہمارے امیر) حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ "یہ مردار ہے۔" (اس لیے ہمارے لیے بیکار ہے)۔

پھر فرمایا۔ "نہیں، بلکہ ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد ہیں اور اللہ کے راستے میں نکلے ہوئے ہیں اور تم اضطرار کی حالت میں ہو، اس لیے کھاؤ۔"

چنانچہ ایک مہینہ ہم نے اسی کے گوشت پر گزارہ کیا اور ہم تین سو افراد تھے یہاں تک کہ ہم فربہ ہو گئے۔ اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اس جانور کی آنکھ کے گڑھے سے تیل کے گھڑے کے گھڑے نکالتے اور اس سے بیل کی مثل یا بیل کے بقدر (گوشت کے) ٹکڑے کاٹتے۔

اور حضرت ابو عبیدہ نے ہم میں سے تیرہ آدمی لیے اور انہیں اس کی آنکھ کے گڑھے میں بٹھا دیا اور اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی پکڑ کر اسے کھڑا کیا پھر ہمارے پاس موجود سب سے بڑے اونٹ پر کجاوہ رکھا اور اسے اس کے نیچے سے گزار دیا اور ہم نے اس کے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر زاد راہ کے طور پر ساتھ لے لیے۔

جب ہم مدینہ پہنچ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس جانور کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"وہ رزق تھا جسے اللہ نے تمہارے لیے نکالا تھا۔ کیا تمہارے پاس اس کے گوشت میں سے کچھ باقی ہے؟ وہ ہمیں بھی تو کھلاؤ؟"

چنانچہ ہم نے اس کا ایک حصہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا جسے آپؐ نے تناول فرمایا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل

(1) اس میں بھی ایک تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تنگ دستی کا ذکر ہے جس سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام کے ابتدائی دور میں گزرے اور اسے انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

(2) اللہ کی طرف سے برکت کے ظہور کی وضاحت کہ شب و روز کے چوبیس گھنٹے صرف ایک کھجور اور پانی پی کر گزار لیتے۔

(3) حالات کے مطابق اجتہاد کی گنجائش کا بیان کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے پہلے تامل کا اظہار کیا بعد میں اپنے اجتہاد سے اس کے برعکس رائے قائم کی اور اسے بطور خوراک استعمال کیا۔

(4) صحابہ کرام کی ولایت کہ اللہ نے معجزانہ طور پر انہیں سمندر کی اتنی بڑی مچھلی عطا کر دی جسے تین سو افراد کا قافلہ ایک مہینے تک کھاتا رہا۔

(5) اس سے معلوم ہوا کہ سمندر کا مردار بھی حلال ہے، جیسے دوسری روایت میں صراحت موجود ہے کہ "سمندر کا پانی اور اس کا مردار، دونوں حلال ہیں۔"

(6) کہتے ہیں۔ یہ مچھلی پچاس پچاس گز لمبی ہوتی ہے۔ وہیل مچھلی بھی اسی طرح بڑی لمبی چوڑی ہوتی ہے۔ سچ ہے۔ "تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔"

برکت

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم خندق والے دن خندق کھود رہے تھے کہ ایک نہایت سخت چٹان سامنے آگئی (جسے توڑنے میں صحابہ ناکام رہے)۔ چنانچہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یہ سخت چٹان خندق میں آگئی ہے (جو ٹوٹنے میں نہیں آرہی)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"(اچھا) میں خود (خندق میں) اترتا ہوں۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور (بھوک کی شدت سے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ اور تین دن ہمارے ایسے گزرے تھے کہ ہم نے کوئی چیز چکھی تک نہیں تھی۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کدال پکڑی اور چٹان پر ماری جس سے وہ ریت کا ٹیلہ ہوگئی یعنی ریت کی طرح ریزہ ریزہ ہوگئی۔

راوی حدیث حضرت جابر کہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے گھر جانے کی اجازت دیں۔"

(چنانچہ میں گھر آیا) اور اپنی بیوی سے کہا۔

"میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی حالت دیکھی ہے جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے کیا تیرے پاس (کھانے پینے کی) کوئی چیز ہے؟"

اس نے کہا۔ "میرے پاس کچھ جو اور ایک بکری کا بچہ ہے۔"

چنانچہ میں نے وہ (بکری کا) بچہ ذبح کیا اور اس نے جو پیسے یہاں تک کہ ہم نے گوشت (پکنے کے لیے) ہنڈیا میں ڈال دیا، پھر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا جبکہ آٹا تیار تھا اور ہنڈیا چولہے پر چڑھی ہوئی پکنے کے قریب تھی۔ میں نے کہا۔ "میں نے تھوڑا سا کھانا تیار کیا ہے اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ تشریف لے چلیے اور ایک دو آدمی ساتھ لے لیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "وہ کھانا کتنا ہے؟"

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تفصیل بتلائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ بہت ہے اور عمدہ ہے۔ تم اپنی بیوی سے کہہ دو کہ میرے آنے تک ہنڈیا چولہے سے اتارے نہ تنور سے روٹیاں نکالے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو خطاب کرکے فرمایا۔ "اٹھو!"

چنانچہ تمام مہاجرین اور انصار اٹھ کھڑے ہوئے۔

حضرت جابر فرماتے ہیں۔ میں (جلدی جلدی) گھر آیا اور بیوی سے کہا۔

"تیرا بھلا ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام مہاجرین اور انصار سب آگئے۔"

بیوی نے کہا۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے (کھانے کی مقدار کی بابت) پوچھا تھا؟"

میں نے کہا۔ "ہاں"۔

بیوی نے کہا۔ "اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتا ہے، تم نے تو انہیں، جو کچھ ہمارے پاس ہے بتلادیا تھا۔"

بیوی کی یہ بات سن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا اور میرے دل کا بوجھ دور ہوگیا اور میں نے بیوی سے کہا۔ "تو نے سچ کہا۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا۔ "اندر آجاؤ اور تنگی نہ کرو۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روٹی کے ٹکڑے کرنے اور ان پر گوشت رکھنا شروع کردیا، اور ہانڈی سے گوشت اور تنور سے روٹی نکال لیتے تو انہیں ڈھک دیتے اور انہیں اپنے ساتھیوں کو پیش کردیتے اور پھر نکالتے (اور اس طرح دوسروں کو دیتے)۔

چنانچہ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم روٹیاں توڑتے اور گوشت نکالتے رہے (اور سب کو دیتے رہے) یہاں تک کہ سب سیر ہوگئے اور اس میں سے کچھ کھانا (پھر بھی) بچ گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جابر کی بیوی سے) فرمایا۔

"تو بھی کھالے اور دوسرے کو ہدیہ بھی بھیج کیونکہ لوگ بھوکے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم اپنی ہنڈیا (چولہے سے) نہ اتارنا اور نہ اپنے آٹے کی روٹی پکانا، یہاں تک کہ میں آجاؤں۔"

چنانچہ میں آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی لوگوں کے ساتھ آگے آگے چلنے لگے حتیٰ کہ میں اپنی بیوی کے پاس آیا (اور اسے سب کے آنے کی خبر دی) وہ مجھ سے جھگڑی۔ میں نے کہا (میرا کیا قصور ہے؟) میں نے تو وہی کیا جو تجھ سے کہا تھا۔ بہرحال رسول اللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔

بیوی نے آٹا نکال کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی، پھر ہماری ہنڈیا کی طرف آئے، اس میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعاب دہن ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی، پھر فرمایا۔

"کوئی روٹی پکانے والی بلالے، وہ تیرے ساتھ روٹی پکائے اور اپنی ہنڈیا میں سے پیالوں میں (سالن) ڈالتی جا، مگر اسے چولہے سے نہ اتارنا۔"

اور یہ سارے (شریک طعام) افراد ایک ہزار تھے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ سب نے کھانا کھایا، یہاں تک کہ کھانا باقی چھوڑ گئے اور چلے گئے اور ہماری ہنڈیا یقیناً" جوش مار رہی تھی، جیسے وہ پہلے ابل رہی تھی، اور ہمارے آٹے سے بھی پہلے کی طرح روٹیاں پک رہی تھیں۔

فوائد و مسائل :

(1) اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سمیت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تنگ دستی اور فقر و فاقہ والی زندگی اور معجزہ تکثیر طعام (کھانا بڑھنے) کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ اکرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مل کر سخت محنت و مشقت والے کام بھی کرتے تھے۔ کاش! ہمارے قائدین اور بڑے لوگ بھی اس اسوہ حسنہ کو اپنائیں۔

(2) ہدیہ دینا مستحب ہے۔ خاص طور پر حاجت اور بھوک کے موقع پر۔

(3) رزق کی کشادگی کے ساتھ ساتھ برکت کی بھی دعا کرنی چاہیے کیونکہ محض کثرت انسان کو کافی نہیں ہوتی جب تک برکت نہ ہو۔

(4) نیک اور خوددار لوگوں کے حالات سے آگاہی رکھنی چاہیے۔ نیز ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا باعث برکت ہے۔

(5) میاں بیوی کے درمیان تلخ کلامی ہوجائے تو ایک دوسرے کو دلائل کے ذریعے سے قائل کرنا چاہیے۔

زخم کا علاج

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

جنگ احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوگئے۔ آپ کا سامنے والے دانتوں کے ساتھ والا دانت ٹوٹ گیا۔ آپ کے سر میں خود ٹوٹ کر گھس گیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کے جسم مبارک سے خون کو دھو کر صاف کرنے لگیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ڈھال میں پانی لاکر ڈال رہے تھے۔

جب فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دیکھا کہ پانی ڈالنے سے خون اور زیادہ بہتا ہے تو انہوں نے ایک چٹائی کا ٹکڑا لے کر جلایا۔ جب اس کی راکھ بن گئی تو وہ زخم پر لگادی تب خون رک گیا۔

فوائد و مسائل : سامنے کے دانت جو بالکل سامنے درمیان میں ہوتے ہیں، ثنایا کہلاتے ہیں۔ ان کے ساتھ کے دانت (ایک دائیں طرف، ایک بائیں طرف) رباعیہ کہلاتے ہیں۔ ان کے بعد دائیں بائیں انیاب ہوتے ہیں جو نوکیلے ہوتے ہیں۔ (ایک ناب دائیں طرف، ایک بائیں طرف) ان کے بعد داڑھیں شروع ہوجاتی ہیں۔

حصیر (چٹائی) عرب میں کھجور کے پتوں سے بنائی جاتی تھی۔ راکھ کھجور کے پتوں کی ہو یا پٹ سن کے بورے کی یا سوتی کپڑے کی، خون بند کردیتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مشکلات کا آنا امت کے لیے سبق ہے کہ وہ حق کی راہ میں آنے والی تکلیفیں خندہ پیشانی سے برداشت کریں اور توحید کا سبق بھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مختار کل نہ تھے ورنہ جہاد کی مشکلات برداشت کیے بغیر سب کو ایک لمحے میں مسلمان کرلیتے۔

☆

ایک سوالنامے کا جواب نامہ

انشا جی

ایک سوالنامے کا جواب نامہ

آج ہمیں ایک بڑا سا جہازی سائز کا کارڈ ڈاک میں ملا ہے۔ جس کے ایک طرف تو ہمارا پتا لکھا ہے۔ مکرمی معظمی وغیرہ القابات کے ساتھ دوسری طرف کارڈ چھاپنے اور بھیجنے والے کا نام ہے۔

خدمت عوام پارٹی۔ (غیر سیاسی)

اس کے نیچے چند سوالات درج ہیں۔

1 ۔ کیا آپ ادارے یا محکمے کا سامان اسٹیشنری وغیرہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے گھر تو نہیں لے جاتے؟

2 ۔ کیا آپ اپنے دفتری اوقات کو خوش گپیوں یا دوستوں کی خاطر تواضع میں تو ضائع نہیں کرتے؟

3 ۔ کیا آپ دفتر کا کام ختم ہو جانے سے پہلے کھسک تو نہیں جاتے؟

4 ۔ کیا آپ اپنے دفتر کا کام جان بوجھ کر تاخیر سے تو نہیں کرتے؟

5 ۔ کیا آپ کسی عزیز یا محترمہ کو اپنے سرکاری ٹیلی فون سے مفت کال کرنے کی اجازت تو نہیں دیتے؟

6 ۔ کیا آپ اپنے دفتر میں کام کرنے والی خواتین کو اس نگاہ احترام سے دیکھتے ہیں جیسے اپنی خواتین کو؟

7 ۔ کیا تنخواہ لیتے وقت آپ کا ضمیر تو کبھی ملامت نہیں کرتا؟

☼ ☼ ☼

بعض لوگ منفی ذہنیت کے ہوتے ہیں' ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ چنانچہ پہلے پانچ سوالات کی حد تک ہمارا جواب اثبات میں ہے۔ بے شک اپنے ادارے کی اسٹیشنری لے جاتے ہیں' لیکن اس پر ذاتی استعمال کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ ایک تو اس لیے کہ زیادہ تر بچوں کے کام آتی ہے' یا اس پر دھوبی کا حساب لکھتے ہیں' سو دھوبی کی ذات اور ہماری اپنی ذات میں فرق ہے' اگر اس اسٹیشنری سے خطوط لکھتے بھی ہیں تو ہر چند کہ خود لکھتے ہیں' لیکن وہ جاتے تو دوسروں کے نام ہیں۔ دوسرے لوگ ہماری ذات کی تعریف میں کیسے آسکتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

دوسرے سوال میں لفظ ضائع کے استعمال پر ہمیں اعتراض ہے۔ بلکہ ہم اس پر احتجاج کرتے ہیں۔ خوش گپیوں اور دوستوں کے لطف صحبت سے دماغ تازہ ہوتا ہے اور اگلے روز کام کرنے کے لیے آدمی تازہ دم اور مستعد آتا ہے۔ اگر اگلے روز بھی وہ احباب آجاتے ہیں تو اس سے اگلے روز سمجھیے۔

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

☼ ☼ ☼

تیسرے سوال کا جواب تو اثبات ہی میں ہے' لیکن کھسکنے کا لفظ یہاں بے محل ہے' ایک سینما میں کوئی صاحب فلم دیکھ رہے تھے' وہ بھی کوئی تعمیری قسم کی' چنانچہ خراٹے لینے لگے' پاس والے نے معترض ہو کر ان کو جگایا اور ملامت کی کہ بھلے مانس خراٹے لے کر دوسروں کی نیند میں کیوں خلل ڈالتا ہے۔ چپکے سے نکل جانے میں بھی کچھ اسی قسم کی مصلحت ہے۔ کوئی دیکھ لے اور پوچھ لے اور بازپرس کرنے لگے تو خود ہی سوچیے اس میں کتنا وقت ضائع ہو گا اور وہ سرکاری وقت ہی ہو گا۔

☼ ☼ ☼



چوتھے سوال کا جواب بھی ہاں ہے اور حکمت اس میں یہ ہے کہ اگر جھٹ پٹ کام کر دیا جائے تو پھر دفتر کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاخیر میں کئی فائدے ہیں' ایک آدمی کا کام کرنے کے لیے پانچ آدمی رکھے جاتے ہیں۔ ملک میں بے روزگاری کم ہوتی ہے۔ تاخیر کے اسباب معلوم کرنے کے لیے کمیشن بیٹھتا ہے۔ اس میں نیا عملہ وملہ بھرتی ہوتا ہے' اس سے بے روزگاری مزید ختم ہو جاتی ہے۔ پانچویں سوال کے جواب میں ہم کہیں گے' یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے' جب کسی محترمہ کو ہم خود مفت کال کرتے' اگر وہ خود آکر مفت کال کرلے تو کیا مضائقہ ہے۔

☼ ☼ ☼

اب رہا سوال نمبر 6' دفتر میں کام کرنے والی عورتیں اگر معمولی صورت کی یا مسن ہیں تو اخلاق کے تقاضے سامنے آجاتے ہیں کہ ان کو مائیں' بہنیں' بیٹیاں سمجھا جائے' ویسے آج کل گھر گھاٹ۔ یعنی گھر اور دفتر میں چنداں فرق نہیں رہا۔

مغرب میں تو عام بات ہے کہ اگر کوئی سیکریٹری خوب صورت ہے تو مستقبل قریب میں اپنے افسر کی گھروالی بن جاتی ہے اور گھر اور دفتر کے پردے اٹھ جاتے ہیں' ساتویں سوال کا جواب ہے کہ جی نہیں۔ ملامت نہیں کرتا۔ کیا مجال ہے کہ کرے' البتہ تنخواہ نہ لیں تو ضرور ملامت کرتا ہے۔

☼ ☼ ☼

یہ سوالات تو ضمنی ہیں۔ کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز خدمت عوام پارٹی ہے' بلکہ اس کا غیر سیاسی ہونا ہے۔ ویسے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

ہم نے بہت سی پارٹیوں' جماعتوں اور تحریکوں کو غیر سیاسی سے شروع ہو کر سیاست کا بھونچا پکڑتے دیکھا ہے۔ خود اس سوال نامے میں سیاست کے جراثیم بہت ہیں۔ کل ان ہی لوگوں کے پاؤں جم گئے تو جھنڈے لے کر نکل آئیں گے کہ دفتروں میں کاہلی' بے ایمانی اور عدم کارکردگی دور کرنے کے لیے ہمیں اپنی صفوں کو منظم کرنا چاہیے اور عوام کی خدمت اور معاشرے کی اصلاح کے لیے اگلے الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے' الیکشن کی بات آئے گی تو دائیں بازو اور بائیں بازو اور اسلام اور سوشلزم کا قضیہ ضرور اٹھے گا' ہم نے تو اس سوال نامے کے بے سوچے سمجھے جواب دے دیے۔

قارئین کو احتیاط چاہیے' کیونکہ بات سے بات نکلتی ہے اور غیر سیاسی سے سیاسی بنتی ہے' سرچشمہ باید گرفتن بہ میل۔۔۔

ایک بزرگ بازار میں جا رہے تھے۔ ایک نوجوان نے انھیں سلام کیا۔ وہ چپ رہے اور جواب نہ دیا۔ بزرگ کے ساتھیوں نے کہا۔

"بھلا آپ نے یہ غیر شرعی حرکت کیوں کی۔ سلام کا جواب دینا چاہیے تھا۔" بولے "تم نہیں سمجھے' میں سلام کا جواب دیتا تو وہ اپنا تعارف کراتا اور کہتا حاجی صاحب آیئے چائے خانے میں چل کر چائے پیجیے' اس کی چائے پی کر اسے چائے پلانا میرا فرض ہو جاتا۔ اس کی میرے گھر میں آمد و رفت شروع ہو جاتی۔ میری ایک جوان بیٹی ہے۔ میں ایسے اوباش نوجوان کو اپنی بیٹی کا رشتہ ہرگز نہیں دے سکتا۔"

☼



شہزاد شیخ سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"شہزاد شیخ۔"

2 "پیار کا نام؟"
"شہزی۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"26 ستمبر 1982ء/کراچی۔"

4 "ستارہ/قد؟"
"لبرا/چھ فٹ دو انچ۔"

5 "تعلیمی قابلیت؟"
"بیچلر کمپیوٹر سائنس اور فلم کے بارے میں کورس کیا ہے۔"

6 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
"ایک چھوٹی بہن ہے۔"

7 "شادی؟"
"جی! میری شادی دسمبر 2012ء میں ہوئی ہے اور میری پسند سے ہی ہوئی ہے۔"

8 "پہلا پروگرام/وجہ شہرت؟"
"آگ ٹی وی کے لیے ڈراما سیریل "ڈریمر" کیا تھا اور شہرت بھی اسی سیریل سے ملی۔"

9 "شوبز میں آمد؟"
"بس اچانک ہی ایکٹنگ کا شوق ہو گیا تھا۔"

10 "سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں؟"
"اپنی سالگرہ کا..... اور ویسے تو ہر دن نیا ہی ہوتا ہے۔"

11 "کبھی نجومی کو ہاتھ دکھایا؟"
"دکھایا تھا بہت پہلے۔ مگر یاد نہیں کہ کیا کہا تھا۔ یہی کیا ہو گا کہ ترقی کرو گے، قسمت اچھی ہے وغیرہ وغیرہ۔"

12 "پاکستان کے کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟"
"کراچی میں تو اپنا گھر ہے ہی۔ مجھے کراچی بہت پسند ہے تو یہیں رہنا ہے مجھے۔"

13 "کس ملک کی شہریت لینے کی خواہش ہے؟"
"میرے پاس امریکا کا گرین کارڈ ہے۔"

14 "کس ملک میں ہمیشہ رہنے کی خواہش ہے؟"
"کسی بھی ملک میں نہیں۔ اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔"

15 "کوئی تحفہ جسے پا کر بہت خوشی ہوئی ہو؟"
"امی اور بابا جو بھی تحفہ دیں۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

16 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"بہت محدود ہے۔ ویسے ہی بہت لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔"

17 "کوئی فیوچر پلاننگ؟"
"آئندہ پانچ سال صرف اداکاری کروں گا۔"

18 "سمندر کو دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"کہ زندگی میں ہم جن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہوتے ہیں، اصل میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔"

19 "مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری؟"
"مطالعہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ پڑھنے سے کچھ نہ کچھ اچھی بات ہی معلوم ہوتی ہے۔"

20 "پاکستانی معاشرے کی اچھی اور بری بات؟"
"دونوں ایک ہی ہے کہ ہم "جذباتی" بہت ہیں۔"

21 "باہر کے معاشرے کی اچھی اور بری بات؟"
"ان کے بارے میں تو میں صرف اچھی بات ہی کروں گا کہ جن باتوں کو ہمیں اپنانا چاہیے، وہ انہوں نے اپنائی ہوئی ہیں۔"

22 "آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟"
"تھوڑا سست ہوں، یہ کمزوری ہے اور طاقت یہ ہے کہ ہمیشہ ایماندار رہتا ہوں۔"

23 "میک اپ کتنا ضروری ہے؟"
"میک اپ بہت ضروری نہیں ہے۔ کم سے کم استعمال کرنا چاہیے۔"

24 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"کوئی آپ کی برائی کرے، کوئی غلط بات کرے، کوئی آپ سے غیر دیانت دار (Dishonest) رہے۔"

25 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"
"موویز بہت دیکھتا ہوں۔"

26 "کس کی یاد تنہائی میں سکون دیتی ہے؟"
"والدہ کی۔"

27 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"قائداعظم۔"

28 "کبھی ہجوم میں اکیلا پن محسوس ہوا؟"
"نہیں! ابھی نہیں ..... اور ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔"

29 "کیا ڈراموں میں فنکار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے؟"
"بالکل ہوتا ہے جی.... اور کری ایشن بھی ہوتی ہے۔"

30 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ ناشتا کرلوں۔"

31 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"

32 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"تھوڑا سا غصہ آجاتا ہے۔"

33 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"امی کے ہاتھ کا۔"

34 "ناشتے میں کیا چیز شوق سے کھاتے ہیں؟"
"آملیٹ۔"

35 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"
"والدہ سے یا بیوی سے۔"

36 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"تو بہت غصہ آتا ہے۔"

37 "آئینے کو کتنا وقت دیتے ہیں؟"
"زیادہ نہیں۔ بس شیو کے وقت آئینہ دیکھتا ہوں اور ڈریسنگ دیکھنے کے لیے....."

38 "کیا آپ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہے ہیں؟"

"بالکل جی..... بالکل۔"
39 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"نماز کے لیے۔"
40 "جب پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟"
"اپنا نام۔"
41 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"لوگوں کو دکھانے کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ لیکن کھا لیتا ہوں۔"
42 "دل کب ٹوٹتا ہے؟"
"جب کوئی مجھ سے میرے ہی منہ پر جھوٹ بولتا ہے۔"
43 "غصہ کب آتا ہے؟"
"جب کوئی غلط اور ناجائز بات کرے۔"
44 "کیا بات بہت جذباتی کر دیتی ہے؟"
"جب اپنے ملک کے خلاف کوئی بات سنتا ہوں تو۔"
45 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب کوئی چیز اچھی نہ لگ رہی ہو..... اور کوئی بلاوجہ فری ہو تو۔"
46 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟"
"عوام کی..... عوام تبدیل ہو جائیں۔ وہ اپنے آپ کو اچھا کر لیں تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔"
47 "کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"
"بالکل..... اکثر غلطی مان لیتا ہوں۔"
48 "پاکستان کے لیے سوچتے ہیں؟"
"میرا دل، میری جان، پاکستان، پاکستان۔"
49 "عام لوگوں سے آپ کی زندگی کتنی مختلف ہے؟"
"کوئی مختلف نہیں ہے۔ میں خود ایک عام انسان ہوں۔"
50 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"پانی۔"

51 "تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتے ہیں؟"
"خود سے۔"
52 "اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکے ہیں؟"
"صرف ایک بار۔"
53 "سفر کے لیے بہترین سواری رکشہ، بس یا اپنی کار؟"
"اپنی کار۔"
54 "کن چیزوں پر بہت خرچ کرتے ہیں؟"
"میں فضول چیزوں پر بہت خرچ کرتا ہوں۔"
55 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟"
"کوئی ایک نہیں..... میں ہر کردار کرنا چاہتا ہوں۔"
56 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"
"اچھی عادت تو ایمان داری اور بری یہ کہ سست بہت ہوں۔"
57 "دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟"
"اپنے دیتے ہیں۔"
58 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش! یہ ہمارا ہوتا؟"
"کبھی ایسا سوچا نہیں۔ کیونکہ اپنے ملک سے بہتر کوئی نہیں۔"
59 "پاکستان میں کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟"
"اللہ کا شکر ہے، ہر چیز کی آزادی ہے۔"
60 "لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟"
"اف..... لائٹ چلی گئی۔"
61 "لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟"
"آپ کے ابا کیسے ہیں۔"
62 "ٹی وی آن کرتے ہی کون سا چینل لگاتے ہیں؟"
"اسپورٹس چینل۔"
63 "اگر آپ اس ملک کے صدر ہوتے تو؟"
"تو عوام کے پاس جا کر ان کے مسائل پوچھتا اور حل کرنے کی کوشش کرتا۔"
64 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"پوری دنیا۔"
65 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرتے ہیں؟"
"رات کے وقت۔"
66 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"ضروری نہیں۔ بار بار بھی ہوتی ہے۔ لیکن سچی محبت لائف پارٹنر سے ہی ہوتی ہے۔"
67 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"جو جتنا مستحق ہوتا ہے۔"
68 "غصے میں آپ کا ری ایکشن؟"
"کوئی خاص نہیں۔ شور نہیں کرتا۔ چپ رہتا ہوں۔"
69 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"یہ ایسے نہ کرتے۔ یہ ویسے نہ کرتے۔"
70 "شہرت کیسی لگ رہی ہے؟"
"بہت اچھا لگ رہا ہے۔ لوگ تعریف کرتے ہیں۔ حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔"
71 "زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟"
"شکر ادا کرتا ہوں کہ فی الحال کس چیز کی کمی نہیں ہے۔"
72 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"کبھی نہیں۔"
73 "کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟"
"تو..... میں بھی گھورنا شروع کر دوں گا۔"
74 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟"
"منحصر ہے دوستوں پر۔ ویسے لڑکیاں بھروسے کے قابل زیادہ ہوتی ہیں۔"
75 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"
"کہ میں صبح جلدی اٹھنا شروع کر دوں۔"
76 "گھر آ کر پہلی خواہش؟"
"گرما گرم چائے مل جائے۔"
77 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"
"میرے خیال میں سب کو لگتا ہے۔"



78 "جھوٹ آسانی سے بول لیتے ہیں؟"
"ایسا لگتا تو ہے۔"
79 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"الیکٹرک سٹی، موبائل فون۔"
80 "اگر موبائل فون نہ ہوتا تو؟"
"تو سکون ہوتا۔ جیسے کسی زمانے میں تھا۔"
81 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"
"فی الحال تو نظر نہیں آ رہی۔"
82 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"
"زیادہ تر سو کے۔"
83 "کون سا تہوار شوق سے مناتے ہیں؟"
"14 اگست۔"
84 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بہت پسند ہے؟"
"کچھ خاص نہیں۔ بس ایک اچھا انسان بننا چاہتا ہوں۔"
"اگر آپ کی شہرت کو زوال آ جائے تو؟"
"اللہ نہ کرے۔ اسے قائم رکھنے کی کوشش کروں گا۔"

ہوائیں لاکھ چلیں، لَو سنبھلتی رہتی ہے
دیے کی روح میں کیا چیز جلتی رہتی ہے
وہ آدمی ہوں، ستارے ہوں یا تمنائیں
ہے کی راہ میں ہرشے بدلتی رہتی ہے

نگار خانہ ہستی میں زندگی کے لاکھوں رنگ ہیں۔ آوازیں، رونقیں، محبتیں، آرزوئیں، تمنائیں، محفلیں، رفاقتیں، دکھ سکھ زندگی کے میلے میں کتنے لوگ ہیں جو ملتے ہیں، بچھڑ جاتے ہیں، اپنی یادیں محبتیں چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ خوش کن لمحات جو خانہ دل میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں وقت کے یہ لمحات زندگی کی شاہراہ پر ایسے انمول نقوش چھوڑ جاتے ہیں جن کی تاب ناکی وقت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اور ایک چراغ سے جیسے سینکڑوں چراغ روشن ہوتے جاتے ہیں۔

قارئین سے ہمارا محبتوں کا، دوستی کا ایک لازوال رشتہ ہے۔ ایک ایسی دوستی جو ہر فرق سے بے نیاز صرف لفظوں کے تعلق کی بنا پر استوار ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی سالگرہ کے موقع پر ہم نے حسب روایت اپنی قارئین سے سروے کیا ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ آپ کی نظر میں سالگرہ کا اہتمام ہونا چاہیے یا نہیں؟ کیا آپ باقاعدہ سالگرہ مناتی ہیں؟ اب تک کی زندگی میں مبارک باد کا سب سے خوبصورت اظہار کس کی طرف سے تھا اور کس طریقے سے کیا گیا؟ کوئی خوبصورت بات یا جملہ؟

2۔ کون سا تحفہ پا کر خوشی ہوتی ہے۔ کتاب، خوشبو، پھول یا زیورات و ملبوسات؟ کبھی ایسا ہوا کہ آپ کو جس کی مبارک باد کا سب سے زیادہ انتظار تھا، وہی بھول گیا؟ آپ کا رد عمل کیا تھا؟

3۔ اس سال شائع ہونے والی تحریر میں سے کون سی تحریریں آپ کو پسند آئیں؟ کوئی خوب صورت اقتباس، جملہ یا شعر جس نے آپ کو متاثر کیا؟

آیئے دیکھتے ہیں، ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

یادوں کی جلتی شمعیں

ادارہ

قرۃ العین ہاشمی... لاہور

1۔ ہر گھڑی اپنی جگہ پر ساعت نایاب ہے
حاصل عمر گریزاں ایک بھی لمحہ نہیں
لفظ معنی ہے
جو ہر لحظ نئے چہرے بدلتا ہے
جانے والا وقت سایہ ہے
کہ جب تک جسم ہے
یہ آدمی کے ساتھ چلتا ہے....
گزرے وقت کے سائے تمام عمر ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہیں.... ہر لمحہ ہر پل اپنی جگہ پہ نایاب ہے مگر "سالگرہ" کا دن اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔

سالگرہ کے اہتمام کی اگر بات کی جائے تو میرا ذہن بہت سال پیچھے چلا جاتا ہے۔ جب ہمارے بچپن میں ہمارے والدین ہماری سالگرہ بہت اہتمام سے مناتے



تھے۔ میری اور میری بہن نور العین کی سالگرہ چار دن کے وقفے سے ایک ہی مہینے میں ہوتی ہے۔ سو ہم اپنی سالگرہ ہمیشہ اکٹھے مناتے تھے۔ سب فرینڈز کو اکٹھے کر کے بہت بڑی پارٹی ہوتی تھی۔ بہت ہلا گلا اور ڈھیر سارے گیمز۔ بڑے ہو کر اس میں بہت چینج آگیا۔ مگر ایک دوسرے کو وش کرنا اور کیک کاٹنا ہمیشہ سے ہمارے گھر میں ہوتا رہا ہے۔ دوستوں کی طرف سے بھی یہ دن میرے لیے ہمیشہ یادگار رہا ہے۔ آخری بار اپنے سب فرینڈز کے ساتھ 2006ء نومبر میں اپنی سالگرہ دو بار منائی تھی۔ ایک بار سب فرینڈز عاصمہ، بتول، خدیجہ، منزہ ریاض اور بہت سے دوستوں نے مل کر اہتمام کر کے سرپرائز دیا تھا۔ ان دنوں ہم لوگ انٹرن شپ کر رہے تھے اور لیکچر کے دوران سلیمان بھائی کی طرف سے آیا ہوا کیک سرپرائز تھا سو سب ڈاکٹرز کے سامنے وہ بھی کاٹا۔ آج بھی ان لمحوں کی یاد ہونٹوں پہ ہنسی لے آتی ہے۔ بہت خوبصورت دن تھے۔

"سب سے خوب صورت اظہار...." ویسے تو "اظہار" کوئی بھی کرے خوب صورت ہی لگتا ہے مگر شادی کے بعد اب تک جتنی بھی سالگرہیں آئی ہیں وہ بہت اچھی اور خوب صورت ہیں اپنے "اظہار" کے طریقے سے۔ ہر سالگرہ پر خوب صورت سا کیک اور ساتھ کوئی بھی سرپرائز گفٹ.... میرے دن کو "امر" کر دیتا ہے۔ میرے شوہر کو سرپرائز گفٹس دینے کا بہت شوق ہے، سو وہ کچھ بھی دیں ان کی چوائس ہر چیز میں بہت اچھی ہے۔ الحمد للہ ہر دور میں مجھے پیار کرنے والے، مجھے میرے ہونے کا احساس دلانے والے ملتے رہے ہیں۔

2۔ "تحفہ" میرے نزدیک وہ ______

اچھی بات یا وش بھی ہے جو مجھے میرے دوست یا پیارے ایس ایم ایس کے ذریعے یا کارڈ دے کر کرتے ہیں۔ میں "لفظوں" میں زندہ رہتی ہوں اور یہ "لفظ" میرے اندر زندہ رہتے ہیں۔ کسی کا آپ کی "سالگرہ" کو یاد رکھنا ہی بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ جہاں تک میری پسند کی بات ہے تو مجھے پیار سے کچھ بھی ملا ہو۔ وہ بہت عزیز ہوتا ہے۔ مگر میرے پسندیدہ گفٹ کی بات کی جائے تو وہ "پھول" اور "کتاب" ہیں۔ جو مجھے اس سال اپنی سالگرہ پر ملے تھے۔ پھول ہر بار ہی ملتے ہیں مگر مجھے یہ امید نہیں تھی کہ میرے شوہر مجھے کتاب بھی گفٹ دے سکتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ مجھے جس کی مبارک باد کا انتظار ہو، وہ ہی بھول جائے۔ میرے چاہنے والوں نے ہر دور میں میرے "دن" کو یاد رکھا ہے اور یہ چیز میرے دل کو بہت سکون دیتی ہے۔



3۔ فی الحال جو تحریر فوراً" ذہن میں آئی ہے وہ "عنیزہ سید" کی "کوہ گراں تھے ہم" بہت خوب صورت تحریر ہے۔ اس کا یہ خوب صورت اقتباس سوچ کے کئی در کھول دیتا ہے۔

"عبادت' سجدوں اور تسبیحوں ہی کا نام نہیں ہے۔ سجدے اور قیام' رکوع اور تسبیح بندگی کی علامت ہے مگر عبادت کے تو کئی رنگ اور بھی ہیں۔ وہ جو اس کی مخلوق کے لیے آسانیاں تلاشتا ہے۔ وہ جو اس کے بندوں کے لیے دل میں بغض اور حسد نہیں رکھتا۔ وہ جو اس کے بندوں کا برا نہیں چاہتا' وہ بھی عابد ہے۔ اس کی عبادت کا بھی ایک درجہ ہے۔ خوب صورت شعر حاضر خدمت ہے۔

"ایک لمحے کو وہ ملا تھا مجھے
میں وہ لمحہ گزارتا ہی نہیں۔۔۔"

شمائلہ تاج۔۔۔ خان پور

1۔ میرے خیال میں سالگرہ کا بہت بڑا نہ سہی مگر چھوٹا سا اہتمام تو ہونا ہی چاہیے جس میں سب لوگ کچھ دیر مل جل کر بیٹھ سکیں' دوسروں کی سنیں' اپنی سنائیں۔ جہاں تک باقاعدہ سالگرہ منانے کی بات ہے تو میں باقاعدہ سالگرہ نہیں مناتی اور اب تک کی زندگی میں سالگرہ کا بہت زیادہ خوب صورت اظہار کسی کی طرف سے نہیں ہوا' سو خوب صورت اظہار کے طریقے کی بات ہی ختم۔

2۔ تحفہ کوئی بھی ہو پا کر خوشی ہوتی ہے۔ مگر کتاب اور خوشبو کا تحفہ پسند ہے۔ زیورات میں بہت ہی کم پہنتی ہوں' کبھی کسی خاص موقع پر وہ بھی ایئر رنگز کی حد تک بس۔ ہاں مجھے چوڑیاں بہت پسند ہیں اور اب کی بار جو میری سالگرہ گزری ہے اس پر میری دوست نازیہ نے مجھے "راجستھانی کنگن" تحفے میں دیا تھا جو کہ مجھے بہت پسند آیا۔

میں ایک پرائیویٹ ادارے میں پڑھاتی ہوں اور وہاں ہم لوگ ذرا سی بات بھی بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ 5 ستمبر 2012ء کی صبح میں بڑے جوش و خروش سے اسکول گئی اور مجھے پورا یقین تھا کہ وہاں سب دوستیں مجھے بہت اچھے طریقے سے وش کریں گی مگر وہاں پہنچ کر مجھے افسوس ہوا کہ وہاں کسی کو بھی میری سالگرہ یاد نہ تھی سوائے حنا کے۔ میں نے حنا کو روک دیا کہ کسی کو بھی نہ بتائے کہ آج میری سالگرہ ہے کیونکہ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ کسی کو یاد بھی آتا ہے کہ نہیں۔ مگر اسی آس میں پورا دن گزر گیا اور چھٹی کا ٹائم آگیا۔ چھٹی کے وقت جب تقریباً" سب لوگ آفس میں تھے تب میں نے بتایا کہ آج میری سالگرہ تھی۔ یہ کہہ کر میں ناراض ہو کر باہر جانے لگی تو سب نے مجھے پکڑ لیا' اف ہمیں کیسے یاد نہ رہا؟ ہائے



ہمیں کیسے بھول گیا؟ وغیرہ بولتی رہیں مگر میں خاموشی سے اسکول سے نکل آئی کیونکہ باہر میرے ابو میرا ویٹ کر رہے تھے۔ میں گھر آئی تو مجھے سب دوستیں ایس ایم ایس کر کے سوری بولتی رہیں مگر مجھے جو افسوس ہوا تھا وہ نہ گیا اور رونا بھی آیا۔

3۔ اس سال شائع ہونے والے ناولز میں سے تین سلسلے وار ناولز مجھے بہت پسند آئے۔ فرحت اشتیاق کا ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" مجھے بے حد اچھا لگا۔ اس کی ہر قسط کا میں نے شدت سے انتظار کیا اور ایک ایک لفظ پڑھا۔ نگہت عبداللہ کا "میرے خواب لوٹا دو" بھی اچھا چل رہا ہے اور نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہ ناول پڑھتے ہوئے بندہ کھو سا جاتا ہے اس میں۔ اور اس پورے سال میں جو ناول مجھے سب سے زیادہ پسند آیا وہ ہے مکمل ناول "آنے والا ہے برف کا موسم" جو کہ سائرہ رضا کی تحریر ہے۔ یہ ناول میں نے سخت سردی میں رات ساڑھے بارہ بجے تک ختم کیا اور پڑھتے پڑھتے کئی بار میری آنکھوں سے آنسو نکلے اس ناول کا ایک اقتباس مجھے بہت پسند آیا۔

"اللہ کی دی ہوئی اتنی بہت ساری نعمتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو ہمیں پل بھر کو خوش کر سکے۔ دکھ یقیناً" پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں سینے پر دھرے۔ خشک بے آب گیاہ۔ ان کے اندر نمی نہیں ہوتی تو کسی چیز کا نمو بھی نہیں ہو پاتا اور خوشیاں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ دریا کے ریت کے اندر پنہاں سنہرے ذرات جیسی۔ ریت کے باریک ذروں میں سے سونا ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے' بہت مشکل کام ہے' دل گردے کا۔ صبر' تحمل' ٹھہراؤ۔۔۔ انتظار' خوشیاں بہت مشکل سے ملنے والے سونے کے ذرات کی طرح ہیں مگر بیٹا! سونا پھر سونا ہی ہوتا ہے۔"

فاطمہ علی غوری عنایت باغ۔۔۔ لاہور

1۔ میرے خیال سے اور میری نظر میں سالگرہ کا اہتمام ضرور اور بھرپور ہونا چاہیے۔ اب تک کی زندگی میں دوستوں اور گھر والوں کی طرف سے ہمیشہ خوب صورت اظہار ہی ملا ہے مگر کبھی کوئی ایسا اظہار نہیں ملا جو آپ اپنے سروے میں پوچھنا چاہ رہی ہیں (ہی ہی ہی ہی)۔

2۔ مجھے تو ہمیشہ جو بھی تحفہ دیتا ہے اسے میرے موڈ کا پتا ہوتا ہے لہٰذا ہمیشہ من چاہی چیزیں مل جاتی ہیں۔ خیر مجھے تو کپڑے بہت اچھے لگتے ہیں۔ پچھلے سال سالگرہ پر بڑی آپی نے بلیک سوٹ تحفہ میں دیا تھا۔ آہا! دل خوش ہو گیا تھا اور بھائی نے چائے کے لیے مجھے ریڈ بڑا سا مگ دیا تھا۔ ہاں مجھے اپنی دوستوں (آمنہ اور سبرینہ) کا سب سے زیادہ انتظار تھا مگر انہوں نے وش نہیں کیا تو میں نے انہیں تو کچھ نہیں کہا' مگر خود بہت



زیادہ روئی۔

3۔ اس سال مجھے تو آسیہ رزاقی کا مکمل ناول "صحیح فیصلہ" اور سائرہ رضا کا مکمل ناول "برف کا موسم" دونوں بے حد پسند آئے اور ان دونوں تحریروں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ "صحیح فیصلہ" سے اقتباس:۔

"تم نے بے دلی سے سیکھا۔ بے دلی سے پکایا میری جان! اگر تم وہاں خوش ہوتیں تو خوشی سے سب کچھ کرتیں۔۔۔ بے دلی سے کیا ہوا کام کسی کو پسند نہیں آتا۔"

"برف کا موسم" سے خوبصورت جملہ:۔

"اس بار خوشی میں مجھ سے لپٹ جانا اور میرا یقین رکھنا۔ میں ڈھے جانے والوں میں سے نہیں۔"

ثمینہ اکرم بہار کالونی.... کراچی

1 میرے پوائنٹ آف ویو سے اگر سالگرہ کا اہتمام گھریلو سطح پر ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس طرح چھوٹی چھوٹی خوشیاں سیلیبریٹ کرنے سے آپس میں مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ یوں کچھ اچھا ٹائم ہم اپنوں کے ساتھ گزار لیتے ہیں۔ سالگرہ کے اہتمام میں نمود و نمائش اور بے جا اسراف کے میں سخت خلاف ہوں۔

جی نہیں، میں باقاعدہ سالگرہ نہیں مناتی اور اب تک کی گزری زندگی میں سالگرہ کی مبارک باد کا سب سے خوب صورت اظہار ہر مرتبہ میری اسٹوڈنٹس کی جانب سے کیا گیا۔ جب 4 مئی کی شام اچانک ہی ڈھیر سارے ریڈ روز بارش کی صورت میرے اوپر نچھاور کیے اور کورس کی صورت میں "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کا نغمہ میرے لیے گایا۔ بچیوں کے اتنے پرخلوص اور محبت بھرے اظہار پر میری آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

2۔ ویسے تو لینے سے زیادہ مجھے تحفہ دینا زیادہ اچھا لگتا ہے، پھر بھی اگر کبھی مجھے تحفہ ملے تو خوشبو اور کتاب پا کر زیادہ خوشی ملتی ہے۔ اگر حدیث یا دینی کتب ہوں تو یہ خوشی دوچند ہو جاتی ہے۔ کپڑے، جیولری کا تو مجھے پہلے بھی کچھ خاص شوق نہ تھا۔ اب معیز کے جانے کے بعد تو یہ بالکل ہی ختم ہو گیا ہے۔ اپنوں کی مبارک باد کا انتظار تو بہرحال ہوتا ہی ہے۔ مگر اسپیشلی ایسا کوئی بندہ نہیں جس کے وش نہ کرنے پر مجھے افسوس ہوا ہو۔

3۔ اس سال شائع ہونے والی تحریروں میں ذاتی طور پر جن ناولز نے میرے دل کو چھوا۔ وہ فرحت اشتیاق کا "سنگ سمیٹ لو" راحت جبیں کا ناول "ساری بھول ہماری تھی" یادگار اور انمٹ نقوش چھوڑ جانے والی تحاریر ہیں اور اب خواتین میں شائع ہونے والا ناول "زمین کے آنسو" ہے، اس میں نگہت سیما جی نے ایک منفرد موضوع کو چنا۔ اپنی تفہیم اور کہانی کی بدولت یہ تحریر لاجواب ٹھہری۔ پسندیدہ

جملہ:۔

"عورت کا اصل عشق اس کی اولاد ہے۔"

"ماں وہ تختی ہے جس پر اولاد سب کچھ لکھ سکتی ہے، مگر ماں صرف "محبت" لکھتی ہے۔"

پسندیدہ شعر:۔

"رات باقی تھی، جب وہ بچھڑا تھا
عمر گزری ہے، رات باقی ہے۔"

انیقہ انا.... چکوال

1۔ سالگرہ اہتمام سے منائی جانی چاہیے یا نہیں، اس کا تعلق ہمارے اندر کے موسم سے مشروط ہے۔ بقول شاعر:۔

اس قدر عشق جنوں خیز کہاں ہوتا ہے
کچھ اثر موسم گل کا بھی ہے دیوانوں پر

تو جب دل کا موسم بہت اچھا ہوتا تھا، میں نے بہت اہتمام سے اپنی سالگرہ منائی ہے۔ سب کو میرے ہاتھ کا بنا کیک بہت پسند ہے مگر خود مجھے نہیں، تو بیکری سے کیک منگوا کر سال 2008ء میں 'لائبریری کی بڑی سی میز پر فائزہ اور میں نے اپنی سالگرہ ایک ہی روز منائی بھی خوب اہتمام سے۔ اس کے بعد۔۔۔ جیسے دل ہی مر گیا۔

"اپنی حالت تباہ کر لی میں نے
میری فطرت بڑی جلالی ہے"

مبارک باد کا خوب صورت اظہار مسکراہٹ اور الفاظ سے بڑھ کر بھلا کیا ہو گا؟ پچھلے برس فائزہ نے جن دعائیہ کلمات سے نوازا تھا، وہ الفاظ آج بھی زندگی کا حاصل لگتے ہیں۔

2۔ تحفہ کوئی بھی ہو، خلوص سے دیا گیا ہو تو بہت اہم ہوتا ہے نا! لیکن بات خوشی کی ہے تو جتنی خوشی مجھے تحفے میں کتاب پا کر ہوتی ہے، اتنی خوشی اور کبھی نہیں ہوتی۔ ایک وقت تھا جب میرے ہاتھ مہندی سے اور کان بالیوں سے کبھی خالی نہیں ہوئے تھے مگر آج۔۔۔ مجھے ان سب چیزوں سے وحشت ہوتی ہے۔ 2008ء میں میم طیبہ نے مجھے "من و سلویٰ" تحفے میں دیا۔ آج بھی اس پر لکھے ان کے الفاظ "مستقبل کی عظیم مصنفہ کے نام" جانے کتنی یادیں دلا جاتے ہیں۔ ایک بار ندیم بھائی نے مجھے مبارک نہیں دی تھی جبکہ مجھے ازحد انتظار تھا، تو بہت بہت دکھ ہوا تھا۔

3۔ سال کا بہترین ناول فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ" رہا۔ سکندر کا شاندار کردار و سراپا، ام کلثوم اور سکندر کی محبت اور شہر روم کی سیاحت۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر فرحت کا انداز بیاں، سب ہی نے مل کر ناول کو شاہکار بنایا۔۔۔ اس کے بعد "سفال گر" جو کتابی شکل میں میرے سامنے ہے۔ سائرہ رضا نے جو لکھا خوب تر لکھا۔ اور ہاں صائمہ اکرم کا "ابن آدم" بھی غضب کی تحریر تھی اور اب عنیزہ سید کا سلسلہ وار ناول "جو رکے تو۔۔۔"

اب ذکر اقتباس کا تو "سفال گر" کے آغاز میں بشریٰ سعید کے الفاظ۔۔۔

"انسان شخصی ارتقاء کے ابتدائی دور میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازار حیات کی "مانگ" کو مدنظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر برتن کے بدن پر ریتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔"

اور ان دنوں جون ایلیا کے یہ دو اشعار بہت بھائے۔

کتنے دل کش ہو تم، کتنا دل جُو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

اے شخص میں تیری جستجو سے
بے زار نہیں، تھک گیا ہوں!

امبر گل.... جھڈو

1۔ جی جناب! پہلے سوال میں ہی 4 سوال چھپے ہوئے ہیں تو سب سے پہلے کا جواب تو یہ ہے کہ میرے

حساب سے اگر ایک شخص کے لیے اس کے گھر والے یا پھر دوست وغیرہ اس کو سرپرائزنگ گفٹ دے دیتے ہیں یا پھر اس کے لیے اس کا پسندیدہ کیک اور کھانا تیار کرتے ہیں تو اس کے علاوہ کچھ نہیں ہونا چاہیے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جی! جیسی سالگرہ میری ہوتی ہے اس کو ہم باقاعدہ تو نہیں، البتہ بے قاعدہ ضرور کہہ سکتے ہیں لیکن اس بار تو وہ بھی نہیں ہوئی، وہ اس لیے کہ امی جو ہمارے ساتھ نہیں تھیں تو ابو جی جو ہمیشہ میری سالگرہ پر کیک منگواتے ہیں، اس بار وہ کہنے لگے کہ نہیں اب نہیں منگواؤں گا سو اس بار کچھ بھی نہیں ہوا۔

تیسرا جواب ہے کہ مجھے آج تک جن جن دوستوں نے مبارک باد دی ہمیشہ دل سے ہی دی ہے اور ہمیشہ ہی بہت خوب صورت لفظوں سے میرے لیے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ البتہ بات اگر کسی اچیشل پرسن کے حوالے سے ہو رہی ہے تو جناب ایسا تو کوئی ہے ہی نہیں۔ تحفے میں میری فرسٹ چوائس کتاب ہی ہے۔ اس کے علاوہ خوشبو اور ملبوسات بہت پسند ہیں اور یہ بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری دوستیں بہت اچھی ہیں سب سے زیادہ مجھے کتابیں مہرین، نوشین اور آسیہ کی طرف سے ملی ہیں۔ شکریہ دوستو!

ایسا تب ہوا تھا جب میری بیسٹ فرینڈ مہرین کی شادی کے بعد میری برتھ ڈے آئی تو مجھے بہت شدت سے انتظار تھا اس کا اور یقین بھی تھا دل کو کہ وہ آئے گی، پر نہ وہ خود آئی اور نہ ہی اس نے گفٹ بھجوایا۔ بس وہ دن ہے اور آج تک میری وہ دوست ہمارے ہی محلے میں ہمارے قریب بیاہ کر آنے کے باوجود ابھی تک ہمارے لیے پرائی ہی ہے۔

3۔ تحریریں تو اتنی ساری پسند آئی ہیں کہ کس کی انسان تعریف کرے اور کس کو چھوڑ دے۔

اقتباس تو نہیں البتہ پسندیدہ شعر کہہ دیتی ہوں۔

"ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے
لیکن وہ میرے خواب، میرے خواب، میرے خواب"

فائزہ شیخ عباس..... کراچی

1 ۔ جی ہاں سالگرہ کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔ خوشی منانے میں کیا حرج ہے۔ اس روز گھر میں امی جان قرآن خوانی کا اہتمام ضرور کرتی ہیں۔ میں باقاعدگی سے سالگرہ مناتی ہوں، اپنی بھی اور دیگر فیملی ممبرز کی بھی۔ کچھ عرصے قبل میرا رشتہ طے ہوا تھا۔ دو سال بات رہی، مگر اب وہ ختم ہو گیا ہے۔ چند فیملی پرابلمز کی وجہ سے، تب تو ہر جملہ اور ہر اظہار ہی خوب صورت لگتا تھا۔

2 ۔ سب سے زیادہ تحفہ کتاب پسند ہے۔ پھول پا کر بھی بہت خوشی ملتی ہے، نت نئے لباس کی بھی بہت شوقین ہوں۔ (فرینڈز نوٹ کرلیں) شادی کے بعد بڑی بہن (صبا یاسر) لاہور چلی گئیں، ان کی طرف سے فون کا انتظار رہتا ہے، جب وہ وش نہ کریں تو سخت خفا ہو جاتی ہوں۔

3 ۔ میں نے نیا نیا خواتین ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا ہے۔ دراصل جب سے میری منگنی ٹوٹی میں بہت ڈپریسٹ ہو گئی تھی، زندگی سے بے زار، مگر میری ٹیوشن ٹیچر (ثمینہ اکرم) نے مطالعہ کی طرف راغب کیا اور بہت سے خواتین اور شعاع پڑھنے کو دیے جن کے مطالعے سے میری زندگی میں ایک نئی تبدیلی آئی کہ سب کچھ منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اس کی سبق آموز کہانیوں سے میں بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اب خود خرید کر پڑھنا شروع کر دیا ہے اور اس کے پچھلے پرانے رسالے بھی زیر مطالعہ ہیں۔ مجھے "وہ گراں تھے ہم زمین کے آنسو" بہت پسند ہیں۔ پسندیدہ جملہ۔ "اگر مرد کے ذہن میں شک آجائے تو اس کی عقل رخصت ہو جاتی ہے۔" (چارہ گر) پسندیدہ شعر۔

"اپنے ماضی کی تصور سے ہراساں ہوں میں
اپنے گزرے ہوئے ایام سے نفرت ہے مجھے"





ثنا میر سے ملاقات

شاہین رشید

صنف نازک کے الفاظ سنتے ہی تصور میں چوڑیوں سے بجے حنائی ہاتھوں والی، بجی سنوری، شرماتی لجاتی ایک ناری چھم سے آ دھمکتی ہے۔ تاہم یہ صنف نازک اپنے اندر عزم و ہمت کا ایک جہان بھی آباد رکھتی ہے۔ خاص طور پر آج کی عورت نے زندگی کے کئی محاذوں پر بہ یک وقت نبرد آزما ہو کر صنف نازک کے اس روایتی تصور کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ ماضی میں وہ شعبے جو صرف مردوں ہی سے وابستہ سمجھے جاتے تھے۔ آج کی عورت ان شعبوں میں بھی بے مثال کامیابیاں حاصل کر رہی ہے۔ کرکٹ خالصتاً" مردانہ کھیل سمجھا جاتا تھا۔ تاہم جب ڈوئی تھامنے والے ہاتھوں نے گیند اور بلا تھاما تو یہاں بھی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔ ہماری وومن کرکٹ ٹیم بھی ماشاء اللہ بہت اچھی کارکردگی دکھا رہی ہے اور کیپٹن ثنا میر سب لڑکیوں کو ساتھ لے کر بڑی ذمہ داری کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گزشتہ پانچ سال سے قومی ٹیم کی کپتان ہیں۔

"جی ثنا میر! کیسی ہیں آپ؟"

"جی! اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا مصروفیات ہیں آج کل آپ کی؟"

"آج کل ہمارا انٹر ڈسٹرکٹ ہو رہا ہے۔ اسی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ان دنوں پریکٹس میچز ہو رہے ہیں۔"

"عنقریب کون سا ٹورنامنٹ ہے آپ کا؟"

"اپریل میں ہماری نیشنل چیمپئن شپ ہے تو اسی کے لیے تیاری ہے۔ اس کے لیے پہلے انٹر ڈسٹرکٹ

ہوتا ہے۔ ٹیم بنتی ہیں ریجن کی۔ 2 اپریل سے ان شاء اللہ ذرا مختلف قسم کی نیشنل چیمپئن شپ ہوگی جس میں گریڈ ون اور گریڈ ٹو کی کرکٹ ہوگی اور یہ میچز لاہور اور اسلام آباد میں ہوں گے۔"

"ورلڈ کپ آپ لوگ ہار کر آئیں۔ گزشتہ دنوں کیا ہوا تھا' جو ٹیم اتنی بری طرح ہاری کہ ساتویں پوزیشن میں آئی؟ جبکہ ٹیم تو بہت اچھی ہے؟"

"دیکھیں جی! ہار جیت تو کھیل کا حصہ ہوتا ہے۔

اس ٹورنامنٹ میں دنیا کی بہترین ٹیمیں آئی تھیں۔ خاصا مشکل ٹورنامنٹ تھا۔ پچاس اوورز کا میچ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم لوگوں نے بہت زیادہ کرکٹ نہیں کھیلی ہے۔ خاص طور پر پچاس اوورز کی' ہم زیادہ تر ٹی ٹوئنٹی کھیلتے ہیں اور پھر مسئلہ یہ تھا کہ چونکہ لاہور میں بہت زیادہ بارشیں ہوتی تھیں تو ہم پریکٹس بھی ٹھیک طرح سے نہیں کرپائے تھے اور کراچی سیکیورٹی کنڈیشن ایسی نہیں تھی کہ ہم کراچی میں پریکٹس کے لیے آتے۔ ہمیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ہمارا کیمپ جو دس دن کا تھا اس میں ہمیں صرف چار دن پریکٹس کے ملے' کیونکہ بارشیں بہت زیادہ تھیں ——— اور پھر یہ وجہ تو میں نے آپ کو بتا ہی دی کہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے ہم نے پچاس اوورز کی کرکٹ نہیں کھیلی تھی۔"

"واقعی ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں آپ کی کارکردگی بہت عمدہ تھی؟"

"جی! ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں ہم نے انڈیا کو ہرایا تھا اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہم نے اس ورلڈ کپ کی تیاری بہت کی ہوئی تھی۔ اس لیے کامیابی ہوئی۔ اس ٹورنامنٹ کی بات میں پھر سے کروں گی کہ ہمیں تو یہی نہیں معلوم تھا کہ ہم یہ ٹورنامنٹ کھیلیں گے بھی یا نہیں۔ انڈیا بھی جاسکتے ہیں یا نہیں۔۔۔ تو جہاں اس قسم کے خدشات ہوں' وہاں پھر کامیابی کی امید کہاں ہوتی ہے۔۔۔ مگر پھر بھی اگر آپ ہماری کارکردگی دیکھیں تو میں اپنی ٹیم کی کارکردگی سے بہت مطمئن ہوں۔ کیونکہ باؤلنگ' بیٹنگ اور فیلڈنگ بہت اچھی رہی ہے اور آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ آسٹریلیا کو 176 رنز پہ پہلی مرتبہ بیس سال کی ہسٹری میں ہم نے آؤٹ کیا۔۔۔ اس ریکارڈ کو کوئی نہیں دیکھتا۔ مگر ہار کو سب نے دیکھ لیا۔"

"ظاہر ہے کہ اپنی ٹیم سے سب کو توقعات ہوتی ہیں۔ مگر آپ شکر کریں کہ میڈیا نے آپ کی زیادہ کھنچائی نہیں کی جس طرح میل (Male) کرکٹرز کی ہوتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں۔ کھنچائی تو ہماری بھی بہت ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ آپ لوگ میل کرکٹرز سے ہمارا موازنہ کرتے ہیں' جو بالکل غلط ہے۔ کیونکہ جتنی کرکٹ وہ کھیلتے ہیں اور جتنی سہولیات ملتی ہیں اس کے مقابلے میں تو ہماری ابھی شروعات ہیں اور جو موازنہ کرتے ہیں ان کو چاہیے کہ پہلے وہ وومن کرکٹ پہ ہوم ورک کریں کہ کب سے وومن کرکٹ شروع ہوئی ہے اور ان کو کیا کیا سہولیات دی گئی ہیں اور وومن کرکٹرز کے کیا مسائل ہیں۔ ہماری ٹیم کو بنے ہوئے تو ابھی صرف سات سال ہوئے ہیں اور آپ ہمارا مقابلہ اس ٹیم سے کرتے ہیں جن کو بنے ہوئے پچاس' ساٹھ سال ہوگئے ہیں۔"

"ایسا نہ کہیں کہ میڈیا صرف تنقید کرتا ہے۔ میڈیا آپ کا ساتھ بھی بہت دیتا ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ انڈیا سے جیت کے وقت کیا احساسات تھے؟"

"آپ بھی میڈیا کا حصہ ہیں۔ آپ کے ذریعے ہم اپنی بات نہیں پہنچائیں گے تو پھر کس کے ذریعے سے پہنچائیں گے؟ اور رہی بات انڈیا سے جیت کی تو میں آپ کو بتاؤں کہ جب انڈیا ٹی ٹوئنٹی کے ورلڈ کپ میں آئی تو وہ نمبر 3 ٹیم تھی ورلڈ کپ کی اور ہم نے نمبر 7 سے ورلڈ کپ کا اسٹارٹ لیا تھا۔ یوں دنیا کی نمبر 3 کی ٹیم کا مقابلہ دنیا کی نمبر 7 سے تھا اور ہم نے ان کو ہرایا تو ہمارے لیے تو یہ ایک بہت ہی یادگار لمحہ تھا۔۔۔ اور میں

بقیہ صفحہ 284 پر

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ



بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا، جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آ رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آ گیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آ کر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آ گئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو قلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کر کے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتا کر ہی کہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ماہ نور کو یہ سب اچھا تو لگا، مگر اس نے سعد کو منع کر دیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے ہی اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے تنگ کر اپنے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہو گیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے قلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں، جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے لچکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر اسے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہو گئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر رہ گئی۔

آپا رابعہ، سعدیہ سے صاف لفظوں میں کہہ دیتی ہیں کہ وہ اسے آگے نہیں پڑھا سکتیں۔ سعدیہ کے مزاج میں مستقل برہمی آ جاتی ہے۔

ماہ نور، سعد کو اپنے گھر لے جاتی ہے۔ فائزہ کا سرد اور دوٹوک انداز سعد کو کچھ اچھا نہیں لگتا، مگر کھاری اور ماہ نور کے تایا، تائی سے مل کر اسے بہت خوشی ہوتی ہے۔ کھاری اور رضوان الحق کی بہت اچھی دوستی ہو جاتی ہے۔ سارہ کے ہاتھوں میں مشاقی آتی جا رہی ہے۔ یمی آنٹی اسے سراہتی ہیں اور باتوں باتوں میں اسے کریدتی ہیں کہ وہ رکو کو پسند کرتی تھی۔ سارہ انہیں مبہم سا جواب دیتی ہے۔ جس میں یہ بات نہایت واضح ہوتی ہے کہ سعد اس سے سچی محبت کرتا ہے۔

سعد، ماہ نور کے ساتھ خدیجہ اور فاطمہ خالہ سے ملنے جاتا ہے۔ ادھر شہناز کا ذکر نکل آتا ہے۔ سعد اس گفتگو میں دلچسپی لیتا ہے جسے فاطمہ محسوس کرلیتی ہیں۔ پرانا البم دیکھتے ہوئے سعد "قلزا ظہور کی تصویر فوراً" پہچان لیتا ہے۔

چوہدری صاحب نے کھاری کا سعدیہ کلثوم سے رشتہ طے کر دیا۔ آپا رابعہ اور مولوی صاحب بہت خوش ہوتے ہیں۔ سعدیہ اس گھر سے جان چھوٹنے پر مطمئن ہوتی ہے، جبکہ کھاری حیران اور پریشان ہے۔ وہ بہت انکار کرتا ہے، مگر کوئی اس کی بات نہیں سمجھ پاتا۔ کھاری، رضوان کو اور ماہ نور، سعد کو کھاری کی شادی کی دعوت دیتی ہے۔ سعد، ماہ نور کے علم میں لائے بغیر فاطمہ سے ملنے جاتا ہے اور چند باتیں پوچھتا ہے۔ آپا رابعہ فارم ہاؤس میں داخل ہوتی ہیں۔ سعد پر نظر پڑتے ہی وہ چونک جاتی ہیں۔

تیرہویں قسط

آپا رابعہ نے چہرے پر آتے پسینے کو دوپٹے سے پونچھا۔ موسم معتدل تھا مگر نجانے کیوں انہیں بار بار چہرے پر پسینہ آ رہا تھا۔ ان کا دل بھی معمول سے زیادہ تیز رفتاری سے دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے دل کی تیز دھڑکن سے گھبرا کر سر اٹھا کر اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ ایک بالکل نامانوس جگہ پر بیٹھی تھیں۔

چودہ ضرب بارہ کے اس کمرے کے فرش پر سفید ٹائل جڑے تھے اور شیشم کی لکڑی سے بنا ایک ڈبل بیڈ بچھا تھا۔ اسی لکڑی کا سنگھار میز اور دو سیٹوں والا صوفہ رکھا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر ہاتھ سے بنی تصویریں اور

دستکاری کے نمونے وال ہینگنگ کی شکل میں سجے تھے۔ کھڑکیوں پر ہلکے نیلے رنگ میں بھاری پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے کا مجموعی تاثر اچھا تھا اور آرام دہ بھی۔ مگر آپا رابعہ کو نئے ماحول کی نامانوسیت کے علاوہ کوئی اور احساس بھی بے چین کر رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے دیکھا ایک منظر بار بار ان کی نظروں کے سامنے آتا اور گزر جاتا تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھیں۔ کیا واقعی انہوں نے کچھ دیکھا تھا یا وہ محض نظر کا دھوکا تھا۔ وہ یہاں سعدیہ کا نکاح کرانے کے لیے آئی تھیں مگر انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دل کی ایک الجھن سے نجات حاصل کرنے کے دوران کسی نئی الجھن کا شکار ہو گئی تھیں اور یہ نئی الجھن کسی شکاری کے مضبوط پھندوں والے جال کی طرح تھی جس نے بے خبری میں ہی ان کے دل کو اپنے قابو میں لے لیا تھا۔ وہ اس رہائشی کمرے تک آتے آتے یہ تو بھول گئی تھیں کہ وہ یہاں دراصل کس کام سے آئی تھیں۔



فارم ہاؤس کے جس حصے میں وہ کمرا تھا' جہاں آپا رابعہ بیٹھی بے خبری میں خود پر آپڑنے والے جال کی گرہیں ہاتھوں سے کھولنے کی کوشش میں مصروف تھیں' اس کمرے کے عین مخالف پر بنے کمروں میں چودھرائن صابرہ اپنا ڈیرا جمائے بیٹھی تھیں۔

صابرہ کو رونقیں، محفلیں گانا بجانا اور زرق برق لباسوں میں خاصی دلچسپی تھی۔ کھاری کی شادی کی شکل میں انہیں ایک نیا مشغلہ ہاتھ لگا تھا۔ کھاری اگرچہ زیادہ تر فارم ہاؤس میں رہتا تھا مگر صابرہ اپنے اکثر کام اسی سے کرواتی تھیں اور اس سے خاصی مانوس بھی تھیں۔ پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے وہ سوچ رہی تھیں کہ جب کبھی کھاری کی شادی کے متعلق سوچ بچار چلے گی وہ اپنی مصاحبہ خاص رضیہ کا نام پیش کریں گی۔ رضیہ بارہ سال کی عمر سے ان کی خدمت کر رہی تھی۔ وہ ان کے میکے سے ان کی خدمت کے لیے بھجوائی گئی تھی اور انہیں اس کے سہارے کی خاصی عادت ہو چکی تھی۔

فارم ہاؤس اور گھر کے ملازموں کی شادی بیاہ ہوتے ہی رہتے تھے۔ چوہدری صاحب ایسے موقعوں پر اپنے ان ملازموں کی جن کی شادی ہونے والی ہوتی تھی مقدور بھر مدد کرتے تھے ملازم اپنے آبائی علاقوں میں جاتے بیاہ کرا کر کبھی اپنی بیبیاں ساتھ لے آتے' کبھی پیچھے ہی چھوڑ آتے۔ ملازم لڑکیوں کو باقاعدہ جہیز دیا جاتا اور ان کی فارم ہاؤس' ڈیرے یا گھر سے رخصتی ہو جاتی۔ مگر کھاری ایسا لڑکا تھا جس کی حیثیت باقی لوگوں سے مختلف تھی۔ چوہدری صاحب نے نہ تو اسے باقاعدہ متبنیٰ بنایا تھا نہ ہی اسے ملازموں والا درجہ دے رکھا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ کھاری چوہدری صاحب کو بے حد عزیز ہے۔

اپنی کوئی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے صابرہ کو بھی نجانے کیوں کھاری ایسے عزیز تھا جیسے کوئی بہت اپنا بے سہارا بچہ عزیز ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے تئیں کھاری اور رضیہ کی شادی کا پکا منصوبہ بنائے بیٹھی تھیں۔ چوہدری صاحب کے اس فیصلے نے کچھ دن انہیں دل ہی دل میں ناراض بھی کیے رکھا تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی سے انہیں ایک بلاوجہ کی پرخاش بھی تھی' جو کھاری کے سعدیہ سے نکاح کا سوچ کر ان کا حلق مزید کڑوا کرتی رہی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک کوئی بات دل سے لگائے رکھنے کی عادی نہیں تھیں۔ جلد ہی بری کی تیاری' ہلے گلے' ناچ گانے اور رونقوں کے تصور نے ان کے دل سے ناگواری کا یہ احساس ختم کر دیا تھا۔

جب ہی اس وقت وہ پوری تیاریوں اور رونقوں کے درمیان کرن لگے دوپٹے اور گوٹے کے پھولوں سے سجے سوٹ میں ملبوس' اپنا قیمتی زیور پہنے ہنس ہنس کر گاؤں کی رہائشی خواتین سے مبارک بادیں وصول کر رہی تھیں اور گانے بجانے پر مامور لڑکیوں کو مزید رونق لگانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔

"یہ کیا بات ہوئی تائی جی! یہ گھنگھروں والا پراندہ میرے بالوں میں ٹک ہی نہیں رہا۔" تقریب کی مہمان خاص ان کے دیور کی بیٹی جو انہیں دل سے بہت پیاری تھی' اس نے منہ بناتے ہوئے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہائیں صدقے جاؤں' کیوں نہیں ٹک رہا؟" وہ ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بولیں۔

"نی شمسہ! بھاگ کے جا کنگھا لے کر آ۔ میں خود ماہ نور کے بالوں میں پراندہ ڈالتی ہوں۔ تم ساری تو نکمی ہو بالکل۔" انہوں نے ماہ نور کو اپنے آگے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کسی کو آواز لگائی۔

"پراندہ بھاری ہے جی' ماہ نور باجی کے بال ہلکے بھی ہیں اور چھوٹے بھی' اسی لیے نکل جاتا ہے۔" کسی لڑکی نے قریب سے کہا۔

"تو کیا ہوا' میرے سنگھار میز پر کالی سوئیوں کا پتار کھا ہے' جا فٹافٹ وہ لے آ۔ مجھے پتا ہے پراندہ کیسے لگاتے ہیں ہلکے اور چھوٹے بالوں میں۔"

انہوں نے یہ بات کہنے والی کو گھُر کا اور کچھ دیر بعد انہوں نے سلیقے سے ماہ نور کے بالوں میں یوں پراندہ ڈالا کہ نہ تو بال اپنی جگہ سے باہر نکل رہے تھے نہ پراندہ نیچے لٹک رہا تھا۔

"ماشاء اللہ!" پراندہ ڈالنے کے بعد ماہ نور کو اپنے سامنے کھڑا کر کے دیکھتے ہوئے انہوں نے خوش ہو کر کہا۔ ہلکے نیلے اور ہلکے شفق رنگ کے امتزاج سے بنے شیفون کے سوٹ میں جس کی قمیص اور دوپٹے پر سلور مقیش لگی تھی' وہ نظر لگ جانے کی حد تک انہیں پیاری لگی۔

"کاش! ایک ہی سہی مگر ماہ نور سے بڑا میرا کوئی بیٹا ہوتا۔" ان کے دل میں پرانی ہُوک نے سر اٹھایا۔

"خیر! اللہ نصیب اچھے کرے اس کے' اتنی پیاری' معصوم اور اچھے گنوں والی بچی جس کا بھی نصیب ہو گی وہ خوش قسمت ہو گا بہت۔" اگلے لمحے انہوں نے دل سے ہُوک کو جھٹکتے ہوئے سوچا اور دوبارہ لڑکیوں کے گانے بجانے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"چٹا ککڑ بنیرے تے

کاسنی ڈوپٹے والیے۔۔۔ منڈا عاشق تیرے تے۔"

ڈھولک کی تھاپ پر دیہاتی لڑکیاں صدیوں پرانے ٹپے گا رہی تھیں۔ "یہ تو سچ ہے مولوی کی بیٹی پر کھاری عاشق ہی تو تھا جب ہی کتنی چالاکی سے مولوی اور اس کی بیوی نے چوہدری صاحب کو پھنسا لیا۔" صابرہ نے یہ ٹپہ سنتے ہوئے دل میں سوچا۔



اس کمرے سے باہر شور تھا' ہنگامہ اور گہما گہمی کا احساس۔ فارم ہاؤس کے رقبے میں سب سے بڑے خالی قطعے پر بڑی کینوپی لگا دی گئی تھی۔ یہ کینوپی اندر سے سفید اور جھالردار تھی۔

"سفید کینوپی کے اندر روشنیاں زیادہ خوبصورتی سے منعکس ہوتی ہیں۔"

یہ چوہدری صاحب کا آئیڈیا تھا۔ گدی والی چیری کرسیوں پر سرخ اور کاسنی غلاف چڑھائے گئے تھے۔ کھاری کے نکاح کے لیے اسٹیج بھی بنوایا گیا تھا۔

نکاح کا دن مہندی کا دن بھی تھا۔ اسٹیج پر زرد رنگ کی بہار تھی۔ گیندے کے پھول اور پیلے رنگ میں قالین اور

صوفے جن کے پیچھے زرد اور پیلے پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ مٹی کی منقش گھنٹیاں بھی اسٹیج کے آگے لٹک رہی تھیں۔ ہر طرف پھولوں کی بہار تھی اور گاؤں کے سیدھے سادے دیہاتی مہمان کھاری اور مولوی صاحب دونوں کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

"کھاری بھی لاوارث اور مولوی صاحب کا تو کوئی آگا پیچھا ہے ہی نہیں' مگر دیکھ لو! اللہ نے چوہدری صاحب کے دل میں نیکی ڈال کر کیسے رنگ لگائے ہیں دونوں کو۔" لوگ آپس میں بات کر رہے تھے۔

کھاری کی شادی کے لیے گاؤں کے ہر فرد کو مدعو کیا گیا تھا۔ اور سب کے لیے فارم ہاؤس کا مرکزی دروازہ کھول دیا گیا تھا۔

اس سارے شور ہنگامے' سرگوشیوں' غیبتوں سے الگ تھلگ وہ اپنے اس چھوٹے سے کمرے میں خاموش بیٹھا تھا۔ وہ تنہا تھا اور اس کے کمرے میں اندھیرا بھی تھا۔ وہ افتخار احمد عرف کھاری تھا جس کی وجہ سے فارم ہاؤس میں اتنی بڑی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ معاملہ صرف مولوی سراج کی بیٹی کا ہوتا تو بہت کچھ دے دلا کر فرض سے سبک دوش ہونا کافی سمجھ لیا گیا ہوتا' مگر مولوی سراج کی بیٹی کی شادی کھاری سے طے کر کے چوہدری سردار بھی شاید شغل میں آگئے تھے' انہیں اس شادی کو یادگار بنانے کے لیے ہر دوسرے منٹ میں کوئی نئی بات سوجھ جاتی تھی۔

مگر جس کے لیے وہ یہ سب کر رہے تھے' وہ تنہا بیٹھا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا سوچے اور کتنا سوچے کہ بنا خواہش بنا انتظار اس کی شادی ہونے لگی ہے۔ یا اس حقیقت پر جھوم جھوم جائے کہ ایک لاوارث لڑکا ہوتے ہوئے بھی اس کے نصیب میں اس دھوم کی شادی لکھی گئی تھی کہ جس کا تصور اچھے خاصے کھاتے پیتے معزز گھرانوں کے لڑکے بھی نہیں کر سکتے تھے..... یا اس بات پر لڈی ڈالے کہ وہ بھین جی جو اسے علم کے نور کا مینارہ اور بہت اعلا ہستی نظر آتی تھیں' وہ ان کا داماد بننے جا رہا تھا۔ اس کے پاس خوشی کے عالم میں ناچ اٹھنے کے لیے بہت سی وجوہات تھیں مگر اس کے برعکس اس کی سوچ کا دائرہ ایسی حقیقتوں کے گرد گھوم رہا تھا جو اس کا دل دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈبو دینے کے لیے کافی تھیں۔ اسے ہمیشہ زندگی کے ہر ہر موڑ پر یہ خیال آتا رہا تھا کہ وہ ایک بے شناخت انسان تھا۔ اپنے ماں باپ اور ایک خاندان سے محرومی ایک الگ المیہ تھا مگر یہ حقیقت یہ ہے کہ وہ یا اس کے ارد گرد کوئی جانتا تک نہیں کہ وہ دراصل کون تھا' کس کی اولاد تھا' جن کی وہ اولاد تھا انہوں نے اسے کب اور کہاں ایسا گم کر دیا تھا کہ وہ بے نشان منزل کا راہی بن کر رہ گیا۔ اور اب زندگی کے اس انتہائی اہم مگر غیر متوقع موڑ پر اس کے اندر یہ خیال زیادہ شدت سے سر اٹھا رہا تھا۔

کیا اس کے اپنے ماں باپ اس کے لیے ایسے ہی اچانک فیصلے کرتے جیسے چوہدری صاحب نے کیا تھا؟ وہ ہوتے تو کیا ایسے ہی اہتمام کرتے؟ وہ ہوتے تو کیا خود کے ان پڑھ ہونے اور بھین جی کی بیٹی کے پڑھے لکھے ہونے پر شرمساری سے یوں اس کی نظریں جھکی ہوتیں؟ سعدیہ علم والوں کی بیٹی تھی' جس کا باپ لوگوں کے بچوں کو اللہ کا کلام پاک پڑھاتا تھا۔ پانچ وقت کی اذان کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے سامنے جھکنے کے لیے بلاتا تھا اور سعدیہ بھین جی کی بیٹی تھی جنہوں نے کھاری کو اس کی اس جھجک سے باہر نکالا تھا کہ مذہب کی تعلیم بچپن سے زندگی کا حصہ نہیں بنی تو کبھی نہیں بن سکتی۔ انہوں نے اسے اللہ کا کلام پڑھنا اور اس کے سامنے جھکنے کا سلیقہ سکھایا تھا' پھر وہ ان پڑھ' بے سلیقہ' عقل سے پیدل شخص اتنی بڑی ہستیوں کی بیٹی کے قابل کیسے ہو سکتا ہے۔

"مجھے یہاں سے لے جاؤ کھاری! خدا کا واسطہ ہے۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔"

اسے سعدیہ کی وہ ڈرامائی اور غیر متوقع گفتگو یاد آنے لگی جو اس روز اس نے بھین جی تک سے جھجکے بغیر اس کے سامنے کی تھی۔

"میرے اللہ! میں کس چکر میں پھنس گیا ہوں' میں آزاد' مست' من موجی بندہ' کیسی ہتھکڑی بغیر کسی جرم کے مجھے لگائی جا رہی ہے' نہ سمجھ ہے نہ عقل کہ دماغ لڑاؤں اور گتھیاں سلجھالوں۔"

بار بار انہی حقیقتوں میں الجھنے کے بعد دل کا بڑھتا بوجھ آنسوؤں کی شکل میں بہہ نکلا۔

"نہ کوئی بیلی ہے نہ کوئی ساتھی' جس کے سامنے دل کی بھڑاس نکالوں۔"

وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ تاریک اور خاموش کمرے کے سکوت کو چند لمحوں بعد اس کی ہچکی لمحہ بھر کو توڑتی اور پھر سے خاموشی چھا جاتی۔



ایک بالکل ہی نئی صورت حال نے جیسے اس کے دل و دماغ روح اور جسم میں بجلی کی طرح کی توانائی بھر دی تھی۔ بچپن سے لے کر لڑکپن تک کی زندگی اس نے اماں اور ابا جی کے پروں تلے دبے رہ کر گزاری تھی۔ وہ زندگی سیدھی سادی اور پرسکون تھی۔ نہ ذہن میں کوئی سوال اٹھتا تھا نہ زندگی کے کسی پہلو کے بارے میں دل میں کوئی شک محسوس ہوتا تھا۔ مسئلہ تب ہوا جب آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھنے کی عمر آئی۔ اس عمر میں آکر اسے اندازہ ہوا کہ بظاہر سیدھی سادی اور روحانی زندگی کے تانوں بانوں میں تو بہت جھول تھے۔ سفید پوشی' مصلحت اور توکل کی چادر میں ایسے سوراخ بھی تھے جو عام آنکھ سے دکھائی نہیں دے سکتے تھے۔

اس غیر اہم بے ضرر سوالوں کے جواب میں اسے گھرکیاں ملی تھیں۔ لیکن اب اصل مسئلہ سوالوں کے جواب نہ ملنے کا ہی نہیں رہا تھا اب اصل بات یہ تھی کہ آنکھیں کھول کر چیزوں کا مشاہدہ کرنے کی حس بیدار ہو چکی تھی' بصارت کا تحفہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اسے اب اندازہ ہوا تھا کہ بغاوت بھی کسی چیز کا نام ہے اور بغاوت کا چھرا اپنے مقربین کے سینے میں گھونپ دینا کوئی بڑا جرم نہیں تھا' ہاں اس کے بدلے من چاہی زندگی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ابھی وہ اپنے دل و دماغ پر صبر اور تحمل کے چھینٹے اڑاتی اس ادھیڑ بن ہی میں مصروف تھی کہ اماں کے رد عمل کے خلاف کس قسم کی بغاوت نتیجہ خیز رہے گی کہ اس کی سماعتوں نے ایک ایسا مژدہ سن لیا جو خاصا جاں فزا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس کا ایک بار یہ کہنا۔ "مجھے یہاں سے لے جاؤ۔"

کھاری کا منہ عمر بھر کے لیے کھول دینے کو کافی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اتنی بے ساختہ درخواست کے جواب میں کھاری کا سر انکار میں نہیں ہل سکتا تھا۔ اپنے تئیں سعدیہ کلثوم نے ایک ایسا میدان مار لیا تھا جس میں طبل جنگ ابھی بجا ہی نہیں تھا اور یہ میدان مار لینے کے بعد وہ شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ وہ اس کیفیت میں اس لیے مبتلا تھی کہ وہ لفظ "شادی" کے مفہوم کے بارے میں بالکل بے خبر تھی۔ باون صفحات کا پرچہ دلہنوں کی تصویریں' نت نئے ملبوسات اور میک اپ کی اشیا کے بارے میں معلومات تو دیتا تھا مگر شادی کے لڈوؤں کی خصوصیات اس نے سعدیہ کلثوم کے گوش گزار نہیں کی تھیں۔

اس وقت سعدیہ فارم ہاؤس کے ایک کمرے میں سہیلیوں کے درمیان سبز اور پیلے جوڑے میں ملبوس آنے والے لمحات کے خوش کن تصورات میں گم تھی۔ وہ اتنی خوش تھی کہ اس کو اپنے خوابوں کی دنیا کے تصور کے کسی گوشے میں کھاری کے ساتھ جیسے چبھتے تصور کی چبھن بھی ناگوار نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اماں جیسے عفریت سے آزاد ہونے جا رہی تھی اور ابا جی کے منافقانہ طرز عمل سے بھی اسے نجات ملنے والی تھی۔ اس سوچ ہی نے اس کے دل و دماغ' روح اور جسم میں بجلی کی سی توانائی بھر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس جگہ کے باسیوں کے لیے وہ شاید ایک عجوبہ ثابت ہو رہا تھا۔ شام کے دھندلکے میں جب وہ اپنا چھوٹا سا ہینڈ کیری بیگ اٹھائے بس سے گاؤں کے اسٹاپ پر اترا' اسے اس گاؤں کی طرف جاتے راستے پر دو مرد کھڑے نظر آئے۔

"السلام علیکم۔۔۔ مجھے محمد افتخار احمد کے پاس جانا ہے۔" اس نے ان دونوں سے باری باری ہاتھ ملانے کے بعد کہا تھا۔ جواب میں ان دونوں نے حیرت سے سرتاپا اس کا جائزہ لینے کے بعد ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زور سے ہنس دیے۔

"اے اردو بولدا اے۔ (یہ اردو بولتا ہے)۔" ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"اے افتخار احمد کون اے؟" دوسرے نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

"وہی جس کی شادی ہو رہی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے یاد دلایا۔

"شادی کس کی ہو رہی ہے؟" ان دونوں میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

"وہ فارم ہاؤس میں رہتا ہے۔" وہ مزید مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا!" ایک شخص نے اچھا کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا "کھاری دی بات کر رہے ہو۔"

"جی جی۔ بالکل۔" وہ شانے اچکا کر مسکرایا۔ اب وہ دونوں دلچسپی سے اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ چڑیا گھر سے بھاگا ہوا کوئی جانور ہو۔

"میں اس کا دوست ہوں' محمد رضوان الحق۔" وہ عادتاً مزید مسکرایا' اسے خبر نہیں تھی کہ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھیں مزید چھوٹی لگتی تھیں' بالکل چھوٹے کینچے جیسی۔

"کھاری کے غیر ملکی دوست۔" اس نے سنا ان میں سے ایک نے دوسرے کے کان میں سرگوشی کی۔

"جی میں کھاری کا پاکستانی دوست ہوں۔" جواب میں اس نے ان کی آسانی کے لیے پنجابی میں کہا۔

"ارے یہ تو پنجابی بھی جانتا ہے۔" ان دونوں نے بے ساختہ کہا۔

"پتا نہیں کون ہے' کوئی جاسوس نہ ہو۔" ایک بولا۔

"میں کھاری کا دوست ہوں بھئی! آپ صرف مجھے فارم ہاؤس کا راستہ بتادیں۔" ان دونوں کی بحث نے اسے جھنجلا دیا۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ ان کا ردعمل فطری تھا۔ ان سادہ لوح دیہاتیوں نے چہرے مہرے سے اس غیر ملکی نظر آنے والے بندے کو اردو یا پنجابی بولتے کہاں سنا ہو گا۔

"چلو جی! ہمارے ساتھ چلو۔" ان میں سے ایک نے اس کی مدد کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ہنسی دبانے کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ اس رات دوستوں میں بیٹھ کر ایک دلچسپ واقعے کو حاشیہ لگا کر سنانے کا خوب موقع ان کے ہاتھ آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہاری سب بات سمجھ رہا ہوں یار!" اس نے آنسو بہاتے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ فارم ہاؤس کے مین گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد کھاری تک پہنچتے پہنچتے اسے کتنی ہی بار خود سے متعلق پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب دینا پڑے تھے۔ جب اسے کھاری کے کمرے کے دروازے کے باہر تک پہنچایا گیا۔ وہ اپنے یہاں آنے پر پچھتاوا محسوس کرنے لگا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا' وہ دنیا کا کوئی بڑا عجوبہ تھا جو غلطی سے اس

بستی میں لا پھینکا گیا تھا۔ وہ اپنی کوفت کو دل میں ہی دباتا دروازہ کھول کر کھاری کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کی توقع کے برعکس اس کمرے میں روشنی کے بجائے تاریکی تھی اور کھاری کے چہرے پر مسرت کے بجائے غم نے سایہ کر رکھا تھا۔

"یہ کیا یار!" کھاری اسے دیکھ کر بے اختیار اٹھ کر اس کے گلے لگ کر رونے لگا تھا۔

"کیوں رو رہے ہو؟" جواب میں کھاری کی داستان غم سن کر اگرچہ اس کا دل بھی اس درد کو محسوس کر رہا تھا جو کھاری کے دل میں نشتر کی صورت اٹھ رہا تھا۔ مگر وہ افتخار احمد عرف کھاری کو صرف دوست ہی نہیں' بھائی کہہ چکا تھا۔ سو اس نے نرمی سے اسے سمجھانا شروع کیا۔

"ارے کھاری! ہم تمہاری شادی کے لیے خاص طور سے آئے ہیں اور تم ہم سے ملے بھی نہیں"

ابھی وہ کھاری کو پوری طرح تسلی دے بھی نہیں پایا تھا کہ خواتین کا ایک ریلا کمرے میں گھسا' جس کے آگے وہی لڑکی تھی جسے اس نے اس گھر کے گیٹ پر دیکھا تھا جہاں سے وہ کھاری کو لینے گیا تھا۔

"لے جھلیا! شادی بیاہ پر لڑکیاں روتی ہیں' وہ تیری ہونے والی بیوی۔۔۔ اس کے تو دانت اندر نہیں جا رہے اور تو لڑکیوں کی طرح ادھر بیٹھا رو رہا ہے۔" ایک بڑی عمر کی خاتون نے کھاری کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

"چل اٹھ شاباش!" اس کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اس عورت کی نظر رضوان الحق پر پڑ گئی۔

"ہائے یہ کون ہے؟" اس نے بھی اسے دیکھ کر ویسا ہی ردعمل ظاہر کیا جیسے اس سے پہلے بیس لوگ دے چکے تھے۔

"ارے جینیز خرگوش۔۔۔ تم یہاں پہنچ گئے؟" اس لڑکی نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ جواب میں وہ ادب سے سر جھکاتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

"گڈ بھئی۔ تم تو پھر کھاری کے اسپیشل مہمان ہوئے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ماسی جنت! یہ لڑکا چینی' جاپانی ہے نہیں' صرف لگتا ہی ہے۔" اس نے اس خاتون سے کہا جو ابھی تک تشویش کے ساتھ رضوان الحق کو دیکھ رہی تھی۔

"چلو بھئی کھاری اٹھو' اپنے نکاح کا جوڑا پہنو۔ بس اب تو تمہاری آزادی کے کچھ منٹ ہی باقی ہیں۔" وہ سر کے بالوں کو جھٹکا دے کر چہرے سے ہٹاتی کھاری سے مخاطب ہوئی۔ رضوان الحق اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"پیاری لڑکی! نجانے تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی اور بھی زیادہ شدت سے کیوں یاد آنے لگتا ہے۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا زندگی سے بھرپور وہ چہرہ جو اب وقت کی دھول کے پیچھے نظر سے غائب ہو چکا۔ وہ اداسی سے مسکرایا اور اٹھ کر کھاری کی تیاری میں اس کی مدد کرنے میں مصروف ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

سارے میں چھوٹی بڑی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ پنڈال خالی تھا۔ اس میں بچی کرسیاں بھی بے ترتیب ہو چکی تھیں' جس کا جدھر کو دل چاہا کرسی کا رخ ادھر کو موڑے بیٹھا کھاری کے نکاح کی تقریب میں شامل ہونے کے بعد اپنے گھر واپس جا چکا تھا۔ ماہ نور نے پنڈال کے درمیان گڑے ایک بانس سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے سیل فون کی اسکرین روشن کی۔ کچھ دیر پہلے ختم ہونے والی تقریب کے منظر اس کی نظروں کے سامنے اسکرین پر دوڑنے بھاگنے لگے۔ کھاری کو پیلے رنگ کا کرتا اور سفید شلوار پہنائی گئی تھی۔ سرخ اور زرد پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے وہ جھینپا' گھبرایا' شرماتا لڑکا کتنا معصوم لگ رہا تھا۔ وہ مسکرائی۔ "اف توبہ کھاری کے سسر یعنی مولوی صاحب کا ڈیل ڈول اور رنگت و شکل کتنی خوفناک ہے' لگتا ہے کسی افریقی مسلمان ملک کے مولوی تھے پہلے۔"

اس نے دل میں سوچا اور اسکرین پر انگلی پھیر کر اگلے منظر کی طرف چلی۔ کھاری کا نکاح مولوی صاحب خود پڑھا رہے تھے۔

"واہ بھئی سلمان نے تو نکاح نامے پر کھاری کے دستخط تک فوکس کر لیے۔" اسے ہنسی آئی "افتخار احمد بقلم خود۔" کھاری کے دستخط دیکھ کر وہ پہلے سے زیادہ زور سے ہنسی۔ ٹیڑھے میڑھے حروف "افتخار احمد بقلم خود" کی شکل میں نکاح نامے پر اپنی شان دکھا رہے تھے۔

اگلا منظر لڑکی کے نکاح کا تھا۔ سرخ گوٹے کے پھولوں سے سجی بڑی سی پیلی چادر میں لڑکی کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مولوی صاحب مسکین سی آواز میں لڑکی سے اقرار لے رہے تھے۔

"قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔" کی واضح آواز البتہ بڑی چادر کے اندر سے سنائی دی تھی۔

"واہ بھئی لڑکی تو بہت خوش لگتی ہے۔"

ماہ نور نے اندازہ لگایا۔ اس کے بعد اس کے منظر میں گاؤں کی خواتین کے ڈھولک بجانے اور لڈیاں ڈالنے کے لمحات قید تھے "گانے، ڈھول، شور شرابا اف! ہر کوئی ایسے خوش ہے جیسے اسی کی شادی ہو رہی ہو۔ وہ پر شوق، پر جوش اور ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

"ارے ہاں، یہ لڑکی کی اماں کتنی مختلف لگ رہی ہیں البتہ باقی سب سے۔"

ایک منظر کو دیکھتے دیکھتے اس نے رک کر سوچا۔ تائی صابرہ کڑوا سا منہ بنائے لڑکی کی اماں سے گلے مل رہی تھیں۔ لڑکی کی اماں تائی صابرہ کے چہرے پر ناگواری کا تاثر دیکھ چکی تھیں "اسی لیے گلے ملنے کے فوراً" بعد ذرا ہٹ کر ایک نیچے پیڑھے پر خاموشی سے بیٹھ گئی تھیں اور باقی کی تقریب میں وہ اسی جگہ اسی طرح بیٹھی نظر آ رہی تھیں۔

"صرف مجھے ایسا لگ رہا ہے یا واقعی ان خاتون کے چہرے پر ٹینشن نظر آ رہی ہے، بلکہ شاید کوئی الجھن، کوئی گہری سوچ، کوئی بڑا پریشان کن خیال۔

ہاں بھئی بیٹی کو رخصت جو کرنے والی ہیں تو یہاں کی ماؤں کو ٹینشن تو ہو گی۔" پھر اس نے سوچا۔

"ہماری ماڈرن ماؤں کی طرح تھوڑی ہیں نہ فکر نہ فاقہ، ایک دم ٹینشن فری ہر کام اتنے پر یقین طریقے سے کرتی ہیں کہ فیل یا فلاپ ہونے کا کوئی خطرہ ہی نہیں۔ اگر بیٹی کو شوہر نہ بھی پسند آئے "ہم آہنگی کی صورت پیدا نہ بھی ہو تو کیا ہوا شادی ختم کر دیں گے "ٹینشن لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

اس نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو یاد کیا اور خود اپنے خیال پر ہی ہنس دی۔ پھر اس نے اسکرین کو دیکھا جس پر سلمان اور سعد گاؤں کے لوگوں کے درمیان موجود تھے۔ سلمان ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا اور جن لوگوں کے درمیان بیٹھا تھا ان سے فاصلہ رکھنے کی ایک نامحسوس کوشش بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ سلمان کی اس کوشش کو صرف ماہ نور ہی محسوس کر سکتی تھی کیونکہ وہ اس کا اپنا بھائی تھا اور اس کے مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔

اس نے اس منظر کو واپس اسکرین پر لا کر سعد کو دیکھا وہ ہر چیز سے بے نیاز اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھا۔ کہیں کہیں کان میں پڑتی اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ان سے ان ہی کی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا سعد کی سنائی باتوں کو سن کر وہ لوگ وقفے وقفے سے ہنس بھی رہے تھے، وہ ان میں ان ہی جیسا بن کے بیٹھا تھا۔

"بہروپیا کہیں کا۔" اس نے مسکراتے ہوئے فون سے دھیان ہٹایا اور سر اٹھا کر پنڈال کے اندر لگے برقی قمقموں کو دیکھنے لگی۔ اسے اچانک خیال آیا کہ اس روز وہ بہت خوش تھی، اتنی خوش کہ اسے ہر چیز بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اسی سرخوشی کے عالم میں یاد کرنا چاہا کہ اس روز وہ اتنی خوش کیوں تھی۔

"اس لیے کہ تمہارے اندر سے یہ خیال جا نہیں رہا کہ یہ وہ دن ہے جب سعد اور تم ایک ہی جگہ ایک ہی چھت

کے نیچے پچھلے کئی گھنٹوں سے موجود ہو۔" اس کے دل نے چپکے سے اسے جتایا۔

"کیا بات ہے، اس وقت یہاں اکیلی لڑکی کیا کر رہی ہو؟" چہرہ دوسری طرف پھیرنے پر اسے وہ نظر آیا جس کے نظر آنے پر اس کے محسوسات نے دل کی بات پر یقین کر لیا۔

"بس یونہی۔"

"یہاں خنکی ہے اور تم نے نہ تو سوئیٹر پہنا ہوا ہے نہ ہی کوئی شال اوڑھی ہوئی ہے۔" سعد نے نرمی سے کہا۔

"یہ اتنا سا احساس بھی کتنا کافی ہے کہ اسے میرا خیال ہے۔" دل سے ایک ہلکی سی آواز اٹھی۔

"یونہی میں باہر آ گئی اچانک مجھے یہ لائٹس اچھی لگ رہی تھیں۔" وہ پہلی بار سعد سلطان سے بات کرتے ہوئے اٹک رہی تھی۔

"ہاں بابا یہ لائٹس اچھی ہیں۔" وہ بھی روشنیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "ماہ نور! تمہارے چچا سے میں آج بہت متاثر ہوا ہوں۔" پھر اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"کیوں بھلا؟" ماہ نور نے کہا۔

"کھاری کے سلسلے میں انہوں نے واقعی گریٹ نیس کا مظاہرہ کیا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے آج ہی یہاں لوگوں سے سنا کہ کھاری ان کو کہیں لاوارث حالت میں پڑا ملا تھا، چھوٹا سا بچہ جس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کی اولاد تھا۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہوا تھا۔" ماہ نور نے ایک بار پھر اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

"پتا نہیں انہوں نے پتا لگانے کی کوشش کی یا نہیں کہ کھاری ہے کون "اس کا آگا پیچھا کیا ہے۔"

"پتا نہیں۔" ماہ نور نے سر جھٹکا۔ "اتنی تفصیل تو میں نے کبھی نہیں پوچھی۔"

"ہوں!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "میں ضرور پوچھوں گا کسی وقت تمہارے چچا سے۔"

"توبہ ہے سعد!" وہ ایک دم اپنے مخصوص انداز میں بولی "تمہیں کتنی دلچسپی ہوتی ہے ایسے قصوں میں۔ ایسے قصوں کی تو بال کی کھال اتارتے ہو تم۔"

"کیسے قصوں کی؟" وہ مسکرا کر بولا۔

"ایسے ہی اوٹ پٹانگ قصوں کی، کھاری کا آگا پیچھا، فلزا ظہور کے وریاباؤٹس، خدیجہ خالہ کی مرڈرڈ کزن کی کہانی۔ تمہیں کیسی کیسی باتوں میں دلچسپی ہوتی ہے "ایسی باتیں جن کی طرف کسی اور کا دھیان بھی نہ جائے۔"

"ہاں! یہ تو ہے "مجھے قصے سننے میں بہت دلچسپی ہے "میں واقعی انجوائے کرتا ہوں قصے سنتے ہوئے۔" وہ ہنسا۔

"تمہیں دنیا کے ہر کام، ہر چیز میں دلچسپی ہے سوائے ....." وہ جھنجلا کر کہتے بے اختیار رک گئی، بلکہ اس نے خود کو جملہ مکمل کرنے سے روک لیا۔

"سوائے کیا؟" وہ چونک کر بولا۔

"سوائے" وہ بوکھلا کر نظریں ادھر ادھر گھماتی کوئی جواب سوچنے لگی۔

"ہاں بتاؤ۔ سوائے کیا؟" وہ اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر محفوظ ہونے لگا۔

"اچھا چلو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ۔" کوئی جواب نہ سوجھنے پر اسے ایک اور احمقانہ خیال آیا۔

"ہاں پوچھو۔" وہ ماہ نور کے عقب میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یہ بتاؤ کہ لو ایٹ فرسٹ سائٹ (پہلی نظر کی محبت) کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ایک اور اوٹ پٹانگ سوال ماہ نور کے منہ سے نکلا۔

"لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔" وہ چونک کر بولا اور پھر اس کے چہرے پر اس کی مخصوص شرارت بھری مسکراہٹ

ابھری "یہ سوال تم نے کیوں پوچھا؟" وہ مسکرایا۔
ماہ نور اس سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنی بے ساختہ اور عجلت پسند عادت پر خود کو کوسنے میں مصروف رہی۔

"کیا بات ہے ماہ نور! تمہیں ہوا تو نہیں کسی سے لو ایٹ فرسٹ سائٹ؟" وہ حسب عادت شرارت کے موڈ میں آچکا تھا۔

"اور تو کوئی خاص بندہ یاد نہیں آرہا مجھے اس ساری تقریب میں جس پر گمان ہو۔ ہاں! نکاح خواں مولوی صاحب خاصے ہینڈسم تھے۔" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔

"توبہ استغفار کرو۔ وہ کھاری کے سسر تھے۔" وہ تیزی سے بولی۔

"کھاری کے سسر تھے تو کیا ہوا' دل تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔"

"سعد پلیز۔۔۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اچھا اچھا پلیز اب رونے نہ لگ جانا' میں مذاق کر رہا تھا۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "ان محترم بزرگ کی شان میں بھی گستاخی کر دی میں نے مذاق ہی مذاق میں۔"

"میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں سعد!" ماہ نور نے منہ سے نکلی بات پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ ریئلی!" وہ حسب عادت مسکرایا۔ ماہ نور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بات یہ ہے ماہ نور!" کچھ دیر اس گومگو میں رہنے کے بعد کہ اس کی بات کا کیا جواب دے' اس نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہ میں اپنی زندگی کی چند الجھنوں کو سلجھانے میں اتنا مشغول ہوں کہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کوئی دوسری فیلنگ میرے اندر آتی بھی ہے یا نہیں۔"

"اوہ!" ماہ نور کا دل دور کہیں بہت ہی دور گہرائیوں میں اوٹ لے گیا۔

"مگر تم تو بہت فارغ لگتے ہو۔" اس کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی آگئی۔

"فارغ؟" وہ ہنسا۔ "ہاں شاید لگتا ہوں۔"

"بہروپ بدل بدل کر مختلف جگہوں پر جانے' معذوروں' ناداروں اور مسکینوں کی دلجوئی کرنے اور اس سائیں کے پاس بیٹھ کر باتیں سننے کے سوا تمہیں کیا کام ہے' تمہیں بظاہر دیکھ کر تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تمہاری زندگی میں بھی کوئی الجھن ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر ابھرا۔ "شاید تم بالکل ٹھیک کہتی ہو اور تمہارا یہ سچ ہی میرا سب سے بڑا المیہ ہے۔"

"المیہ۔" ماہ نور کا غصہ کرتا دل اچانک پلٹنے لگا۔ "کیسا المیہ؟"

"میں نے تمہیں اس المیے کی ایک جھلک اس دن سنائی تو تھی جب تم نے پوچھا تھا کہ کیا میں نے وہ باتیں کسی اور سے بھی کبھی شیئر کی ہیں؟"

"ہاں!" ماہ نور کو یاد آیا۔ "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سیدھی طرح اپنے ڈیڈی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے کہ تمہاری مدر کون تھیں اور ان کے ساتھ کیا ہوا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ان کے جواب کے تین نکات یہ ہیں۔ تمہاری ماں مر چکی۔ وہ گانے بجانے کی دنیا سے تعلق رکھتی تھی اور یہ کہ بہتر یہ ہے کہ میں اپنی ماں کے بارے میں ان سے کچھ نہ پوچھوں کیونکہ وہ مجھے میرے سوال کا جواب اس لیے نہیں دیں گے کہ جواب پا کر مجھے بہت مایوسی ہوگی۔"

"تو تم کہو نا کہ تمہیں اپنی مایوسی کی کوئی پروا نہیں' وہ جواب دے دیں۔" ماہ نور نے مشورہ دیا۔

"تم انہیں نہیں جانتیں ماہ نور! جہاں جا کر وہ اپنی ذات کے دروازے بند کر لیتے ہیں' اول تو کوئی وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا' پہنچ بھی جائے تو بند دروازے پر دستک دیتا ہی رہ جائے' دروازہ کبھی نہیں کھلے گا۔"

"آخر ایسی کیا بات ہو سکتی ہے تمہاری مدر کے سلسلے میں جو وہ یوں دروازہ بند کر لیتے ہیں۔" ماہ نور نے سعد کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ہی تو میرا مسئلہ ہے۔ جتنا وہ اس بات پر خاموشی اختیار کرتے ہیں' اتنا ہی میرا تجسس اس سلسلے میں بڑھتا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں جگسا پزل کی طرح یہ سوال گتھی بن کر بیٹھ گیا ہے۔ پہلے میں بہت بے صبر تھا' مجھے جلدی پڑی رہتی تھی کہ کہیں سے مجھے اس بات کا کوئی کلیو مل جائے مگر آہستہ آہستہ میں نے یہ تسلیم کر لیا کہ بے صبری اور عجلت گتھیاں سلجھاتی نہیں' انہیں مزید بڑھاتی ہے۔ پھر میں نے صبر اور تحمل کا ہاتھ پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اسی لیے شاید تم نے دیکھا ہو گا میں نئی سچویشنز کو آسانی سے ایڈاپٹ کر لیتا ہوں۔ لیکن میرے دل کے اندر تجسس کی ہلچل ہر وقت مچی رہتی ہے۔ جسے تم بہروپ بدل کر مختلف جگہوں پر جانا سمجھتی ہو' یہ میرا مشغلہ نہیں' اسی ہلچل کا حصہ ہے۔ میں نے سوچا' اس پہیلی کا جواب یوں ہی مجھے کسی ایسی جگہ پر اچانک مل جائے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی میری احمقانہ سوچ ہی ہو' مگر دل کے بہلانے کو برا خیال ہرگز نہیں ہے۔" بات ختم کرتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"کتنی عجیب سی بات ہے نا!" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کتنے ہی لوگ تمہیں اور تمہارے لائف اسٹائل کو دیکھ کر رشک کرتے ہوں گے' کون جان سکتا ہے کہ تم دراصل کتنے مضطرب ہو۔"

"میں کسی کو جاننے دینا بھی نہیں چاہتا۔" اس نے سر ہلایا۔ "میں بہت کم خود کو کسی کے سامنے ایکسپوز کرتا ہوں۔" اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "مگر تم تو تم ہو۔۔۔ مجھے پتا ہے کہ تم سے دل کی بات کہنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ تم نے اس پر گوسپ کرنا ہے نہ اسے آگے اڑانا ہے' ہاں میرے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہو جاتا ہے۔۔۔"

"آئی ایم آنرڈ۔" ماہ نور نے سعد کی یہ بات سن کر آنکھیں زور سے بند کرنے کے بعد کھولتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں لگتا ہے کہ ہم میں سے اکثر جو دنیا کے سامنے ہوتے ہیں دراصل وہ نہیں ہوتے۔" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"یہ بھی ایک ٹریجڈی ہے' اللہ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا اور انسان نے خود پر ملمع چڑھا لیا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"رات کافی زیادہ ہو گئی ہے اب تم ریسٹ کرو۔" اس نے کہا اور اندر کی طرف چل دیا۔

"سعد! وہ کس کی کال تھی جسے تم بار بار ریجیکٹ کر رہے تھے؟" عقب سے ایک اور جذباتی اور ان سوچا سوال آیا۔

"یہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" اس نے بغیر مڑے جواب دیا۔ "کیونکہ یہاں آکر تم بہت خوش ہو مگر میرا جواب تمہارے سارے موڈ کا ستیاناس کر دے گا۔"

"سارہ کا؟" ماہ نور کی زبان پر نام آتے آتے رہ گیا بلکہ اس نے زبان کو دانتوں تلے دبا کر اسے روک لیا۔

"اور ہاں" پھر اس نے گردن موڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "لو ایٹ فرسٹ سائٹ والے سوال پر غور کرنے کا جب بھی وقت ملا' غور کر کے اس کا جواب ضرور دوں گا' ابھی میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"شاید میں تمہیں کبھی نہ سمجھ پاؤں" ماہ نور نے ایک بار پھر خود کو ستون سے ٹکاتے ہوئے سوچا۔ وہ مردانہ حصے

کی طرف کھلنے والا دروازہ کھول کر اس کے اندر غائب ہو چکا تھا۔

"لیکن شاید میں تمہارے لیے اپنے دل میں اٹھنے والے جذبے کو بھی کبھی نہ دبا سکوں۔" اس نے بے چینی سے سرہلا کر اوپر دیکھا۔

"سنا ہے محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے' اس پر کسی کو اختیار نہیں۔ پہلے سنا تھا اب سمجھا ہے اور اب لگتا ہے کہ جو سنا تھا' وہ سچ تھا۔ اس پر کسی کو اختیار نہیں۔ یہ ہونے پر آتی ہے تو ماہ نور کو سعد کے سحر میں جکڑ دیتی ہے اور سعد کو سارہ خان کا اسیر بنا دیتی ہے۔ لاکھ تم جھٹلاؤ۔ کیا مجھے نظر نہیں آتا اور میری سمجھ میں نہیں آتا؟" اس کی دونوں آنکھوں میں شفاف پانی کا ایک ایک قطرہ امڈا اور پلکوں پر آ کر رک گیا۔

"خوش قسمت ہو تم سارہ خان! سب کچھ گنوا کر کائنات کو پا لیا۔" اس نے چہرے کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پانی کے دونوں قطرے پلکوں سے نیچے چہرے پر لڑھک گئے۔

"لیکن ایک حقیقت کو قبول کرنے سے دوسری جھٹلائی نہیں جا سکتی۔" آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اندر آتے آتے اس نے خود کے سامنے اعتراف کرتے ہوئے سوچا۔

"ایک حقیقت یہ ہے کہ تم سارہ خان کو بی لونگ کرتے ہو اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ میرا اپنے دل پر اختیار نہیں رہا کیونکہ محبت کی نہیں جاتی' ہو جاتی ہے۔"



"دیکھا آپ نے رابعہ بی بی! اللہ جل شانہ کا حسن انتظام؟"

اس رات مولوی سراج سرفراز نے آپا رابعہ سے کہا۔

"وہ پتھر کے کیڑے کو رزق پہنچاتا ہے کیونکہ اس کا ذمہ اس نے خود لیا ہے۔ آپ نے دیکھا۔ وہ مشکل اور پریشانی جو سعدیہ کے بچپن سے لے کر اب تک ہمارے ساتھ تھی۔ کیسے بیٹھے بٹھائے آسان اور حل ہو گئی۔ واہ واہ سبحان اللہ!" انہوں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں میں نے چوہدری سردار جیسا دل والا نہیں دیکھا۔ آپ نے دیکھا۔ آج نکاح کی رات تھی صرف اور نکاح کے موقع پر سب اخراجات لڑکی کے والدین کو برداشت کرنے پڑتے ہیں مگر واہ واہ!" انہوں نے ایک بار پھر سر دھنا۔

"چوہدری صاحب نے صرف اس تقریب پر ہی کتنا دل کھول کر خرچ کر دیا۔ لڑکے کے ہی نہیں' لڑکی کے وارث بھی بن گئے۔ وہ بخت مرغ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے دیگوں میں اور پالک گوشت میں چھوٹے بکرے کا گوشت ڈلوایا خاص طور سے منگوا کر تاکہ نرم رہے اور کھانے والے کے دانتوں میں ریشہ بھی نہ پھنسے' اور یہ نہیں کیا کہ آرڈر پر اکٹھے نان منگوالیں' ادھر کے تندوروں سے تازہ نان نکل کر آ رہے تھے۔ کیا خوشبو تھی کیا ذائقہ تھا ان نانوں کا۔"

"واہ مولوی صاحب! آپ کا تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں آنے والا حساب ہے۔" آپا رابعہ نے اپنے ذہن پر چھائے تناؤ کو جھٹک کر سوچا۔ "ذرا سی بھی غیرت نہیں دکھائی گئی آپ سے۔ چوہدری صاحب کے کہنے پر اپنا بوریا بستر سمیٹ ادھر آ براجمان ہوئے کیا جاتا جو کہتے غریب ہوں' استطاعت کم رکھتا ہوں لیکن پھر بھی روکھی سوکھی پر ہی سہی' لڑکی کو میرے ہی گھر سے آ کر رخصت کروا کر لے جائیں۔ مگر آپ تو چوہدری صاحب کی تجویز پر بغلیں بجانے لگے کہ شربت کے پیالے تک کے خرچے سے جان چھوٹی۔" انہوں نے کڑھتے اور سوچتے ہوئے سر جھٹکا۔

"سنا ہے چوہدری صاحب نے سعدیہ کے لیے اچھی خاصی بری بنائی ہے اور بھئی ہم سے تو ایک تار تک کی

فرمائش نہیں کی۔ الٹا کہنے لگے مولوی صاحب! آپ نے کوئی تردد نہیں کرنا۔ بیٹی ہماری ہوئی۔ ہم جانیں ہمارا کام جانے۔ آپ بس مسجد کی خدمت دل لگا کر کرتے رہیں۔"

کھانے سے ہٹ کر مولوی سراج کو دوسرا خیال آیا۔

"تار ہوتا تو دیتے نا' مولوی سراج آپ کا تو پوٹا تر رہے بس اس کے سوا نہ کوئی فکر ہے نہ فاقہ۔"

"اب میں سوتا ہوں بھئی! سویرے سویرے مسجد جانا ہے' یہاں سے دور پڑتی ہے' اپنے گھر کی تو اور بات ہے۔" مولوی صاحب نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب نے کہاں کہاں سے مہمان بلوا رکھے ہیں بھلا؟"

آپا رابعہ نے مولوی سراج کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنا چاہا مگر مولوی صاحب کروٹ بدلتے ہی خراٹے بھرنے لگے تھے۔ انہیں ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ مایوس ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"یا اللہ کس سے پوچھوں۔ کس سے بات کروں؟" انہوں نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچا۔ ان کے خاموش سوال کے جواب میں خاموشی کی چادر میں ابھرنے والی جھینگر کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔



"فضل دین ولد الحاج رحمت الہی
ڈاک خانہ خاص ڈھوک کھو کر نزد چکدی وکیلاں
تحصیل گوجر خان' ضلع راولپنڈی"

سعد نے اپنے فون پر موصول ہونے والا پیغام پڑھا اور پیغام بھیجنے والے کے نمبر کو کال کرنے کے لیے بٹن دبایا۔

"السلام علیکم!" دوسری طرف سے کال موصول کیے جانے پر اس نے کہا۔

"بہت شکریہ کہ آپ کو میری یہ درخواست یاد رہی۔" اس نے کہا۔

"مجھے ایسی باتیں اکثر یاد رہتی ہیں کہ کس نے مجھ سے کچھ مانگا ہے اور مجھے اسے وہ چیز دینی ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "کیونکہ میری دنیا اور اس میں موجود لوگ' بہت محدود ہیں۔ البتہ تمہاری دنیا لگتا ہے' بہت وسیع ہے جب ہی تم اس کے باسیوں کو بھول جاتے اور خلط ملط کر دیتے ہو۔"

"ایسی بات نہیں ہے' میں ہاتھی کا سا حافظہ رکھتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "آپ میری دنیا میں پچاس اور باشندے شامل کر کے دیکھ لیں' میں پھر بھی سب کو الف تا بے الگ الگ شناخت کر کے دوں گا۔"

"امتحان دینے کی بات مت کیا کرو' انسان امتحان دینے کی بات یوں کرتا ہے جیسے بچپنے کا کوئی کھیل کھیلنا ہو مگر دینا پڑ جائے تو عذاب میں پڑ جاتا ہے۔"

"میں امتحان دینے کی بات تو کر ہی نہیں رہا میم!" وہ مسکرایا۔ "میں امتحان کی حقیقت سے' بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ میں تو صرف حافظہ آزمانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"اچھا چلو۔ کبھی آزما میں گے' لیکن سوچ لو۔ آزمانے کا وقت آئے تو زندگی بھر دیکھے چہرے نہ پہچان سکو۔"

"اگر ایسا ہوا تو میں' بہت ایمانداری سے ہاتھ اوپر اٹھا کر آپ سے کہوں گا۔ میں ہار گیا' کوئی ہینکی پھنکی ہرگز نہیں کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔"

"یہ بتاؤ غائب کہاں ہو؟" دوسری طرف سے اس بات کا جواب آنے کے بجائے سوال آیا۔

"میرا ایک المیہ یہ رہا ہے کہ میں ایک منظر میں حاضر ہوتا ہوں تو دوسرے منظر میں موجود لوگ میری ڈھنڈیا مچا دیتے ہیں۔ افسوس میں بیک وقت سب منظروں میں موجود نہیں رہ سکتا۔"

"اس کا ایک حل یہ ہے کہ تم ون ایکٹ پلے میں اپنا کوئی کردار ڈھونڈ کرو' نہ زیادہ ڈائیلاگز یاد کرنا پڑیں گے' نہ بار بار ایگزیٹس دینے پڑیں گے' نہ ہی زیادہ انٹریز دینی پڑیں گی۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ زندگی ون ایکٹ پلے نہیں ہے' اس کو گزارنے کے لیے میرے جیسی مشکل سے ہی گزرنا پڑتا ہے۔"

"تم میری بات کو گول کر رہے ہو' میرے سوال کا جواب دو' غائب کہاں ہو؟"

"میرے چاروں طرف سبزہ ہے اور رنگا رنگ پھول' خوش رنگ پرندے ہیں اور قسم ہا قسم کے پھل و سبزیاں' گاڑھا اور خالص دودھ دیتی بھینسیں ہیں اور گائیں بھی' اعلا نسل تیز طرار گھوڑے ہیں اور چوگان کھیلنے کے میدان' خدمت گزاری کے لیے چوبیس گھنٹے مستعد خدام۔" وہ ترنگ میں آکر بولا۔

"رکو رکو... کہیں تم شداد کی جنت میں تو نہیں پہنچ گئے کسی ٹائم مشین میں بیٹھ کر؟"

"آگے تو سن لیں۔ میں ایک ایسی عمارت میں قیام پذیر ہوں جو رومن' یونانی' گوتھک' وکٹورین' الزبتھن اور مغل طرز ہائے تعمیر کا ایک دلفریب ملغوبہ ہے۔"

"رکو! عمارتیں ملغوبہ نہیں ہوا کرتیں' طرز ہائے تعمیر کا شاہکار ہوتی ہیں۔"

آپ جو بھی کہہ لیں' کیونکہ میں نے اردو لغت رٹی ہوئی نہیں' لہٰذا جو لفظ ذہن میں آرہا ہے' بول رہا ہوں۔

"یہ جگہ اسی دنیا میں موجود ہے نا؟"

"آپ کا کیا خیال ہے میں عالم بالا سے مخاطب ہوں آپ سے؟"

"نہیں' لیکن تمہاری حاشیہ آرائی نے ڈرا دیا۔"

"ہاہا فلزا میم! آپ بھی ڈرتی ہیں کسی بات سے کیا؟"

"کیوں میں کیوں نہیں ڈر سکتی؟"

"میں نے سوچا شاید آپ صرف ڈرانے کا کام کرتی ہیں۔"

"تم ڈرتے ہو مجھ سے؟"

"ایسا ویسا... آپ کے سامنے تو بغیر قصور کان پکڑ کر بیٹھے رہنے کو دل چاہتا ہے۔"

"تو پھر بتاؤ... کہاں ہو' سیدھی طرح بتاؤ۔"

"میں خود آگاہی کے سفر کے ایک پڑاؤ پر پہنچا ہوا ہوں' شاید جو یہیں مجھے کوئی اپنا سرا مل جائے..."

"خود آگاہی یا خود شناسی؟"

"شاید دونوں ہی۔"

"اچھا... پھر تو میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں میاں سعد بلال!" دوسری طرف سے ہلکی سی ہنسی کی آواز آئی۔

"چلو پھر جب پڑاؤ سے دل اٹھے اور واپسی کا سفر کرنے لگو تو مطلع کرنا۔ خدا حافظ۔"

"ایک منٹ' ایک منٹ..."

"ہاں بولو...!"

"میں نے آپ کو اپنا نام سعد سلطان بتایا تھا' آپ نے مجھے سعد بلال کیوں کہا؟" دوسری طرف چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی۔

"اچھا سعد سلطان بتایا تھا' پھر مجھ سے غلطی ہو گئی ہو گی' شاید میرے کسی اسٹوڈنٹ کا نام سعد بلال رہا ہو۔" پھر اٹکا اٹکا سا جواب آیا۔

"دراصل تمہاری طرح میں نے ہاتھی کا سا حافظہ نہیں پایا نا! اس لیے..."

"ہوں' چلیں خیر آئندہ تو یاد رہے گا نا..."

"کوشش کروں گی تمہیں اسی نام سے یاد رکھوں۔ اچھا بھئی خدا حافظ' میرے سونے کا وقت ہو رہا ہے..."

"ایک بار پھر ایڈریس بھیجنے کا بہت شکریہ..."

"ہاں اسے بھی اپنے سفر کا ایک پڑاؤ شمار کر لینا' شاید جو کوئی سرا ہاتھ آجائے..."

"ضرور..."

دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔



وہ کمرا جو دیوار میں جڑی ایک الماری' بان کی ایک چارپائی' اس چارپائی پر بچھے سردی گرمی کے موسم کے حساب سے بستر' لکڑی کی سیٹ والی ایک سخت کرسی اور دیوار پر تنکوں میں جڑے ایک آئینے کے علاوہ اپنے اندر کوئی سامان نہیں رکھتا تھا اس روز وہی کمرا تازہ پالش شدہ پرانے ڈبل بیڈ' ڈبل منک کمبل' دو سیٹوں والے چھوٹے صوفے اور ایک عدد سنگھار میز سے سجا تھا۔ بیڈ کے چاروں طرف تازہ پھولوں کی لڑیاں لٹک رہی تھیں اور کمرے کے ماحول میں مہندی' خوشبو اور پھولوں کی باس رچی تھی۔

کھاری نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ اس کا کمرا نہیں تھا۔ یہ وہ ماحول نہیں تھا جس سے وہ مانوس تھا۔ وہ سادہ مزاج' سادہ لوح انسان تھا۔ ایک عرصہ فارم ہاؤس میں گزارنے کے باوجود اسے وہاں کی قیمتی چیزوں میں کبھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

اس نے ہوش سنبھالتے ہی وہاں کے سجے سجائے' قیمتی سامان سے لیس کمرے دیکھے تھے جو کبھی کبھار تو یوں خالی رہتے تھے کہ کوئی دیکھنے والی دوسری آنکھ موجود نہ ہوتی۔ وہ چاہتا تو قیمتی اور پرتعیش سامان سے مزین ان کمروں میں لوٹیں لگاتا پھرتا' کچن میں موجود نفیس اور قیمتی کراکری اپنے استعمال میں لے آتا' فارم ہاؤس کی پینٹری میں موجود اشیائے خورد و نوش کو خرد برد کر لیتا' مگر اس کی طبیعت پیدائشی طور پر سیر تھی یا اسے آسائشوں میں دلچسپی ہی نہیں تھی' جو اس نے کبھی نظر تک اٹھا کر ان چیزوں کو نہیں دیکھا تھا۔

کھاری سب چیزوں سے بے نیاز دن سے رات کرتا رہتا' وہ اپنی ایسی ہی زندگی میں خوش تھا اور مطمئن بھی۔ مگر اب جو ان سوچی' ان چاہی صورت حال اس پر آن پڑی تھی' اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"شادی"! اس نے پھولوں کی لڑیوں سے سجے بیڈ اور بیڈ پر دھرے سرخ ملبوس میں سجے وجود کو دیکھا۔ جس کا ابھی دور دور تک اس نے تصور کیا تھا نہ اس کے بارے میں کبھی کسی دوسرے نے اس سے ذکر کیا تھا۔ وہ تو ابھی تک خود کو آپا رابعہ کا چھوٹا سا طالب علم ہی سمجھ رہا تھا۔ کہ اس پر وہ رشتہ مسلط کر دیا گیا تھا جس کی الف' ب' پ تک کا اسے پتا نہ اندازہ' سعدیہ کلثوم جو ہمیشہ اسے چڑایا کرتی تھی۔ جس کو اس نے کہا تھا گاؤں کے راستے پر موجود سانپ جب سو سال کے بعد انسان بن جائے گا تو اس کی شادی سعدیہ کلثوم سے کرا دی جائے گی۔ وہ اسی سعدیہ کلثوم کا مجازی خدا بن چکا تھا۔ اسے سعدیہ کلثوم کو بطور اپنی بیوی کے مخاطب کرنا تھا۔

اسے کیا کہنا تھا' وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اس کی زبان شاید لکنت کھا گئی تھی اسے اپنے حلق میں ایک پھندا سا اٹکا محسوس ہو رہا تھا۔ چوہدری صاحب کے اس اعلان کے بعد سے اب کہ سعدیہ سے اس کا نکاح کیا جائے گا' ایک ہی مثبت بات اس کے ذہن میں آئی تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ چوہدری صاحب کی منت سماجت کر کے سعدیہ کو ڈاکٹر بنانے کا خرچا اٹھانے پر منا لے گا' اور اس کے دل کو اس پورے قصے کو دہراتے

ہوئے صرف اسی بات کا اطمینان تھا اور خوشی بھی۔

"سعدیہ باؤ!" پھر اپنی جگہ سے ایک انچ بھی آگے بڑھے بغیر اس نے بمشکل خود کو بولنے پر مجبور کرتے ہوئے کہا۔ "میں ان پڑھ تے جاہل بندہ ہوں۔ مینوں پتا ہے کہ آپ دے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے' مینوں معاف کر دینا میں ایسی زیادتی کا حقدار نہیں بننا چاہتا تھا......"

"کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے میرے ساتھ کھاری!" جواب میں دلہن نے گھونگٹ کا تکلف ہٹاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ پورے ہار سنگھار کے ساتھ گہنے اور اچھے لتے کپڑے پہنے یہ وہ سعدیہ تو کہیں سے بھی نہیں لگ رہی تھی جسے کھاری اب تک دیکھتا آیا تھا۔ وہ دم بخود اسے دیکھتا چلا گیا۔

"میری شادی کسی کے ساتھ تو کرنی ہی تھی نا آپا رابعہ اور مولوی صاحب نے..." وہ دانت پیستے ہوئے بولی "میں خوش ہوں کہ کسی بے ایمان' خود غرض' منافق اور ریاکار بندے کے بجائے میری شادی تم سے ہو گئی۔ میں تمہارے ساتھ بہت خوش رہوں گی کھاری!"

"او نئیں جی..." کھاری نے اس کے چہرے سے بمشکل نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ملکیت اور دسترس کے احساس سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے مگر وہ اس احساس سے نظریں چرانا چاہ رہا تھا۔

"مجھ مسکین نے عاجز بندے دے ساتھ آپ نے کی خوش رہنا ہے' تسی بس پڑھائی کری جاؤ اب' میں نے چوہدری صاحب نوں منا لیا ہے' وہ آپ نوں ڈاکٹری تک پڑھائیں گے۔"

"اور تم کیا کرو گے؟" سعدیہ اس خبر پر آتا غصہ دباتے ہوئے بولی۔

"میں جی..." اس نے سر جھکا کر نظریں ادھر ادھر گھماتے ہوئے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنا کیا بندوبست کرے۔ اس نے پھر ایک خیال آتے ہی تیزی سے بولا۔

"میں آپ کا چوکیدارہ کروں گا' آپ نوں ہر اچھی بری توں بچاؤں گا' آپ دی حفاظت کروں گا' پہرا دوں گا پورا پورا..."

"نہیں بننا مجھے ڈاکٹر اور نہیں کرنی مجھے پڑھائی..." وہ فلمی انداز میں بیڈ سے اتر کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"ہم ایک چھوٹا سا گھر بنائیں گے۔ اس گھر کو سامان سے سجائیں گے۔ جس میں میں' تم اور ہمارے بچے ہنسی خوشی رہیں گے۔" وہ کھاری کے قریب آکر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"بچے!" کھاری نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ سعدیہ کے چلنے اور سرہانے سے اس کے زیور ایک ہلکی سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اس کے وجود سے پرفیوم کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کے سرخ جوڑے پر سجے تلے اور زردوزی کے تار کمرے میں روشن ٹیوب لائٹ کی روشنی سے منعکس ہوتے آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔

سعدیہ معنی اور سرخوشی کے ایک جہان کی صورت کھاری کے سامنے کھڑی تھی۔ شاید اس جہان کو سمجھنے کے لیے کھاری کو کسی لغت کے صفحات الٹنے اور پلٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے ذہن و دل پر کئی دن سے چھایا غبار جیسے چھٹتا چھٹتا کمرے میں آتی جاتی نامحسوس ہوا کے ساتھ مدغم ہو کر غائب ہو رہا تھا۔ اسے یکدم احساس ہونے لگا تھا کہ وہ مدرسے اور مکتب میں پڑھتا ایک کم عمر بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ بڑا ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس اجنبی جگہ پر کسی سے واقف نہیں تھیں۔ فارم ہاؤس کی وہ ملازمائیں جو ان کے کمرے میں آتیں اور ان سے کسی ضرورت کا پوچھتیں' ان کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ سعدیہ کی رخصتی سے لے کر اس رات گئے تک وہ اس کمرے میں تنہا بیٹھی رہی تھیں۔

مولوی سراج کی ان دنوں پانچوں انگلیاں گھی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ چوہدری صاحب اور ان کے ملازم انہیں غیر معمولی عزت اور احترام دے رہے تھے۔ وہ تو شاید اپنے حواسوں میں بھی نہیں رہے تھے۔ سعدیہ کو اس کمرے سے رخصت کرنے کے لیے دو گھڑی اندر آئے اور دو انگلیاں اس کے سر پر رکھ کر بغیر کچھ بولے ایک طرف ہٹ گئے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک آپا رابعہ نے ان کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

وہ اس کمرے میں تنہا بیٹھی تھیں اور انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا دماغ بالکل خالی تھا۔ ان سے نہ کچھ سوچا جا رہا تھا' نہ ان کی سمجھ ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ حالات نے ایک دم پلٹا کھایا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا' سعدیہ نے دنوں دن عمر کی کئی منزلیں طے کرتے ہوئے انہیں ہڑبڑا کر مستی کی نیند سے جگایا تھا۔ عمر بھر سعدیہ کو ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھنے والی آپا رابعہ نے اسے دلہن بنا کر کسی کے بھی ساتھ رخصت کر دینے کے خیال تک کا سفر صرف چند ہی دن میں مکمل کر لیا تھا۔

گویہ سفر پوری دنیا کا چکر لگاتے ہوئے در پیش آتے سفر کے برابر تھا۔

انہیں خیال آیا تھا "سات دن میں دنیا کا سفر" انہیں عرصہ پہلے دیکھی ایک کتاب کا سرورق یاد آ گیا۔

"جو بھی ہوا' اس کے لیے اسباب اللہ نے خود پیدا کیے۔ بندے نے خود بھی بھلا کبھی اپنی تقدیر کی تدبیر کی ہے۔" سعدیہ والے قصے پر وہ مولوی سراج کے فرمان زرین پر یقین کرتے ہوئے خاک ڈالنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔ مگر اس رات ان کے ذہن کو خالی اور جامد کر دینے والی سوچ کچھ اور تھی۔

"کس سے پوچھوں وہ کون ہے' کہاں سے آیا ہے' چوہدری صاحب اور فارم ہاؤس سے اس کا کیا تعلق ہے؟" وہ لاتعداد مرتبہ خود سے یہ سوال کر چکی تھیں۔ مگر اس سوال کا جواب انہیں کون دیتا۔

"میرے خدایا! میں کیسے ذہن سے اس خیال کو جھٹک دوں۔" کئی گھنٹے یونہی بے خیالی میں بیٹھے سامنے موجود دیوار کو گھورتے رہنے کے بعد سر جھٹک کر اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

"ہو بہو وہی شکل' وہی چہرہ مہرہ' ویسا ہی قد کاٹھ' ویسی ہی آن بان... فرق تو صرف عمر کا ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیا یہ اتفاق ہے محض؟ کیا دنیا میں ایک سے دو چہرے واقعی ہوتے ہیں یا یہ جینیاتی عمل کا کرشمہ ہے؟ ہائے میرے اللہ!"

پھر انہوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھتے ہوئے سوچا۔ "کس سے پوچھوں' کس کے ذریعے اس تک پہنچوں کہ اس سے پوچھ لوں۔"

"پتا نہیں' وہ یہیں ہے یا کہیں چلا گیا۔" ایک نیا خیال ان کے دل کو بے چین کرنے لگا۔ "کیا خبر وہ یہاں صرف ایک رات کا مہمان ہو۔"

"مہمان ہے یا تھا... کس کا مہمان تھا... کیا چوہدری صاحب کا کوئی رشتہ دار ہے وہ یا چوہدرانی کا عزیز؟"

"نہیں..." پھر انہوں نے پر یقین انداز میں سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے سوچا۔

"ان دونوں سے اس کا کوئی خون کا رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔" ان کے خیال میں یقین تھا۔

"اس کی عمر بھی ایسی نہیں کہ اسے چوہدری صاحب کا دوست سمجھا جائے... لیکن کسی دوست کا بیٹا تو ہو سکتا ہے۔" ذہن سے ایک خیال سوجھا۔

"نہ' نہ... اللہ نہ کرے! وہ چوہدری صاحب کے کسی دوست کا بیٹا ہو..." پھر نجانے کیوں ان کے دل نے سختی سے پکار ڈالی۔

"جو بھی ہے' جہاں سے بھی آیا ہے' اس کی بابت کس سے پوچھوں' کس کے پاس جاؤں اور کہوں کہ مجھے دو گھڑی کے لیے اس کے پاس لے جائے۔" ان گنت خیال' لاتعداد سوچیں ان کے ذہن کو جکڑے جا رہی تھیں۔ وہ ایک الجھن سے نکل کر نئی الجھن میں پڑ گئی تھیں۔

"تم بڑی بے صبری ہو۔ کوشش کرو! صبر اور حوصلے کی عادت طبیعت میں پیدا ہو جائے۔ تم دیکھنا! صبر اور حوصلے کے جواب میں کیا کیا معجزے رونما ہوتے ہیں۔ جس چیز کے لیے بے صبری اور بے قراری محسوس ہو رہی ہوتی ہے وہ آپ سے آپ اپنے قدموں پر چلتی تم تک پہنچ جائے گی۔" پھر انہیں ایک پرانی بات یاد آئی۔

"اور جو تم میری جگہ ہوتیں تو کیا اس چہرے کے یوں نظر آجانے پر صبر کرتیں اور حوصلے سے کام لیتیں؟ بے صبری اور بے قراری سے بچ پاتیں؟" انہوں نے تصور میں آتی کسی شبیہہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"نجانے اب یہ کھاری اور سعدیہ کیا بناتے ہیں۔ شمال اور جنوب کے تانے بانے ملانے کی کوشش تو کی ہے۔ دیکھو! رسی گندھتی ہے یا تانا بانا ٹوٹتا ہے۔" انہوں نے خود کو مخمصے کی حالت سے نکالنے کی خاطر دھیان کسی دوسری سوچ کی طرف لگایا۔

"کھاری!" ان کے ذہن میں جیسے جھماکا ہوا۔ "تو! میں خوامخواہ بے چین ہوئی۔ کھاری سے خبر لگواتی ہوں اس کی۔" ان کے دل کو کچھ چین نصیب ہونے لگا۔



"لے اتنے دن تو تو نے آنسو بہا بہا کر دماغ کا پانی ختم کر دیا۔۔۔ اور آج تیرے دانت اندر ہی نہیں جا رہے۔" ماسی جنت نے کھاری کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

"بس دیکھ لے ماسی!" اس نے پیتل کے منقش گلاس سے لسّی کا آخری گھونٹ پی کر حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔ "تو صرف ناں (نام) کی جنت ہے نا! مجھے تو من لے کہ ویسے ہی جنت لبھ (مل) گئی ہے۔"

"ہا ہائے۔" ماسی نے مصنوعی حیرت سے کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو تو کہتا تھا الزام لگایا ہے بھائی مالک نے۔ اب کیسی وندیاں نکل رہی ہیں۔"

"الزام ہی تھا جو الزام تھا۔" کھاری نے کندھے پر رکھے نئے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "چاچے مالک نے مینوں بے عزت کرنے دی کوشش کی تھی پر۔۔۔" اس نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا "میرے مولا نے میری عزت رکھ لئی۔ ہن سمجھ آندی ہے کہ اللہ دے سارے ہی کم (کام) نرالے نیں"۔

"جب ہی تو تم اتنے خوش نظر آرہے ہو۔ سویرے سویرے بن پھب (بج سنور) کر ادھر آئے ہو۔ بڑیاں شیواں شوواں (شیو) کی ہوئی ہیں۔ صاف ستھرے لیڑے (کپڑے) بھی پہنے ہوئے ہیں۔ لگدا شادی راس آگئی کھاری کو۔" قریب سے ایک بوڑھی عورت بولی۔

"سولہ آنے سچی گل ہے ماسی!" کھاری پرجوش انداز میں اس بوڑھی عورت کے شانے دباتے ہوئے بولا۔

"دیکھ تو بہن جنت! اپنا کھاری ایک دم دم جوان جوان سا لگنے لگا ہے۔" ماسٹر کمال نے مذاقاً کہا۔

"مینوں جوان کہو گے ماسٹر جی تے ایس کا مطلب یہ ہوگا تسی بڈھے ہو گئے ہو۔" کھاری نے دانت نکالے۔

"دیکھو! اس کی آج وندیاں کتنی نکل رہی ہیں۔" ماسی جنت ناراضی سے بولی "اتنے دن مجھے بھی اپنے ساتھ رلا رلا مارا۔"

"بس ماسی! بندے نوں آنے والے ویلے (وقت) دا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ایویں خامخا پہلے ہی رونے کرلانے لگ جاندا ہے۔" کھاری نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"چل بڑی بات ہے کھاری پتر! تجھے شادی راس آگئی ہے' ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" ماسٹر کمال نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"لے! یہ لسی کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھ اور اپنی ووہٹی کے لیے لے جا۔ نمانی خالی پیٹ بیٹھی ہوگی اندر۔" ماسی جنت نے کھاری سے کہا۔

"وہ لسّی نئیں پیندی ہے۔ وہ چاء پیندی ہے۔" کھاری نے کہا۔ کچن میں موجود سب لوگ ہنس دیے۔

"واہ بھائی واہ! ایک ہی رات میں تجھے یہ بھی پتا چل گیا؟" ماسی جنت نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"لے! میں پہلے نئیں تھا جاندا مولی صاحب کے گھر۔ مینوں اودھوں (اس وقت) کا ہی پتا ہے۔" کھاری نے اپنی صفائی پیش کی۔

"آہا!" ماسی جنت نے دونوں لفظوں کو کھینچتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ "پہلے دی گل اے۔" وہ ہنس کر بولی "وے جھلیا تے توکیوں پھر اسے یہاں لا کر پانی پلا پلا کر ہی پھراتا رہا۔ چائے پلانی تھی نا۔" اس نے کھاری کے بازو پر تھپڑ مارا۔

"آہو!" کھاری کو وہ دن یاد آیا' جب فارم ہاؤس سے باہر نکلتے ہوئے پانی کے نل پر سعدیہ نے پانی پیا تھا اور دوسری بار بھی وہ پیاس کی وجہ سے ہی ادھر آئی تھی۔

"ماسی! تجھے پرانی گلاں بڑیاں یاد ہیں۔" وہ کھسیا کر بولا۔

"او کھاری! اوئے کھاری!" باہر سے کسی نے پکارا "تیرا جپانی یار تجھے ڈھونڈھتا پھر رہا ہے۔ اسے بھی پوچھ لے۔"

"اوئے آہو!" کھاری نے سر پر چپت مارتے ہوئے کہا "تو میں اسے بھُل ہی گیا تھا۔" وہ اپنے نئے کپڑے عادتاً جھاڑتا ہوا باہر کو چل دیا۔

"ماسی جنت! کھیر کے لیے جو دودھ الگ ہوا تھا' وہ دے دو۔" باہر سے کسی نے آکر ماسی جنت سے کہا اور پھر سب اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔



"آج میں کھاری کی دلہن کا میک اپ خود کروں گی۔" ماہ نور نے اپنے ذہن پر پڑے ایک انجانے سے بوجھ کو جھٹکنے کی خاطر اعلان کیا۔

"کل تو کسی نے اسے ایسا کارٹون بنا رکھا تھا کہ بے چاری کے اصل نقش و نگار چھپ ہی گئے تھے۔"

"تو اور کیا۔۔۔ ہمیں تو پتا ہی نہ چلا' ووہٹی سوہنی ہے کہ کوجھی (بدصورت)۔" تائی صابرہ نے منہ پر کپڑا رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں خیر! پیاری تو ہے وہ۔" ماہ نور نے بے اختیار کہا۔ "اس کی اماں تو بہت ڈیسنٹ اور پیاری سی خاتون ہیں۔ ان ہی جیسی لگتی ہے۔"

"ہاں! جب ہی تو اماں کا دماغ ساتویں آسمان پر چڑھا ہوا ہے۔ تمہارے چاچے نے مجھے محفل کرا کر اس سے درس دلوانے سے منع ہی کر دیا' ورنہ میں دیکھتی کیسے اس دفعہ انکار کرتی ہے۔" تائی صابرہ کی آپا رابعہ سے بے وجہ کی خلش اچھلی۔

"یقیناً" بہت اچھا سبق دیتی ہوں گی۔ بہت سلجھی ہوئی گفتگو کرتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ بالکل آؤٹ آف پلیس (بے جگہ) اور مس فٹ ہیں اس ماحول میں جس سے ان کا تعلق ہے۔" ماہ نور نے بالوں میں برش پھیرتے

ہوئے آئینے میں خود کو دیکھا اور تائی صابرہ سے مخاطب ہوئی۔
"کیا ہیں؟" تائی صابرہ کے کچھ پلے نہ پڑا۔
"کچھ نہیں۔" ماہ نور نے ہیئر بینڈ کو دانت سے کھولتے ہوئے سرہلایا۔
"لیں! میں چلی کھاری کی دلہن سجانے۔" بال سیٹ کرنے کے بعد ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے ماہ نور نے تائی صابرہ کی طرف دیکھا۔ "چلو رضیہ! میری یہ ساری ایسسریز اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ مجھے یاد نہیں رہتا' کھاری کا کمرا کس طرف ہے۔" اس نے منہ سوجا کر ایک طرف کھڑی رضیہ سے کہا۔
"جو نوکری کی مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی نہ جاتی ماہ نور باجی! آپ کے ساتھ اس چڑیل' اس ڈائن کے کمرے میں۔" رضیہ ماہ نور کی راہنمائی کرتے ہوئے کلستے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی "ڈائن۔ جھپٹا مار کر کھاری کو لے اڑی کم بخت۔"
وہ جی بھر کر سعدیہ کو کوس رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا! تو تم پہلے سرکس میں کام کرتے تھے؟" سعد نے اپنے سے اگلی نشست پر بیٹھے رضوان الحق کو مخاطب کیا۔
"جی!" اس نے سرہلایا۔
"کیا کرتے تھے سرکس میں؟"
"جوکری کرتا تھا اور جگلری بھی۔" اس نے نیچی آواز میں کہا۔
"واہ بڑے ٹریٹس ہیں یہ تو" سعد مسکرایا۔ "مجھے سکھاؤ گے۔"
"آپ کو۔۔۔" اس نے سعد کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو' مجھے علم ہے' آپ مذاق کر رہے ہیں۔
"ہاں! بالکل۔۔۔ مجھے۔" سعد نے سرہلا کر یقین دلاتے ہوئے کہا۔
"میں آوٹ آف پریکٹس ہو چکا ہوں۔" اس کا لہجہ ایک دم اداس ہو گیا۔ "عرصہ ہوا میں نے دونوں کو چھوڑ دیا۔"
"اوہ!" سعد نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا "کیوں بھئی! اتنے مزے کے کام تم نے کیوں چھوڑے؟"
"بس! دل نہیں لگتا تھا اس کام میں۔ اس لیے چھوڑ دیا۔"
"کتنے سال سرکس میں رہے؟"
"کتنے ہی سال' گنتی یاد نہیں۔" رضوان الحق سامنے دیکھتا ہوا بولا۔
"اتنے سال ایک کام کرنے کے بعد اس سے دل اچاٹ ہو گیا؟" سعد ہنسا اور ہاتھ رضوان الحق کی طرف بڑھایا۔ "تم تو میرے ہی بھائی نکلے یار۔۔۔ ہاتھ ملاؤ۔۔۔ میں بھی بہت غیر مستقل مزاج ہوں۔"
"نہیں۔۔۔ میں غیر مستقل مزاج نہیں ہوں۔" رضوان نے سعد کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھامتے ہوئے ہلایا "میرا معاملہ کچھ اور تھا۔ اس لیے میں نے سرکس چھوڑا۔"
"اچھ۔۔۔ چھا!" سعد نے اس کے لہجے پر غور کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔
"خیر! جب کبھی دوبارہ پریکٹس کرنے لگو تو بتانا۔ میں بھی سیکھوں گا۔"
"ٹھیک۔۔۔"
"ویسے تو شاید سارہ کو بھی آتے ہوں یہ دونوں کام۔" سعد نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"سارہ بھی پہلے سرکس میں کام کرتی تھی۔ اسے جانتے ہو؟" سعد نے سارہ کی یاد آنے پر یونہی رضوان الحق سے پوچھا۔
"نہیں! اس نام کی کسی لڑکی کو تو میں نہیں جانتا۔" اس نے سرہلایا۔
"اچھا۔۔۔ میں نے سوچا شاید تم بھی وہیں کہیں جوکری اور جگلری کرتے تھے۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور دور سے آتے کھاری کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔
"او بھئی کھاری! بہت مبارک ہو دولہے میاں۔" کھاری کے قریب آنے پر سعد نے گرمجوشی سے اس سے ملتے ہوئے کہا۔ دانت نکالتا کھاری سعد کو دیکھ کر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔
"اتنی سی عمر میں میدان مار لیا تم نے۔ ہمیں دیکھو! ابھی تک اکیلے پھر رہے ہیں۔" سعد نے اسے سنجیدہ ہوتے دیکھ کر دوستانہ ماحول بنانے کی کوشش کی۔
کھاری نے ہلکا سا مسکرا کر سر جھکا لیا اور رضوان کی طرف دیکھنے لگا۔
"سعد صاحب' بہت اچھے بندے ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر ذرا بھی نہیں لگتا کہ ان کے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" رضوان نے مسکرا کر کھاری سے کہا۔ کھاری نے اس بات پر سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا جو۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
"اتنا ہنگامہ' اتنا ہجوم تھا تمہاری شادی پر کہ میں تمہیں کچھ دے بھی نہیں سکا۔" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کھاری سے کہا۔ "نہ کوئی تحفہ لایا' نہ سلامی دی۔" جیب سے والٹ نکالتے ہوئے وہ بولا۔ پھر والٹ سے پانچ ہزار کا نوٹ نکال کر کھاری کی طرف بڑھایا۔ "یہ تمہارے اور تمہاری دلہن دونوں کے لیے ہیں۔"
"نئیں' جی!" کھاری نے سعد کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روکتے ہوئے کہا۔ "آپ ادھر آئے ہو ایہہ ای بڑا تحفہ ہے۔"
"تکلف مت کرو یار! یہ ایک بڑے بھائی کی طرف سے تحفہ ہے۔" سعد نے کھاری کے تکلفانہ انداز پر مسکراتے ہوئے کہا۔
"آپ نے تحفہ ہی دینا اے نا؟" کھاری نے سعد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' اس کا ہاتھ ابھی بھی سعد کے ہاتھ پر تھا۔ سعد نے اثبات میں سرہلایا۔
"تے آپ سانوں دوتوں کو۔۔۔" کھاری نے اپنی اور رضوان الحق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ گیت سنا دیو۔"
"کون سا گیت؟" سعد نے چونک کر کھاری کی طرف دیکھا۔
"اوہی ۔۔۔" کھاری نے اسے نظروں میں جتاتے ہوئے کہا اور بائیں کان پر بایاں ہاتھ رکھ کر دایاں بازو سعد کی طرف لہرایا۔ "اوکھے پینڈے لمیاں نے راہواں عشق دیاں۔"
رضوان الحق دلچسپی سے کھاری کی اس ادا کو دیکھ رہا تھا اور سعد دم بخود کھاری کی آواز سن رہا تھا جس نے ایک لائن سنانے کے بعد اس کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو' اب آگے آپ سناؤ۔
"لیکن مجھے تو گانا نہیں آتا یار!" سعد نے کچھ دیر بعد نارمل ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کھاری کی مخفی ذہانت کو سراہ رہا ہو۔
"اچھا جی! نئیں آوندا؟" کھاری نے جواب میں یوں دیکھا جیسے جتا رہا ہو مجھے بچہ سمجھ رہے ہو۔
"نا۔" سعد نے منہ سے کھٹاک کی آواز نکالتے ہوئے کہا۔
"مہ نور باجی نوں پتا ہے کہ آپ نوں گانا نئیں آندا؟" (ماہ نور باجی کو علم ہے کہ آپ کو گانا نہیں آتا؟) کھاری

نے کہا اور زیر لب مسکرا دیا۔

"میں نے اس سے تو کبھی پوچھا نہیں۔" سعد شرارت سے مسکرایا۔ اسے اپنے اور کھاری کے درمیان مزاح کا ایک عجیب سا تعلق بنتا محسوس ہو رہا تھا۔

"چلو! مہ نور باجی نوں نئیں بتاتے' آپ گانا سناؤ۔ میں آپ دے نال گاتا ہوں۔" کھاری نے جیسے اس سے "کچھ دو' کچھ لو" والی سودے بازی کرتے ہوئے کہا۔

"ہاہا!" سعد کا جاندار قہقہہ فضا میں ابھرا۔ "چلو! تم شروع کرو۔ میں کوشش کرتا ہوں۔"

"ہن ای لیو (ابھی لیں)" کھاری سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"پھلاں وانگوں جندڑی عشق رلا دیندا!" اس نے تان اڑائی۔

"اوکھے پینڈے لمیاں نی راہواں عشق دیاں۔

درد جگر تخت سجاواں عشق دیاں......

کچھ دیر بعد سعد کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور کھاری اور رضوان الحق مبہوت ہو کر سعد کو سن رہے تھے۔



ولیمہ کی دلہن سعدیہ کا بناؤ سنگھار مکمل ہو چکا تھا۔ ماہ نور نے اس کے میک اپ کو فائنل ٹچز دیے اور اس سے ذرا فاصلے پر ہٹ کر کھڑی ہو کر اس کا جائزہ لینے لگی۔ اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو اسے پورا کر لیا جائے۔

"زبردست بھئی! تم تو بہت اٹریکٹو ہو' بڑا فوٹو جینک چہرہ ہے تمہارا۔" اپنے فون پر سعدیہ کی تصویریں لیتے ہوئے اس نے کہا۔

سعدیہ' ماہ نور سے میک اپ کروانے کے دوران کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ میگزین میں چھپی ماڈرن لڑکیوں جیسی لڑکی اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اس کو سنوار رہی تھی۔ سعدیہ کا اپنا پس منظر بھک سے اڑ کر کہیں دور جا پڑا تھا۔ وہ کون تھی' اس کے ماں باپ کون تھے' اب تک کی عمر اس نے کہاں اور کیسے گزاری تھی' سب ایک دم ماضی بن چکا تھا۔ جسے بھلا کر وہ اپنے پیش منظر میں موجود تھی۔ جہاں جدت تھی' خوب صورتی تھی' آسائش تھی۔

جدت' خوب صورتی' آرائش آسائش یہ الفاظ بھی میگزین ہی میں اس نے پڑھے تھے۔ وہ سب جو پڑھا تھا' وہ اسے ہاتھ لگا کر چھو سکتی تھی اور اس انقلاب کا سرچشمہ اس کا سرتاج افتخار احمد عرف کھاری تھا۔ کھاری جسے کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک ان پڑھ' سودائی سے انسان کا درجہ دیتے ہوئے اس پر صرف اسی بات کا رشک کیا تھا کہ وہ فارم ہاؤس میں رہتا تھا۔

ایک لمحاتی جرات نے سعدیہ کو فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا۔ اس نے طنز کرتی اور جتاتی ہوئی نظروں سے آپا رابعہ کو دیکھا جو گزرے کل سے آج تک کے عرصے میں پہلی بار اس سے ملنے آئی تھیں۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

"یہ راتوں رات بوڑھی کیوں لگنے لگی ہیں؟" فاتحانہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے سعدیہ نے ذرا کی ذرا سوچا۔ "یوں لگتا ہے جیسے ان کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔"

اس کا دل لمحہ بھر کو کانپا اور ایک احساس جرم سا اس کے محسوسات میں ابھرا لیکن اگلے ہی لمحے وہ اپنی نئی دنیا میں مگن ہو گئی' جہاں خوشیاں اور رونقیں تھیں۔

"آنٹی! سنا ہے آپ کو دین پر خاصی دسترس حاصل ہے۔" ماہ نور نے دھلے اور گیلے ہاتھ ٹشو پیپر سے خشک کیے

اور آپا رابعہ کے قریب بیٹھ گئی۔

اس کے اس بے تکلفانہ انداز پر آپا رابعہ ذرا محجوب سی ہو کر قدرے سمٹ گئیں۔

"نہیں بیٹا۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" انہوں نے نیچی آواز میں کہا۔

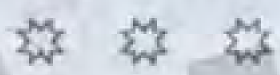
"تائی صابرہ اور کھاری دونوں ہی بتاتے ہیں کہ دین کے بارے میں آپ کو خاصا علم ہے اور آپ درس بھی دیتی ہیں۔"

"کھاری بے چارہ تو ابھی تک ایک دو سپارے ہی ٹھیک طرح سے پڑھ پایا ہے اور اسی کو بہت سمجھتا ہے' اس لیے کہہ رہا ہو گا۔ کسی نے اس بے چارے کی دینی تعلیم کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اسی لیے وہ اس عمر میں اتنا بھی پڑھ لینے کو علم جانتا ہے۔ ورنہ بہت چھوٹی عمر میں بچے ناظرہ قرآن مکمل کر چکے ہوتے ہیں۔ اتنا ہی میں بھی اپنے بچپن میں کر چکی ہوں۔" انہوں نے انکساری سے جواب دیا۔

"اچھا؟" ماہ نور مسکرائی۔" اور تائی صابرہ کو بھی غلط فہمی ہی ہوئی ہو گی۔ وہ تو محفل میلاد کروانا چاہ رہی تھیں آپ کی صدارت میں۔ آپ سے درس دلوانا چاہ رہی تھیں۔"

"یہ ان کا بڑا پن ہے۔" آپا رابعہ اسی انداز میں بولیں۔ "مولوی صاحب کی بی بی سمجھ کر سوچتی ہیں کہ شاید میں بھی کوئی باعلم عورت ہوں۔ جبکہ میرے تو سارے ہی سبق ادھورے ہیں..... ناپختہ اور کچے۔"

"ہوں!" ماہ نور نے غور سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے آپا رابعہ کی شخصیت میں کوئی اسرار والی بات نظر آ رہی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا نام دے۔



"شکر ہے! یہ شادی ختم ہوئی۔ ایک دن کا کہہ کر لے آئی تھیں۔ تین دن گزر گئے اور میں تو اب تک بری طرح فیڈ اپ ہو چکا ہوں اس ہنگامے سے۔ جس میں ہر قسم کا بندہ بس ہلڑ مچانے پر لگا ہوا ہے۔"

سلمان نے اکتائے ہوئے انداز میں ماہ نور سے کہا۔ وہ جو ناخنوں پر کیوٹکس ریمور میں بھیگا روئی کا پھاہا رکھ کر ان پر چڑھے رنگ چھڑانے میں مصروف تھی۔

"گو اتنا تو مزا آیا۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔ "تم تو سخت بورنگ ہو بھئی۔"

"میں ایسے مزے سے اس کے بغیر ہی بھلا ہوں" سلمان نے چڑے ہوئے انداز میں کہا "اچھا بھلا میں اگلے روز واپس جا رہا تھا۔ ممی کا حکم آ گیا ماہی کے بغیر نہ آنا۔ اسے ساتھ لے کر ہی آنا۔ کیا تھا جو تم بعد میں آ جاتیں۔"

"ہاں! میں بعد میں بھی جا سکتی تھی..... سعد کے ساتھ چلی جاتی واپس۔ تم خوامخواہ رکے۔" ماہ نور نے اسے چڑایا۔

"سعد کے ساتھ؟" سلمان نے اسے دیکھا۔ "وہ تو فی الحال واپس نہیں جا رہا۔" اس نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ماہ نور چونکی "وہ کیوں نہیں جا رہا واپس؟"

"اس کی اور چچا سردار کی خوب بن گئی ہے۔ چچا رات ولیمہ کے بعد اس سے کہہ رہے تھے' وہ رک جائے۔ وہ خود بھی کچھ دن کے لیے فارغ ہیں۔ مزے سے شطرنج کھیلیں گے۔ گھوڑے دوڑائیں گے اور فارمنگ کرائیں گے' چچا کے پاس جو گراموفون ریکارڈز ہیں' ان کا کلیکشن بھی دکھانا ہے انہیں سعد کو۔ اور نجانے کیا کیا ترغیبیں دے رہے تھے۔ وہ بھی شاید بڑا فارغ آدمی ہے۔ خوشی سے مان گیا۔ لہٰذا وہ فی الحال واپس نہیں جا رہا۔"

"اچھا!" ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔



"بھئی! یہ سلمان تو بڑی جلدی مچا رہا ہے جانے کی۔ میرا خیال تھا' آج کی رات تم دونوں مزید ٹھہر جاتے۔" دوپہر کے وقت جب وہ فارم ہاؤس کے پچھلے حصے میں بنی سنگ مرمر کی چھوٹی سی بارہ دری میں رکھے سفید سنگی تخت پر نیم دراز درختوں پر جھولتے پرندوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے میں مشغول تھی' سردار چچا نے ادھر آتے ہوئے اس کا دھیان توڑا۔ وہ ان کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس کی آفس سے آج تیسری چھٹی تھی چاچا! اسے تو واپس جانا ہی ہے۔ آپ کو پتا ہے نا' وہ پہلے ہی کہاں ٹک کر کوئی نوکری کرتا ہے" اس نے کہا۔

"ہاں! یہ بھی ہے۔ ادھر تمہاری ممی کو کہیں پریشانی کے مارے کچھ ہو نہ جائے" وہ شرارتاً" ہنسے۔

"آپ کو پتا ہی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اور تمہارا کیا دل چاہ رہا ہے' رہنا ہے یا جانا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ بھی جاؤں تو کوئی بات نہیں۔" اس نے لاپروا بنتے ہوئے کہا۔

"اچھا واقعی!" وہ حیران ہوئے۔ "تمہارا فائنل سمسٹر ہے۔"

"جی ہاں' میرا تو بس پیپر ہی سبمٹ ہونا باقی ہے۔ جب چاہے کرا دوں۔" اس نے انہیں اطمینان دلایا جبکہ دل میں وہ ممی کے ہاتھوں اپنی درگت پر کانپ رہی تھی۔

"تو پھر سلمان کیوں تمہیں بھی واپس ساتھ لے جانے کی ضد کر رہا ہے' میں ابھی اس کو منع کرتا ہوں۔"

"ہاں! تو اور کیا۔" وہ بسوری۔ "اب اتنی رونق میں سے کس کا واپس جانے کو جی چاہتا ہے۔"

"تم فکر نہیں کرو۔ میں ابھی اسے اکیلے واپس بھجواتا ہوں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ان کے جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔

"سعد واپس نہیں جا رہا۔ وہ یہاں شطرنج' رائیڈنگ' سوئمنگ' میوزک' گالف اور چچا سردار کی کمپنی کے درمیان مزے سے رہے گا۔ یہ تصور ہی اتنا مزے کا ہے کہ میرا واپس جانے پر کیسے دل چاہ سکتا ہے۔ پڑھائی ... اس نے سفید سنگی فوارے کے پیروں میں مسلسل گرتے پانی سے جم جانے والی کائی پر نظر جمالی۔ "پڑھائی تو عمر بھر کی ہے۔ پاس بھی ہمیشہ وقت پر ہوتی رہی ہوں۔ کچھ دن پڑھائی نہ بھی کروں گی تو کیا ہو جائے گا... جو فیل ہو جاتے ہیں' جن کے سمسٹر زلیٹ ہو جاتے ہیں' وہ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں... میں بھی تو انسان ہی ہوں نا۔"

اس نے ذہن کا بوجھ ہواؤں میں اڑاتے ہوئے کہا اور دوبارہ نیم دراز ہو کر درختوں کے سرسراتے پتوں کے درمیان سے گزرتی سورج کی روشنی پر نظر جمالی۔ دھوپ اور چھاؤں کا یہ نرم گرم امتزاج اس کے اعصاب پر غنودگی سوار کیے دے رہا تھا۔ دل' دماغ پر حاوی ہو رہا تھا یا عشق نے عقل کو پچھاڑا تھا۔ اس کا نیم غنودگی میں جاتا ذہن سمجھ نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مذہب..." شیکھر نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا اور پھر سگریٹ کا گل ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے نادیہ کی طرف دیکھا۔ "ایک بالکل علیحدہ بحث ہے۔"

وہ نادیہ کی دعوت پر سینڈوچ کھانے اور کافی پینے کے لیے اس کے کمرے میں موجود تھا۔

"یہ ایک تعصب کی شکل میں انسان کے لاشعور میں بستا ہے اور اپنی جھلک انسان کی روزمرہ گفتگو میں کبھی کبھار گرما گرم بحث کے دوران یوں دکھاتا ہے کہ اسے دیکھ کر وہ بندہ بھی حیران رہ جاتا ہے' جس کے لاشعور میں وہ چھپا ہوتا ہے۔"

نادیہ نے غور سے اس کے بات سنتے ہوئے یوں سر ہلایا۔ جیسے وہ شیکھر کی بات سمجھ رہی ہو۔

"مگر مذہب انسان کا انتہائی ذاتی معاملہ ہے۔ یہ فیصلہ خود کرنا چاہیے کہ اسے مذہب کے معاملے میں کیا فیصلہ کرنا ہے۔ کسی ایک مذہب کی تقلید کرنے والوں کے گھرانے میں پیدا ہو جانا' کسی مخصوص مذہب کے پیروکاروں کے معاشرے کا فرد ہونا یا کسی قسم کے حالات کے جبر کے تحت کسی مذہب کا پیروکار بن جانا اور اس کے مروجات و ممنوعات کو اپنا لینا بالکل غلط ہے۔" شیکھر اپنی دھن میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ "تعقل ایک ایسی چیز ہے۔ جس پر پرکھی چیزیں کبھی غلط ثابت نہیں ہوتیں۔"

"اگر تعقل کی پرکھ ضروری ہے تو لاشعور میں بسے تعصب کا کیا جائے۔" نادیہ نے شیکھر کا مگ کالی گاڑھی کافی سے بھرتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنی اب تک کی زندگی دو مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان گزاری ہے۔" اس نے کہا "لیکن ان دونوں گھروں میں مذہب کے متعلق شدت سے کوئی رویہ میں نے نہیں دیکھا۔ نہ میرا باپ شدید قسم کا مسلم تھا' نہ ہی میری ماں شدت سے عیسائی تھی۔ لیکن عجیب سی بات ہے کہ جب میں خود اپنا تجزیہ مذہب کے حوالے سے کرتی ہوں میرا دل اپنے باپ کے آبائی مذہب کی طرف کھنچتا ہے' حالانکہ میں اس مذہب کے بارے میں شاید کچھ بھی نہیں جانتی۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے لاشعور میں تمہارا باپ ایک فینٹسی کی صورت بستا ہے۔ شاید تم اپنے باپ سے ماں کی نسبت زیادہ محبت کرتی ہو۔" شیکھر نے کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد ایک عریاں تجزیہ منہ سے اگلا۔

"ایسا نہیں ہے" اس نے سر ہلایا۔ "میں اپنے باپ سے زیادہ ماں کے پاس رہی ہوں۔ پھر بھی مجھے وہ ماحول اور اس ماحول میں رچے عقائد اور نظریات بارہا یاد آتے ہیں۔ مجھے ان میں ایک عجیب سی وضع داری اور رکھ رکھاؤ محسوس ہوتا ہے... اور نجانے' مجھے کیوں ایسا لگتا ہے' اس کی وجہ ان سب کا اس مذہب کا پیروکار ہونا ہے۔"

"فینٹسیز..." شیکھر نے اس کی طرف دیکھا۔ "جو ہم سے دور ہو جاتا ہے اور پہنچ میں نہیں رہتا' اس کے متعلق ہم اور طرح سے سوچنے لگتے ہیں۔ تمہارا ابھی یہ ہی حال ہے... ایک بات یاد رکھنا' مذہب کے متعلق تحقیق کرنے اس وقت بیٹھنا' جب تم دل میں پکا فیصلہ کر لو کہ تمہارا دل اور دماغ کسی مذہب کی طرف جھکتا ہے۔ ورنہ تمہاری تحقیق تمہارے لیے عذاب بھی بن سکتی ہے اور اگر ایسا فیصلہ نہ کر پاؤ تو میری مانو! کسی بری صورت حال سے لادین رہنا زیادہ اچھی صورت حال ہے۔"

"تم بھی تو ایک مذہب کے پیروکار ہو نا؟" نادیہ نے کہا۔

"نہیں! یہ برائے نام نسبت ہے۔ جغرافیائی اور خاندانی نسبت۔ ورنہ میں دنیا کے کسی بھی مذہب کا پیروکار نہیں ہوں... اور میں اس کیفیت میں بہت پرسکون اور خوش ہوں۔ انسانیت اور انسانیت کی آزادی دنیا کا حقیقی ترین مذہب ہے۔ بس اس سے جڑے رہو۔"

"لیکن میں اس سے اتفاق نہیں کرتی۔ میرا خیال ہے کہ کسی مذہب سے منسلک ہونا انسان کی انفرادی شناخت کے لیے بہت ضروری ہے۔" نادیہ نے کہا۔

"تو پھر سبز پاسپورٹ' سبز عمامے اور سبز پرچم... تینوں کو حاصل کرنے کی خاطر بھاگو... اور جب انہیں حاصل کر لو تو پھر مجھے ضرور بتانا کہ کون سی صورت حال زیادہ بہتر ہے۔ اب والی یا تب والی۔" شیکھر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ضرور..." نادیہ نے کہا۔ اس کی نظروں کے سامنے سبز رنگ ناچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم واپس نہیں گئیں؟" کھاری کے ولیمہ سے تیسرے دن ماہ نور سے سعد کی ملاقات فارم ہاؤس کے اصطبل کے قریب ہوئی۔ ماہ نور نے دیکھا، بھورے رنگ کے شلوار قمیص میں اس کا قد زیادہ دراز لگ رہا تھا۔ اس نے پاؤں میں براؤن پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔ اس حلیے میں اس نے سعد کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اسے یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔

"ہاں! میں نہیں گئی۔" اس نے سعد کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "تائی صابرہ نے روک لیا، سو میں رک گئی۔"

"تمہاری پڑھائی کا حرج نہیں ہوگا اس طرح؟" اس نے چلتے چلتے رک کر پوچھا۔

"نہیں۔" ماہ نور کو اس سوال سے چڑ سی محسوس ہوئی۔

"اچھا!" وہ دوبارہ چلنے لگا۔ "سنا ہے تمہاری ممی سخت ناراض ہو رہی تھیں تمہارے واپس نہ جانے پر۔"

"ممی کو تو ناراض ہونے کا بہانا چاہیے۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"یار! تمہیں اپنی ممی کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔" سعد نے کہا۔

"وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔" ماہ نور نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ "تم بتاؤ تم کیسے رک گئے؟"

"میں۔۔" اس نے چلتے چلتے سامنے دیکھا اور ہنس دیا۔ "عجیب سی بات ہے۔ میں یہاں آنے سے جتنا ہچکچا رہا تھا۔ اتنا ہی یہاں آنے کے بعد مجھے یہ جگہ اچھی لگنے لگی ہے، میں یہاں گھر کا سا آرام محسوس کر رہا ہوں کیونکہ۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیونکہ کیا؟" ماہ نور نے رک کر پوچھا۔

"کیونکہ یہاں ملنے اور مشاہدہ کے قابل بہت لوگ ہیں۔ ڈائیورسٹی (Diversity) ہے لوگوں میں۔۔۔ مختلف النوع لوگ۔ جتنے لوگ، اتنے ہی قصے اور تمہیں تو پتا ہی ہے کہ مجھے قصے سننے میں کتنی دلچسپی ہے۔"

"اچھا! تم قصے سننے کے لیے رکے ہو۔" ماہ نور نے کہا۔

"اور بھی بہت کچھ ہے۔ تمہارے چچا دلچسپ انسان ہیں۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنے کا مزا آتا ہے۔ انہوں نے مجھے شکار، گھڑ سواری اور شطرنج کے علاوہ اپنے پاس موجود ریکارڈز کا ذخیرہ دکھانے کا لالچ دے کر روک لیا۔ میں نے بھی سوچا کہ زندگی میں کوئی وقت ایسا بھی ہونا چاہیے۔ جس میں انسان ویسا رہے، جیسا وہ رہنا چاہتا ہے۔ کوئی مصلحت، کوئی مجبوری اسے خود پر کوئی ملمع چڑھانے پر مجبور نہ کر سکے۔"

"تمہیں یہاں ایسا محسوس ہو رہا ہے؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ یہاں منافقت کم اور اورتجنیلیٹی ——— زیادہ ہے۔۔۔ اس لیے"

"اچھا!" ماہ نور نے نیچی آواز میں کہا "اچھی بات ہے۔"

"لیکن یہاں مردانہ اور زنانہ حصّے کا بڑا مسئلہ ہے۔ تم یہاں ہو اور ہم شاید دو دن کے بعد مل رہے ہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ شاید شادی کے لیے گھر والوں کے یہاں شفٹ ہونے کی وجہ سے ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔" ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے میں یہ توقع کر سکتا ہوں کہ یہاں قیام کے دوران ہم روزانہ مل سکتے ہیں؟" سعد نے ایک درخت کی نیچی شاخ پر جھولتے پتے کو چلتے چلتے انگلی سے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یقیناً۔" ماہ نور کا دل ہلکا سا لرزا۔

"تم میرے ساتھ خانہ بدوشوں کی بستی چلوگی؟"

"خانہ بدوشوں کی بستی۔" وہ چلتے چلتے رکی۔ "وہ کہاں ہے؟"

"یہیں کہیں قریب ہی ہے۔ وہی جگہ جہاں سے میں بندر اور بندریا کا جوڑا لایا تھا۔ جہاں سے مجھے وہ ریچھ ملا تھا۔"

"اوہ!" اس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر وہ خانہ بدوش تھے تو اب تک یعنی سال بھر میں کہیں اور جا چکے ہوں گے۔"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے سرہلایا۔ "لیکن معلوم کر لینے میں کیا حرج ہے۔"

"یہ بھی ہے۔" ماہ نور نے سرہلایا۔ "ویسے سنا ہے، یہ لوگ صفائی پسند بالکل بھی نہیں ہوتے۔ گندے، میلے کچیلے۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا "تمہیں ان کے پاس اٹھتے بیٹھتے وحشت نہیں ہوتی تھی؟"

"انسان اپنی جبلت پر پیدا ہوتا اور پلتا بڑھتا ہے۔" سعد نے رک کر ماہ نور کو دیکھا۔ "وہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا اور سانس لیتا ہے، وہ ماحول عمر بھر اس کے لاشعور میں بیٹھا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ خانہ بدوش کا بچہ لکھ پڑھ بھی بن جائے، اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، اس کی خصوصیات اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ ان کی دنیا وہ ہی ہے۔ اور وہ اسی میں مگن ہیں۔ وہ اس کے عادی ہیں جیسے ہم اپنی جبلت اور تربیت کے مطابق ایک مخصوص طرز زندگی کے عادی ہیں۔ میں چیزوں کو اسی نظر سے دیکھتا ہوں۔ ان لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے مجھے یہ خیال آنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ وہ تو ایسے ہی ہیں۔ یہ تو میں ہوں جو ان کے پاس جانے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ سوچنا تو مجھے چاہیے۔ میں اپنے لیے ان کو اپنی طرز زندگی بدلنے پر تو مجبور نہیں کر سکتا تھا۔"

"ہوں!" ماہ نور نے سرہلایا۔ "پھر بھی ہمت ہے تمہاری۔"

"فکر نہیں کرو۔ میں تمہاری ہمت بھی بڑھانے والا ہوں۔ تم میرے ساتھ وہاں چل رہی ہو۔"

ماہ نور نے جواب دینے کے بجائے سامنے کھڑی عمارت کو دیکھا۔

"میرے ساتھ رہنے کے لیے ایسے ایڈونچرز کا تو عادی ہونا پڑے گا۔" اس نے کہا تو ماہ نور نے اپنی سماعت پر شک کرتے ہوئے اس کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو "کیا کہا۔"

"میرا مطلب ہے، میرے قریبی دوست جانتے ہیں کہ میں ایسے ایڈونچر کرتا ہی رہتا ہوں۔" وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارے قریبی دوست؟" ماہ نور نے مزید وضاحت چاہی۔

"ایک ہی ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ ماہ نور ابھی تک وضاحت طلب انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"ابراہیم۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بہت سویٹ بندہ ہے۔" وہ یوں مسکرایا۔ جیسے اسے ابراہیم کا تصور کر کے اس پر پیار آ رہا ہو "بکتا ہے، جھکتا ہے۔ لڑتا ہے مگر ہر ایسی جگہ میرے کہنے پر میرے ساتھ چل پڑتا ہے۔"

"ابراہیم جانتا ہے کہ تم یہ سب کچھ کرتے پھرتے ہو؟" ماہ نور نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "میلے ٹھیلے خانہ بدوش، کمہار۔۔۔ الابلا۔"

"سب نہیں، مگر اتنا، جتنا میں اسے بتانا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا اور آگے چلنے لگا۔ ماہ نور نے اس سے چند قدم پیچھے کھڑے رہتے ہوئے اسے خود سے آگے چلتے ہوئے دیکھا اور پھر تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب آ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"تم نے کھاری کو دیکھا، وہ کتنا خوش ہے اور اس کی بیوی بھی کتنی خوش ہے، مگر عمر میں ابھی چھوٹے ہیں دونوں، ہے نا؟" اس نے سر اٹھا کر سعد کی طرف دیکھا۔

"ہاں! کھاری خوش ہے۔" وہ بولا۔ "وہ صرف خوش ہی نہیں خوش قسمت بھی ہے۔ چھوٹے چھوٹے واقعات پر خوش اور مطمئن ہو جانا خوش قسمتی کی نشانی ہے۔" اس نے کہا۔

"خوش ہونا خوش قسمتی ہے کیا؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"بالکل!" اس نے سر ہلایا۔ "تم اندازہ ہی نہیں کر سکتیں کہ کسی بات پر دل سے خوش ہونا کتنی بڑی خوش قسمتی ہے۔"

"تم ہوتے ہو کبھی دل سے خوش؟" ایک سیدھا سوال آیا۔

"بہت دفعہ۔" اس نے کہا۔

"اچھا!" ماہ نور کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہوئی۔ "لگتا تو نہیں۔"

"شاید مجھے اظہار کرنا نہیں آتا۔ لیکن میں تو بہت معمولی معمولی باتوں پر خوش ہو جاتا ہوں......"

"مثلاً؟"

"مثلاً۔" اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ یاد کر رہا تھا۔ "مثلاً" پھر اس نے گردن موڑ کر ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ جب ایک بوڑھی خانہ بدوش عورت نے مجھے اپنے ٹرنک میں رکھی چیزوں کے نیچے سے ایک نئی چادر نکال کر تحفے میں دی۔ وہ ایک سستی سی پرنٹڈ چادر تھی۔ جس کو خانہ بدوش لڑکے کبھی سر پر باندھے پھرتے ہیں اور کبھی شانوں پر اوڑھ لیتے ہیں۔ وہ سستی اور عام سی چادر تھی۔ مگر اس بوڑھی عورت کے تمام اسباب میں سب سے زیادہ قیمتی چیز تھی۔ غالباً" اس روز میں اتنا خوش تھا کہ مارے خوشی کے میرے آنسو نہیں رک رہے تھے۔" وہ یاد کرتے ہوئے مسکرایا۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"اور..." ماہ نور نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

"اور ایک بار جب میں نے ایک پھرتے پھراتے فقیر سے تان اڑانا سیکھی۔ وہ کافی گانا سیکھنا میری خواہش تھی۔ مگر ایک ہفتے کے اندر اندر وہ مجھے سکھانے میں اتنا الو الو ہو گیا کہ جب میری آواز اسے سوز اور جنون کی تڑپ میں ڈوبی بقول اس کے محسوس ہونے لگی تو اس نے خوشی کے مارے اپنا اکتارہ مجھے دے دیا۔ وہ اکتارہ اس کا واحد شوق اور قیمتی ترین اثاثہ تھا۔ میرے ہزار منع کرنے کے باوجود اس نے وہ اکتارہ مجھ سے واپس نہیں لیا۔" وہ بتا رہا تھا۔

ماہ نور کو ایک دم اپنی زندگی کی خوشیوں کے محور اور خوش ہونے کی تمام وجوہات اس کی باتوں کے سامنے ہیچ لگنے لگیں۔

"اور..." اسے اپنی آواز خلا سے آتی محسوس ہوئی۔

"اور..." وہ مزید کوئی ایسی بات سنانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "اور اس وقت بھی میری خوشی اپنے عروج پر تھی۔ جب سید پور کے میلے کی میوزیکل نائٹ میں تم دیوانہ وار میری طرف لپکی تھیں۔"

"واقعی!" ماہ نور کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"ہاں!" اس نے سر ہلایا۔ "وہ خوشی یہ احساس پانے کی تھی کہ میرے بہروپ پہچانتی جو لڑکی مجھ سے "تم کون ہو" کا سوال کرتی میری طرف آئی یقیناً "بہت خاص" تھی اور میری زندگی میں اس کا رول یقیناً "بہت اہم" ہو گا۔"

"اوہ!" ماہ نور کے دل نے شاید اس سے اچھا لمحہ خود پر اس سے پہلے گزرتا محسوس نہیں کیا تھا اس کا سر اس لمحے کی خوب صورتی کو محسوس کرتے ہوئے تشکر کے عالم میں جھکنے لگا۔

"خوش گوار لمحے، ہمارے آگے پیچھے، دائیں بائیں ساتھ ساتھ، چلتے ہیں بات صرف ان کو محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔ ہم اکثر ان کو اگنور کر دیتے ہیں ماہ نور!" وہ کہہ رہا تھا۔

"اور..." اس نے خوشی سے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

"اور..." وہ ہنسا اور سر ہلا کر بولا۔ "اور مت پوچھو... آج کے لیے... بلکہ تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے... اور سنانے بیٹھا تو شاید میری خوشی تمہیں اپنی خوشی نہ لگے۔"

ہواؤں میں اڑتا دل چشم زدن میں اپنی اوقات میں واپس آگیا۔

"ہاں! شاید اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے سر ہلا کر کہا اور آگے چل دی۔ وہ اس سے چند قدم پیچھے کھڑا اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔



سعدیہ کی باتوں نے کھاری کو زندگی کا پہلا حوصلہ، تسلی اور دلاسا دلایا تھا۔ وہ سعدیہ کے تصور سے خائف تھا۔ وہ خود کو سعدیہ کے قابل نہیں سمجھتا تھا، مگر سعدیہ نے اسے باور کرایا تھا کہ اس کے لیے وہ اس کا شہزادہ سلیم تھا۔ کھاری شادی کے چند دن بعد ہواؤں میں اڑتا ہلکا پھلکا اور آزاد پرندہ بن چکا تھا، جو آسمان پر جس سمت چاہتا پرواز کر سکتا تھا۔ سعدیہ کی صورت میں اسے زندگی میں پہلا سچا اور حقیقی رشتہ عطا ہوا تھا۔

اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ کسی سے متعلق ہونا کتنی بڑی نعمت تھی۔ وہ کم عمر لڑکی اسے، بہت سی ایسی باتیں سکھا رہی تھی جن کے بارے میں پہلے اسے کچھ علم نہیں تھا۔ پڑھی لکھی سعدیہ کے ان پڑھ شوہر نے زندگی کی کتاب کی الف، ب پڑھنا شروع کر دی تھی... اور اس کتاب کے پہلے صفحے پر یہ عبارت جلی حروف میں لکھی تھی کہ۔

"سعدیہ سے اس کا رشتہ ایسا تھا جس کی وضاحت کرنے کے لیے اسے کوئی تمہید باندھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ دراصل وہ لاوارث تھا اور سعدیہ نے اس سے خدا ترسی میں یہ رشتہ باندھ لیا۔"

پہلے صفحے کی یہ عبارت اتنی دل خوش کن تھی کہ کھاری پر اگلے صفحے پڑھنے کی بے چینی نے سواری کر لی اور وہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلق نظر آنے لگا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

سعدیہ عزیز آفریدی



وہ اس وقت بہت غصے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا۔ شمسی ان کے سامنے ہو تو وہ اسے دو لگائیں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے انہوں نے اسے آٹا لانے کے لیے پیسے دیے تھے مگر دو گھنٹے مزید گزر جانے پر بھی وہ ندارد تھا۔

انہیں رات کے لیے ہوٹل سے کھانا لانا پڑا تھا۔ رات آٹھ کے بعد وہ گھر میں داخل ہوا تو بھی خالی ہاتھ۔

اماں نے گھور کر اپنے سپوت کو دیکھا۔ "کہاں کہاں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو۔" اس نے تھکن سے بھرے چہرے کو ہشاش بشاش کرتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

"وہ میں گھر سے نکلا تو....."

اماں کا غصہ سوا ہو گیا۔ "ہاں گھر سے کیوں نکلے تھے۔"

شمسی نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "ہائے اماں! میں تو آٹا لینے نکلا تھا۔ رات کی روٹی کا کیا ہوا....." وہ شرمندہ تھا۔

"تمہارے انتظار میں رہتے تو تینوں بچے بھوکے ہی سو جاتے۔ ہوٹل سے نان منگوائے۔"

"وہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ....."

"تمہارے ساتھ ہمیشہ سب کچھ اچانک ہی ہوتا ہے۔" بڑی بہن کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کھسیانا ہو کر ہنس پڑا۔

"بس انی باجی، وہ ہوا یوں کہ گھر سے نکلتے ہی صدیقی صاحب کی بیگم پریشان سی بھاگی جا رہی تھیں۔ میں نے انہیں آواز دی تو وہ رونے لگیں۔ صدیقی صاحب کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ان کے دونوں بیٹے ملک سے باہر ہیں۔ بیچاری اکیلی تھیں۔ سو میں ٹیکسی میں اسپتال لے کر گیا اور جب تک وہ خطرے سے باہر نہ ہو گئے، میں وہیں رہا اماں....." انیلا باجی کو بتاتے بتاتے وہ اماں کی طرف مڑا۔

اماں کا غصہ کم ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ان کی آنکھوں میں اک گلہ سا تھا۔ شوہر کو دنیا سے منہ موڑے دو سال ہو گئے تھے اور ان کے دونوں بیٹوں میں یہ سب سے بڑا سپوت تھا۔ بڑی بیٹی بھی ایک اچھی کمپنی میں ملازمت کرتی تھی۔ گزارہ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا تھا۔ شکر تھا کہ گھر اپنا تھا ورنہ تنخواہ داری میں زندگی کی گاڑی کھینچنا مشکل ہو جاتا۔

"کھانا کھاؤ....." اماں نے جب تک نہ کہا۔ اس نے کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ حکم ملا تو وہ ہاتھ دھو کر آ گیا۔

"پتا نہیں یہ خدمت خلق کا شوق اسے کہاں سے مل گیا۔ باپ دادا میں دور دور تک ایسی خرافات کا نام و نشان نہیں....."

"ایسے نہ کہیں اماں! جو وہ کرتا ہے اسے نیکی کہتے ہیں اور نیکی کرنے کی سعادت بہت کم لوگوں کو بخشی جاتی ہے۔ ہمیں نہیں پتا ہماری کب کی نیکی کس وقت ہمارے کام آ جائے۔"

"بس تم سب لوگ تو پڑھ پڑھ کر فلاسفر بن گئے ہو۔"

"اماں! فلاسفر نہیں۔ زندگی میں واقعی زندہ ہونے کا ثبوت ہر کوئی نہیں دے سکتا۔ آپ کو تو خوشی ہونی چاہیے کہ آپ کی اولاد صرف دنیا دار نہیں....."

"باہر خانقاہ لکھوا دوں؟" اماں چڑ گئی تھیں۔

انیلا باجی مسکرانے لگی تھیں۔ وہ جانتی تھیں۔ اماں بھی اندر سے درویش ہیں۔ بس کبھی کبھی اپنے بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی درویشی سے چڑنے لگتی ہیں۔

شمسی کھانا کھا رہا تھا جب ایک دم اس کا فون بجا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اماں نے سیل فون جھپٹ لیا۔

"اپنی بھی پروا کر لیا کرو کبھی۔ شکل دیکھی ہے؟ کھانا کھاؤ اور چپ کر کے سو جاؤ....."

شمسی کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ رافع اسے رات کے اس پہر کیوں کال کر رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی اس نے کال بیک کی۔ "رافع یار خیریت.....؟"

"نہیں یار! بڑے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ خون کی اشد ضرورت ہے۔ پانچ بوتلیں مانگی ہیں۔ تین کا انتظام ہو گیا ہے۔ ایک میں ہو جاؤں گا۔ ایک تو اگر دے دے۔ تیری بڑی مہربانی ہو گی۔" اس نے تسلی دے کر فون بند کر دیا اور انیلا باجی کو فون کیا۔

"کہاں ہو تم.....؟" انیلا باجی سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ وہ دوسرے کمرے میں ہو کر ان کو فون کرے گا۔

"انی باجی! میں اپنے روم میں ہوں، ایک مسئلہ ہو گیا ہے....."

"کیا..... تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں؟" وہ گھبرا گئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ گھبرا کر اس کے کمرے کا دروازہ بجاتیں اور اماں کی تفتیش شروع ہوتی۔ وہ فوراً بولا۔



"وہ رافع ہے ناں۔ اس کے بڑے بھیا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔۔۔ جی جی بشیر بھیا کا' خون دینا ہے بس۔ سامنے سے جاؤں گا تو اماں کو لازمی خبر ہو جائے گی سو میں کھڑکی سے جارہا ہوں۔ واپس آؤں گا تو بیل دوں گا آپ کے سیل پر۔۔۔ آپ گیٹ کھول دینا۔ پلیز میری اچھی باجی۔۔۔۔"

انیلا نے گہرا سانس لیا تھا۔ "چل ٹھیک ہے جا۔۔۔"

وہ کھڑکی سے گیا۔ انیلا باجی گیٹ بند کرکے کمرے میں آئیں تو اماں کو پہلے ہی موجود پایا۔

"تم دونوں مجھے باؤلا سمجھتے ہو؟"

"نہیں تو۔ اماں! اس کا جانا ضروری تھا ناں اس لیے۔۔۔"

وہ بشیر بھیا کے متعلق بتانے لگیں۔ خون دینے تک بات پہنچی تو اماں کا پارہ ہائی ہو گیا۔

"بہت خون ہے اس میں۔ جب دیکھو یار دوستوں کی مدد کرنے بھاگا دوڑا پھرتا ہے ابھی جوانی ہے پتا نہیں چل رہا۔ جب تھکا ہوا ٹائم آئے گا ناں تو ہڈی ہڈی بولے گی کہ کہاں ضائع کیا خون ۔۔۔ ماں کے خون اور دودھ کا اثر نہیں ملتا پھر ساری عمر جتنا مرضی کھالو پی لو۔ اس خون میں اور اس خون میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ ابھی سے اٹھتے بیٹھتے آہیں بھرنے تو لگا ہے۔ اب کیا بالکل بستر پر لیٹنا ہے اسے۔"

"توبہ ہے اماں! اللہ نہ کرے ایسی نوبت آئے۔"

"ہاں ۔۔۔ حرکتیں مت سدھارو بس آسرے دیکھو۔"

"آسرا تو دیکھنا پڑتا ہے ناں اماں! اس ایک آسرے کی چھاؤں میں تو پڑے ہیں ہم۔ اس کے حکم کے بغیر نہ ہم چل سکتے ہیں نہ کوئی عمل کر سکتے ہیں۔ وہ ہی توفیق دیتا ہے تو ہم قدم اٹھاتے ہیں نیکی کی طرف۔۔۔۔"

"اب رات کے ڈیڑھ بجے میں تمہارا نیکی نامہ سنوں گی؟" وہ اٹھ گئیں۔

اور انیلا باجی خلاصی ہونے پر شکر ادا کرنے لگیں۔

صبح دس بج رہے تھے' جب وہ گھر آیا تھا۔ بہت دل گیر' بہت اداس۔ اماں نے ڈانٹنا شروع کیا تھا کہ اس کا چہرہ دیکھ کر رک گئیں۔

"خیر ہے۔ بشیر ٹھیک ہے۔۔۔؟"

اور پھر جو شمسی پھوٹ پھوٹ کر رویا تو اماں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

"نہیں گیا۔ ہم سب نے بلڈ دیا۔ ڈاکٹر بھی پُر امید تھے کہ اچانک ہی انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مر گئے اماں! میرے بشیر بھیا۔ رافع اور میں کتنی ضدیں کرتے تھے ان سے۔۔۔ اور وہ کیسے اپنے کام پینڈنگ میں ڈال کر ہماری فرمائشیں پوری کرتے تھے' کبھی کرکٹ کھیلتے ہمارے ساتھ' کبھی گھمانے لے جاتے۔ ان کا بیٹا ابھی صرف سولہ برس کا ہے۔۔۔ صرف سولہ برس کا۔ پورے گھر کی ذمہ داری آگئی اس پر۔ اتنا چھوٹا سا ہے اماں۔۔۔ سولہ برس میں تو مجھے ٹھیک سے جوتے کے تسمے بھی باندھنے نہیں آتے تھے اور اسے پوری زندگی سنبھالنے کو مل گئی۔ وہ کیا کرے گا اماں! اپاہج بہن بھائی' ماں۔۔۔ وہ کیا کرے گا اماں! کیسے کرے گا۔۔۔؟"

اماں نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔ "اللہ اسے ہمت دے گا۔ حوصلہ دے گا۔ صبر دے گا' اگر وہ کچھ چھینتا ہے تو کچھ اشک شوئی کے لیے دیتا بھی ہے' صبر کر شمسی۔۔۔"

مگر شمسی بشیر بھیا کے چالیسویں تک نہیں سنبھل سکا۔ زندگی پھر آہستہ آہستہ پرانی ڈگر پر آگئی تھی۔ وہی اماں کی اس کی نیکیوں پر ناک بھوں چڑھانا' اس کا صفائیاں دینا' انیلا باجی کا ساتھ دینا۔۔۔

وہ بھی عام سا دن تھا۔ وہ اپنے اپنے آفسز کے لیے نکلے تھے کہ اچانک حالات بہت خراب ہو گئے۔ شمسی کو انیلا باجی کی فکر ہوئی مگر وہ ابھی آدھے راستے میں تھا کہ ایک لڑکی بے یارومددگار نظر آئی۔ وہ صرف نظر کر کے گزر رہا تھا' اس نے اسے پکارا۔

"پلیز بھائی! مجھے میرے گھر تک پہنچا دیں۔ حالات ایک دم سے خراب ہو گئے ہیں۔ ہر طرف گھیراؤ جلاؤ ہے۔ ٹرانسپورٹ سڑکوں سے غائب ہے۔ میں اتنی دور رہتی ہوں کہ بچتی بچاتی بھی پیدل چلوں تو کل صبح تک گھر پہنچوں گی۔"

شمسی نے ایک نظر اسے دیکھا اور خاموشی سے بائیک روک دی۔

انیلا باجی کا نمبر بند آرہا تھا مگر وہ اپنی پریشانی کو دل میں دبائے بائیک چلا رہا تھا۔ تیز رفتاری سے گلیوں گلیوں گھماتا وہ اس کو اس کے گھر تک پہنچا کے واپس لوٹ رہا تھا کہ شرپسندوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے لڑنے کی بہت کوشش کی مگر ایک نہ چلی' پھر ایک گولی بازو میں لگی ایک پتا نہیں کہاں۔۔۔ بس اسے یہ لگا کہ ایک آگ سی تھی جو اس کے جسم میں پھیلتی جارہی تھی۔ وہ گر رہا تھا جب ایمبولینس اور پولیس سائرن کی آواز آئی۔

"انی باجی۔۔۔" ایک آخری احساس۔۔۔ پھر پتا نہیں اس پر سے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو وہ اسپتال میں تھا۔ پورا کمرا پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔

"انی باجی۔۔۔" اس نے بے قراری سے پکارا۔ انیلا نے اس کے بال سہلائے نرمی سے پکارا۔

"میں یہیں ہوں تمہارے پاس' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اس دن میں بالکل اکیلی تھی اور ایک جگہ پھنس گئی تھی جب ایک پٹھان بھائی نے رکشا روکا۔ میں ڈر گئی مگر اس نے بہت سادگی سے پوچھا' بہن کہاں جانا ہے۔ میں نے کہا۔ کتنے پیسے لوگے۔۔۔ اس نے کہا۔

"او بہن! کہاں جانا ہے۔۔۔۔"

"کتنے پیسے لوگے خان۔۔۔؟" میں نے پوچھا تو وہ نرمی سے بولا۔

بہن بولا ہے' ابھی پیسے کی بات چھوڑو۔ حالات بہت خراب ہے۔ ہم گھر جارہا تھا تم کو کھڑے دیکھا تو کسی نے دل کے اندر بولا۔ جاؤ خان اس لڑکی کی مدد کرو۔ بولو بولو بہن! کہاں جانا ہے۔ پھر میں رکشے میں بیٹھ گئی مگر شمسی! ایک جگہ ہمارا رکشا روک لیا۔ وہ پورے پانچ آدمی تھے۔ مجھے اس وقت تم بہت یاد آئے۔ مجھے لگا تھا میں برے طریقے سے ٹریپ ہو گئی ہوں۔ پٹھان رکشے ڈرائیور والی ساری کہانیاں سچ ہیں مگر ایک دم اس خان نے ان سے لڑنا شروع کر دیا۔ وہ برے طریقے سے زخمی ہو گیا مگر خان نے ریوالور نکال کر فائر کیا تو وہ سب بھاگ گئے۔ خان مجھے گھر پہنچا کر ہی گیا۔ ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا شمسی! ہماری نیکی کب ہماری پریشانی کا حل بن جاتی ہے۔"

"یہ پھول۔۔۔" ساری بات سن کر شمسی بدقت بولا۔ "سارے محلے والے لائے ہیں۔ جس جس کو پتا چل رہا ہے' وہ بھاگا آرہا ہے۔ تم تو ایک دم سے اتنے مقبول ہو گئے ہو شمسی!" انیلا باجی نے پیار سے اس کا گال نوچا۔

تب ہی دروازہ کھلا' "چار دن بعد ہوش آیا ہے آپ کو۔ اتنی منتیں' اتنی دعائیں مانگی ہیں میں نے آپ کے لیے شمسی بھائی۔۔۔" بشیر بھیا کا سولہ سالہ بیٹا اظہر مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رافع اس کے پیچھے تھا۔

"تجھے پتا ہے آج تیری سالگرہ بھی ہے۔"

"میری سالگرہ۔۔۔ آج 18 اپریل ہے؟"

"ہاں' کبھی تو نے سوچا تھا کہ اپنی سالگرہ اسپتال میں منائے گا۔"

"نہیں تو۔۔۔"

"مگر مجھے ہر وقت یہی لگتا تھا کہ اپنی نیکی کمانے کی خو سے کہ یہ ضرور کسی نہ کسی جوکھم میں پڑے گا۔" اماں کا وہی غصہ' وہی بے قراری' اس نے اماں کا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ کو یہ یقین تھا کہ میں دوبارہ آنکھیں کھولوں گا؟"

اماں رونا شروع ہو گئیں۔ "ڈاکٹر تو ناامید ہو گئے تھے مگر مجھے پتا نہیں کیوں یقین تھا کہ میرا شمسی ضرور آنکھیں کھولے گا۔ آخر اتنی دعائیں جو ہیں اس کے ساتھ۔۔۔"

وہ ہنس پڑا۔ "پھر مانتی ہیں نا میری انسانیت فاؤنڈیشن کو۔۔۔"

اماں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ اس نے بہت سارے مسکراتے چہروں اور تالیوں کا ساز بجاتے ہاتھوں کے جھرمٹ میں لیٹے لیٹے اپنی سالگرہ کا کیک کاٹا تھا۔ وہ تالی بجاتے ہاتھ اس کے لیے دعا کی طرح تھے اور دعائیں کبھی خالی نہیں جاتیں۔

عنبرین اعجاز



بقول بنٹی چاچو "دل اگر بڑا ہو تو ہر جگہ گنجائش نکل آتی ہے۔" بالکل بنٹی چاچو کی "گاڑی" کی طرح۔

اگرچہ بنٹی چاچو کی گاڑی ان کی مختصر سی فیملی "دو بچے خوش حال گھرانہ" کے مصداق نہایت موزوں تھی لیکن جب بھی کہیں خوشی یا غمی کا موقع ہوتا اس چھوٹی سی گاڑی کو ٹرک میں بدلتے دیر نہیں لگتی تھی، بلکہ یوں کہیے کہ یہ گاڑی کم اور ویگن زیادہ تھی۔

"اماں جی! آپ ادھر آجائیں... منی! یہاں آجاؤ بیٹا! بہت جگہ ہے... خالہ جی کو بلائیں، جگہ نکل آئے گی خود بخود... بے بے! آپ فکر نہ کریں، بسم اللہ کریں۔"

ایسے ہی بے شمار حوصلہ افزا استقبالیہ جملے بنٹی چاچو کی شخصیت کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ بنٹی چاچو کا طرز فکر بھی مثبت تھا اور طرز عمل بھی۔ بچپن سے ہی ان کی ہر خواہش میں مجموعی فائدہ پوشیدہ ہوتا اور آج بھی وہ ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ تھے ہی ایسے، محبت کرنے والے، محبت دینے والے، محبت بانٹنے اور محبت پھیلانے والے، ہر چھوٹے بڑے کے لیے سراپا محبت۔

بنٹی چاچو کا بس ایک ہی شوق تھا، کار یعنی اپنی ذاتی سواری، چھٹی والے دن اگر کہیں آنا جانا نہیں ہوتا تو سارا وقت اپنی اس لاڈلی کے قدموں میں عقیدت کے پھول اور خدمت کے دیے جلاتے گزار دیتے۔

پانی کی کمی تھی، اہل خانہ بھلے نہ نہائیں، لیکن بنٹی چاچو نے اپنی چہیتی نازوں پلی کار کے لیے پرائیویٹ ٹینکر منگوا کر اسے نہلاتے۔ چھوٹی چچی بنٹی چاچو کی کار کو اپنی سوکن کہتی تھیں۔

نہ صرف پکنک یا سیر و تفریح کے لیے بلکہ ہر شادی بیاہ کی تقریب میں شرکت کے لیے، مریضوں کی تیمار داری کے لیے اسپتال جانا ہو، یا بچوں کو امتحانات کے دنوں میں ان کے بورڈ لے کر جانا ہو۔ مضافاتی علاقوں کے سپاٹے کرنے ہوں... حتیٰ کہ مہندی، مایوں کے رات گئے ختم ہونے والے فنکشنز سے واپسی کے لیے بھی بنٹی چاچو کی پُرخلوص آفر بشمول سروس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاتا۔

ہر جگہ، ہر وقت دل و جاں سے حاضر خدمت۔

بنٹی چاچو کی کار اگرچہ بیس سال پرانی ہو چکی تھی لیکن چاچو میں نیکیاں کمانے کا عزم تاحال جوان تھا۔ دراصل انہوں نے اپنے اس شوق کو بھی خدمت میں بدل دیا تھا، جو بلاشبہ ان کی وسعت قلبی کا نتیجہ تھا۔



یہ اس وقت کی بات ہے جب بنٹی چاچو نے نئی نئی کار خریدی تھی۔ اگرچہ جوائنٹ فیملی سسٹم نہ تھا، لیکن تمام خاندان نے مل کر پکنک کا پروگرام ترتیب دیا۔ تمام افراد ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ کاروں والے تو اپنی اپنی کاروں میں جھٹ سے سوار ہو لیے اور جو بے کار تھے، وہ لائن میں کھڑے تھے۔

بنٹی چاچو نے جو یہ صورت حال دیکھی تو فی الفور اپنی نیلی پری لیے حاضر ہوئے۔ اور حیرت کے ان مجسموں کو اپنی ننھی منی سی کار میں بھرنے لگے۔

جس کار میں پانچ افراد کی گنجائش تھی، اس میں پندرہ افراد زندہ سلامت سما گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بنٹی چاچو۔ فرنٹ سیٹ پر، منجھلے چاچو جو اپنے ویلاپے کے باعث خاندان بھر میں عمر چور مشہور ہیں، بیٹھ گئے۔ ان کے ایک گھٹنے پر ایک اور دوسرے گھٹنے پہ دوسرا بچہ بٹھا دیا گیا۔ ایک غذائی اجزا کی کمی کا شکار تین سالہ بچہ ان کے قدموں میں باآسانی بیٹھ گیا پچھلی نشست پہ پہلے تائی امی کو نہایت عزت کے ساتھ آرام دہ پوزیشن میں بٹھانے کی کوشش کی گئی کیونکہ وہ جوڑوں کے درد

کی مریضہ تھیں' پھر فارحہ کو ذرا آگے کر کے بٹھایا گیا' کچھ اس انداز میں کہ اس کے دونوں ہاتھ اگلی دونوں نشستوں کی پشت پر' ٹانگ پہ ٹانگ دھرے' کمر کو خم دیے' گردن کھڑکی کی سمت موڑے وہ کسی یونانی دوشیزہ کے مجسمے کی طرح لگ رہی تھی بالکل جامد و ساکت' مائیکل انجیلو کے کسی شاہکار کے وجود میں آنے کی بے تابی سے منتظر۔

پھر بجھلی چچی پیچھے کو ہو کے بیٹھ گئیں اور پھر نحیف و نزار بے بے جی آگے کو ہو کر آرام دہ پوزیشن میں بیٹھ گئیں۔ آرام دہ اس لیے کیونکہ ان کے پیچھے گول مٹول سی تین سالہ مریم کشن کا کام دے رہی تھی۔

ایک ایک بچہ دونوں طرف کے بزرگوں کی قدم بوسی کر رہا تھا۔ چار سالہ حمزہ فارحہ کے پیچھے یوگا کے انداز میں بیٹھا تھا' جبکہ پانچ سالہ گڑیا تائی امی کی ایک پسلی میں گھسی ہوئی تھی۔ تائی امی کی گود میں پانچ ماہ کا سمیع منہ میں چوسنی لیے اپنے معصوم خوابوں کی بے ضرر دنیا میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔

دیگر کاروں میں سوار افراد نے بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ کار پیچھے سے بیٹھ گئی ہے' اسپرنگ ڈھیلا ہو جائے گا' بمپر اسپیڈ بریکر پر زور سے بجے گا' ٹائر پھٹ جائیں گے' توازن برقرار نہ رہے گا' کار چڑھائی پہ نہیں چڑھے گی وغیرہ وغیرہ... مگر بنٹی چاچو کا توکل بھی قابل دید تھا۔ کہنے والے کہتے رہ گئے اور پھر دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے اور بنٹی چاچو کی کار نکل پڑی۔ رفتار اگرچہ تھوڑا کم تھی لیکن "دھلے دھلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ" منزل مقصود تک پہنچ ہی گئے۔

راستے میں بارش کی جھڑی لگ گئی' موسم خوش گوار ہو گیا اب اس برسات میں دل نادان خوامخواہ چائے کا ایک کپ مانگنے لگتا ہے۔ چنانچہ موبائل پہ ایس ایم ایس کے تبادلے ہونے لگے اور پھر چائے کے ایک ہوٹل کے قریب تینوں کاروں نے بریک لگائے۔ دیگر کاروں میں سوار افراد باآسانی اور جھٹ پٹ چھلانگیں مارتے ہوئے نکل آئے' لیکن بنٹی چاچو کی کار میں موجود سواریوں نے قدرے تشویش کا اظہار کیا۔ پہلے بھی نشست جمانے میں مشکل ہوئی تھی' سو دوبارہ یہ رسک نہ لیا جائے اور اپنی منزل پر ہی گاڑی سے نکلا جائے مگر بنٹی چاچو نے تمام خوف اور مشکلات کو یکسر مسترد کر دیا اور یقین دلایا کہ دوبارہ اسی انداز میں سب کو فٹ کر دیں گے' بچے لڑھک لڑھک کے باہر گرنے لگے' جیسے جامن یا بیر ٹپ ٹپ گرتے ہیں۔ راہ گیر اور کار پارکنگ میں موجود دیگر نفوس کے علاوہ ہوٹل کے اندر بیٹھے لوگ بھی کھڑکی سے باہر یہ نظارہ ملاحظہ کرتے ہوئے انگشت بدنداں تھے کہ ایک چھوٹی سی کار میں سے اتنے زیادہ لوگ کیسے نکلے چلے آرہے ہیں۔ بھری برسات کی طرح ایک کے بعد ایک فرد کی جھڑی سی لگ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بے بے یعنی دادی جان کی اکلوتی پوتی کی شادی خانہ آبادی تھی۔ شرکت بہرحال لازمی تھی کیونکہ وہی تھے جو گاؤں میں مقیم تھے اور سب کی زمینوں کی دیکھ بھال کے امور سنبھالے ہوئے تھے۔ سارے رشتے دار گھر بیٹھے باآسانی زمینوں سے حاصل شدہ آمدنی سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔

جون کا مہینہ اور سرتاپا پسینہ' دن بھر برستی آگ اور ساتھ ہی لوڈشیڈنگ کی سوغات' رات کو مچھروں کی فوج کی آمد اور بندہ بشر کی شامت گویا ایک جان اور ہزاروں امتحان۔

گزشتہ چار برس سے یہ شادی تعطل کا شکار تھی۔ بزرگوں کے باہمی صلاح مشورے سے یہی طے پایا کہ اب موسم یعنی گرمی کو بہانہ نہ ہی بنایا جائے اور جیسے تیسے ہمت کر کے یہ نیک فریضہ انجام دے دیا جائے۔ چار و ناچار ہر گھر سے ایک ایک نمائندہ اپنی حاضری لگوانے جا پہنچا۔ شہری کزنز میں سے اگر کوئی دل سے خوشی خوشی شرکت کر رہا تھا تو وہ تھی فارحہ... فارحہ کو بچپن سے ہی گاؤں کی تقریبات دیکھنے کا بے حد شوق تھا' وجہ خاص تھی مہندی' شیشوں والا پراندہ' رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں اور موتی ستاروں والے لہنگے۔

بزرگوں یعنی تائیوں' چاچیوں' پھوپھیوں وغیرہ میں تو گاؤں کی گرمی کو جھیلنے کی قوت برداشت نہ تھی' سو انہوں نے بھی اپنے نمائندے بھیجنے پر ہی اکتفا کیا تھا صرف بنٹی چاچو تھے جو بذات خود اس تقریب نیک سعید کو رونق بخشنے تشریف لائے تھے۔

صد شکر کہ تمام رسمیں بخیر و خوبی انجام پائیں۔ مکلاوے کی رات تمام خواتین اندر والے صحن میں بچھی چارپائیوں پر گرمی اور تھکن سے نڈھال سو رہی تھیں۔ ایک فارحہ تھی جو مچھروں کی بٹالین کے ساتھ جنگ و جدل میں مصروف تھی۔ یہاں بہت سے لوگ کونین کی گولیاں وافر مقدار میں پھانک رہے تھے۔

تب ہی فارحہ کو شدید پیاس محسوس ہوئی۔ وہ کسلمندی سے اٹھی اور ڈیوڑھی سے گزر کے باورچی خانے کی سمت جانے لگی۔ وہاں سے دائیں طرف جو راستہ نکلتا تھا وہاں ایک کمرے سے زرد روشنی برآمد ہو رہی تھی۔ لالٹین سے نکلنے والی یہ روشنی نہایت کم تھی۔

یہ لڑکوں کا کمرا تھا۔ انہوں نے مچھروں سے اندھی جنگ لڑنے کے بجائے مل بیٹھ کے گیم کھیلنے کو ترجیح دی تھی۔ فارحہ آگے بڑھنے لگی۔ لیکن اچانک بنٹی چاچو کا نام سنتے ہی اس کے قدم رک گئے۔ قہقہوں کی آوازیں اور دبی دبی ہنسی اور پھر بنٹی چاچو کی کار سروسز کے حوالے سے لطیفے' ہنسی مذاق' ذو معنی جملے' بے ادب' فقرے اور گستاخانہ انداز گفتگو۔

دکھ کی ایک لہر دل میں اتر گئی۔ یہ اس کے وہ کزنز تھے' جو کل تک دوسروں کے ہاتھوں کی طرف دیکھتے تھے۔ احساس کمتری کا شکار تھے۔ آج پڑھ لکھ کر اعلا عہدوں پر فائز ہو گئے ہیں تو نعمتوں کے حصول کے فوراً" بعد اتنی جلدی احساس برتری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بنٹی چاچو کی کار کو کھٹارہ' ماچس کی ڈبیا' ٹوتھ پیسٹ' یان وان' جیومیٹری باکس اور نہ جانے کیا' کیا کہہ کر تمسخر اڑا رہے تھے۔ ان کی محبت' خلوص' عزت و اپنائیت کو "رش کار سروسز" کہہ کے تبصرہ فرما رہے تھے۔

ان کے نزدیک اجتماعی مفاد کم عقلی کی علامت اور سادگی بے وقوفی کے مترادف تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ تعلیم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔

اگرچہ فارحہ کے لیے مزید ٹھہرنا دشوار ہو گیا تھا' لیکن معاً" اسے کسی سائے کے گزرنے کا احساس ہوا فارحہ کو وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔

باورچی خانے کے لال اینٹوں والے فرش پہ رنگین پیڑھی پہ بیٹھی مٹی کے مٹکے سے پانی پیتے ہوئے فارحہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ایک ایک گھونٹ بمشکل تمام حلق سے نیچے اتر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا سارا دکھ گلے میں ہی پھنس گیا ہو۔ مٹی کا پیالا مٹکے پہ الٹا دھر کے ابھی رکھا ہی تھا کہ کسی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا' وہ گھبرا کر یکلخت پلٹی تو دیکھا کہ بنٹی چاچو سر پر نماز والی ٹوپی پہنے اس کی طرف دیکھتے ہوئے شفقت سے مسکرا رہے تھے۔

وہ حسب معمول تہجد کی نماز کے لیے بیدار ہوئے تھے۔ اور ابھی شہر کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ فجر کی نماز راستے میں جی ٹی روڈ پہ کسی مسجد میں ادا کرنے کا ارادہ تھا اور وجہ یہ بتا رہے تھے کہ بیگم اور بچوں سے وعدہ کیا تھا کہ اتوار کو بارہ بجے سے پہلے پہلے گھر واپس پہنچ جاؤں گا۔

"بتاؤ فارحہ! میرے ساتھ واپس چلنا ہے یا نہیں؟ بھائی جان اور بھابھی کو میسج کر دو کہ تم میرے ساتھ آرہی ہو۔ میں اپنی بھتیجی کو گوجرانوالہ سے چنے پٹھورے کا ناشتا کراؤں گا۔"

بنٹی چاچو کی پرخلوص آفر سنتے ہی فارحہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا اپنا دل یہاں ایک لمحہ رکنے کو نہیں چاہ رہا تھا' فضا میں گھٹن کا احساس بڑھ گیا تھا۔

"لے بھئی فری! آج میری کار میں صرف دو سواریاں ہیں' ایک چاچا' دوسری بھتیجی۔" یہ کہہ کے

بنٹی چاچو سفر کی دعائیں پڑھنے لگے۔

فارحہ نے کن اکھیوں سے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے اپنے چھوٹے چاچو کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں کی لڑیاں ان کی آنکھوں سے بہتی ہوئی ان کی ڈاڑھی کو بھگو رہی تھیں۔ فارحہ دانستہ" خاموش رہی۔ اس کا اپنا دل رو رہا تھا۔

اندر باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر کار دھیمی رفتار سے رواں ہوئی اور "جھولا جھلاؤری" کا آغاز ہو گیا۔

مسجد کے منبر سے اذان کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ دل پہ جو بوجھ تھا' وہ ہلکا ہونے لگا اور روح سرشار ہو گئی تھی۔



خواتین کے لیے مسجد کی بالائی منزل پر الگ سے نماز پڑھنے کا انتظام موجود تھا۔ فجر کی نماز کی ادائی کے بعد فارحہ سیڑھیاں اترتی نیچے آگئی۔ دائیں جانب بنی ایک برائے نام کوٹھری میں ایک بارہ سالہ بچہ طاقچے کے قریب کھڑا ماچس کی ڈبیا رگڑ رہا تھا۔ ننھا سا شعلہ سارے گرد و پیش کو روشن کر گیا۔ لڑکے نے ایک انتہائی خوب صورت' نازک سا لیکن پرانی طرز کا دیسی کانچ کا شربتی رنگ کا لیمپ آگے کر دیا یہ لیمپ مٹی کے تیل یا اسپرٹ سے بھی جلتا تھا۔

فارحہ نے اتنا خوب صورت لیمپ آج سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اسے یہ کوئی ڈیزائنو لیمپ معلوم ہو رہا تھا۔ کسی منی ایچر پینٹنگ کی طرح جاذب نظر' جتنا سادہ اتنا ہی دلکش' سارا کمرا گویا نور سے بھر گیا تھا۔ فارحہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔

فارحہ کے استفسار پر لڑکے نے بتایا کہ یہ لیمپ اس کے بابا کو ان کے بڑے صاحب نے بطور تحفہ مسجد کے لیے دیا تھا۔ بڑے صاحب کو یہ لیمپ ان کے والدین نے دیا تھا۔ جب بابا نے کہا کہ مسجد میں رکھنے کے لیے ایسا ہی ایک لیمپ انہیں بھی منگوا دیں' وہ قیمت ادا کر دیں گے تو بڑے صاحب نے مسجد کا سنتے ہی یہ لیمپ اپنی میز سے اٹھا کے بابا کے حوالے کر دیا۔

"باجی! جو بھی مسافر یہاں نماز پڑھنے آتا ہے' ہم اسے یہ لیمپ جلا کر ضرور دکھاتے ہیں۔ کیونکہ اسے دیکھ کے مسافر کے چہرے پہ خوشی دوڑ جاتی ہے۔ یہ بھی تو صدقہ جاریہ ہے نا' اس کا اجر و ثواب بڑے صاحب کے والدین کو بھی ہو گا اور بڑے صاحب کو بھی۔"

بارہ سالہ معصوم بچے کی یہ بات سنتے ہی فارحہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ بہت عقیدت و احترام کے ساتھ یہ لیمپ دیکھنے لگی۔

اسے یہ لیمپ بالکل اپنے بنٹی چاچو اور ان کی کار کی طرح لگ رہا تھا۔ چھوٹا سا' سادہ سا' پرانی وضع اور پرانے ماڈل کا۔۔۔ لیکن اندر سے بھی روشن اور باہر سے بھی۔ سب کے لیے روشنیاں بکھرنے والا' منبع نور اور قندیل محبت۔۔۔۔

سمیرا حمید



زندگی اس وقت حقیقی سانحے اور دکھ سے آشنا ہوتی ہے جب دو انمول نعمتوں ماں اور باپ میں سے کوئی ایک نعمت چھن جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی قلم اس دکھ کو نہیں لکھ سکتا اور دنیا کا کوئی فلسفہ اسے کم نہیں کر سکتا۔

زینب عبدالکلام کے ساتھ آٹھ ماہ پہلے.....

وہ بس میں بیٹھی تو لاتعلق اور عجیب نظروں سے آس پاس دیکھا۔ اس کا خیال تھا باہر کی دنیا میں بھی سب کچھ تباہ ہو چکا ہوگا۔ لیکن باہر زندگی رواں دواں تھی ..... دنیا حاصل اور لاحاصل کے آگے پیچھے سرگرداں تھی۔ وہ بس سے اتری تو کچھ نفرت سی لیے سڑک کو گھور رہی تھی۔ سڑک پر ابھی انتشار نہیں تھا..... رات اس نے سوچا تھا کہ وہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے آفس جائے گی۔ اسے تیز چلنا تھا اور وہ سست روی سے قدم اٹھا رہی تھی۔ اسے جلدی آفس جانا تھا اور وہ دیر کیے جا رہی تھی۔

جاب کرتے اسے چار ماہ ہو چکے تھے۔ آٹھ ماہ پہلے اس نے کالج چھوڑ دیا تھا۔ ہنسنا بھی..... اور بھی بہت کچھ.....

وہ کیبن میں آئی اور کمپیوٹر آن کیا۔

چند جاننے والوں کی دوڑ دھوپ سے اسے یہ جاب ملی تھی۔ ڈیٹا انٹری کی۔ ایک طرف رکھی فائل اٹھائی۔ اس کا کل کا کام تھا جو اسے آج کا کام ملنے سے پہلے پہلے ہر صورت کرنا تھا۔ اس نے ایک فائل کھول کر اس پر

ناولٹ





پیپرویٹ رکھا اور.....

ٹھیک آٹھ ماہ پہلے جناب عبدالکلام صاحب موٹر سائیکل کے ایکسیڈنٹ میں سڑک پر ہی دم توڑ گئے..... جی ٹی روڈ کی اندھی ٹریفک میں ان پر ہیوی ٹرالر چڑھ گیا..... ان کی آنتیں سڑک پر پھیل گئیں..... زینب کے بابا خون سمیت سڑک پر بکھر گئے..... ہاتھ کہاں، پیر کہاں..... کتنا سمیٹا لوگوں نے۔

زینب کو فائل پر لکھے الفاظ نظر نہیں آرہے تھے۔

اسے ہر روز صبح صبح سب یاد آنے لگتا اور الفاظ گڑبڑا جاتے۔ اسے ان پر انگلی رکھ کر یاد کرنا پڑتا کہ یہ کون سا لفظ ہے..... جن جن دوست احباب نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا تھا، وہ وہ کئی راتوں تک سو نہیں سکے تھے تو زینب کو نیند کیسے آجاتی اور پھر نیند سے کیونکر جاگنا چاہتی۔

آفس میں آمد و رفت ہونے لگی۔

آپا کی شادی طے تھی۔ بابا نے صرف ایک بیٹی کی شادی ہی کی تھی اور چند مہینوں بعد وہ.....

وہی اسے کالج چھوڑتے تھے..... وہ نہ رہے تو اس نے کالج ہی چھوڑ دیا..... کیسے نہ چھوڑتی..... اتنے لائق بابا کی بے انتہا نالائق بیٹی نے ایک ہی کام وقت پر اور ڈھنگ سے کیا۔

دو گھنٹوں میں اس نے چند لائنیں ہی ٹائپ کی۔ اف اس کی نالائقی..... ویسے اس کی رفتار اچھی تھی لیکن دن کے آغاز پر دماغ کی رفتار تیز ہو جاتی اور انگلیاں ساکت ہو جاتیں۔

وہ ایک لائن ٹائپ کرتی اور کئی لمحے ٹکٹکی باندھے غور سے پڑھتی رہتی..... پڑھتی رہتی..... جلدی پڑھا ہی نہ جاتا..... الفاظ پہچان میں ہی نہ آتے، سر جبار کا کہنا تھا کہ وہ بہت غلطیاں کرتی ہے۔ وہ ہر بار سوچتی اب غلطی نہیں کرے گی اور ٹکٹکی باندھے اپنے ٹائپ کیے الفاظ کو دیکھتی رہتی کہ اپنی غلطیاں پکڑ لے۔ پھر بھی غلطیاں سر جبار ہی پکڑتے..... دو اور فائلیں اس کی ٹیبل پر آچکی تھیں۔ اس نے جلدی جلدی انگلیاں چلانی شروع کیں۔

اس کی سہیلیاں پوچھتیں وہ کالج کیوں نہیں آتی۔

"صبر کرو..... اور کالج آؤ۔"

اس نے صبر کر لیا اور آفس آگئی۔

دونوں ماموں اپنے اپنے خاندان والے تھے اچھے تھے چند ہزار ہر ماہ دے جاتے تھے۔ حالات ایک دم سے بدل گئے۔ رات وہ اپنی ڈائری میں فیض کی چند غزلیں لکھ کر سوئی تھی اور چپکے سے بابا کو اکیلے دیکھ کر بتا دیا تھا کہ جیسے بھی ہو اسے الحمرا میں ہونے والے چھوٹے سے کنسرٹ کا پاس اور نیا سوٹ لا دیں..... بابا نے اسے گھور کر دیکھا اور کہا کہ وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوششیں کرے ورنہ جاگتے میں ان کا تھپڑ اسے زیادہ تکلیف دے گا۔

اس نے دونوں آنکھیں بند کر لیں اور کہا۔

"ماریں، ماریں..... پھر مت کہیے گا میں آپ کی بیٹی ہوں..... آپ کا بھالو ہوں، آپ کی شکرقندی ہوں۔ بنا بادام والی کھیر ہوں۔ عید کا چاند ہوں..... نکاح کا چھوہارا ہوں۔ تلوں والا نان ہوں تمہاری ہوں۔"

انہوں نے سر پکڑ لیا۔ "کھیر اب مجھے کھانی نہیں اور عرصہ ہوا نکاح کے چھوہارے بھی نہیں ملے۔"

"پھر کیوں آجاتے ہیں چھٹی والے دن..... لے زینب! یہ سر تیرا ہوا جیسے مرضی تیل ڈال..... پھر نہیں کہتے سو جاؤ، آنکھیں بند کر لو۔"

"اب کے آؤں تو یاد سے یاد کروا دینا۔"

"زینب! آپ ٹھیک ہیں؟" سر جبار اس کے کیبن میں کھڑے تھے۔ اس نے سر اٹھایا تو دیکھا دو چار اور اس کے کیبن میں جھانک رہے تھے۔ نجانے کیا تماشا ہوا تھا۔

"یہ فائل دینے آیا تھا۔ اس کا کام پہلے کر دیں، پھر یہ فائل دے دیجیے گا۔" انہوں نے نرمی سے کہا اور جاتے جاتے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"جی ضرور۔" اس نے فائل کھولی مگر.....

"ضرور..... ضرور، میں ضرور یاد کروا دوں گی جب آپ آئیں گے، ہائے میرا سر زینب! کچھ کرو اس کا۔ ہائے میرا بچہ زینب!"

سڑک پر پاش پاش ہونے سے پہلے انہوں نے سوچا ہو گا۔

"میرا بچہ زینب....."

وہ جو چند لاکھ کا قرض لیا تھا وہ جان کو آگیا تھا۔ کمپنی دیوالیہ ہو رہی تھی اور اسے ہر ور کر کو دیا گیا قرض جلد از جلد واپس چاہیے تھا، کمپنی کی طرف سے دیے گئے رعایتی چھ ماہ کب کے ختم ہو چکے تھے۔

فائلیں اٹھا کر وہ کیبن سے باہر نکلی۔ اسے سر جبار کے آفس تک جانا تھا۔ وہ دو ایک بار ان کے آفس جا چکی تھی۔ دو مسئلے تھے۔ ایک تو آفس بہت بڑا تھا دوسرا زینب کا دماغ بہت چھوٹا ہو چکا تھا۔ وہ ایک ہی کمرے میں دو بار گھستی اور کہتی کہ وہ دو الگ الگ کمرے دیکھ کر آچکی ہے۔ اس کا جوتا نہیں مل رہا کیونکہ وہ وہی جوتا ڈھونڈ رہی ہوتی جو اس نے پہنا ہوتا، فی الحال دماغ اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

وہ ایک بار ادھر ادھر گھوم کر دیکھ چکی تھی۔ وہ ہر بار ہی کسی نہ کسی سے آفس کا پوچھتی تھی اور اب یہ اس سے متعلق لطیفہ بن چکا تھا۔ اس کے کولیگ اکثر مذاقاً" آفس ٹائم ختم ہونے پر اس کے کیبن کے پاس آتے اور بیرونی دروازے کی طرف اشارہ کر کے بتاتے کہ وہ ہے باہر جانے کا راستہ اور اسے وہاں سے جانا ہے۔

کمپنی کے مالک یورپین تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل تھے اس لیے آفس میں چپڑاسی نام کی چیز نہیں تھی سب کو اپنے کام خود ہی کرنے ہوتے تھے۔

اسے یاد آیا کہ سر جبار کا آفس فرسٹ فلور پر ہے۔ بہت اچھے تھے سر جبار..... ہمیشہ خود ہی اس کے پاس آتے تھے فائلیں لینے اور دینے، آج اس نے سوچا خود ہی دے آئے۔

وہ لفٹ سے باہر نکلی تو فرسٹ فلور بالکل خالی تھا۔ نظر آنے والے پہلے آفس کے دروازے پر دستک دی اجازت ملنے پر اس نے دروازہ کھولا۔

"سوری..... میں سمجھی، سر جبار کا آفس ہے۔" وہ لوگوں کے اپنی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر وہ پریشان ہو گئی۔

"کس ڈپارٹمنٹ کی بات کر رہی ہیں؟"

"ڈیٹا سیونگ ڈپارٹمنٹ سے....."

"کیا.....؟" ایک نے کرسی اور گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"بابا! میں رو دوں گی۔"

"رو رو..... رونا اچھا ہوتا ہے۔"

وہ کھڑی رہی روئی نہیں۔

"آپ کو اپنے ہی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کا آفس نہیں معلوم..... کتنا وقت ہو گیا ہے آپ کو جاب کرتے ہوئے..... بلکہ دراصل مجھے یہ پوچھنا چاہیے کہ آپ

جیسے ورکرز کب تک اس کمپنی کو دیوالیہ کردیں گے۔"

"مجھے..."

"بابا میں رو دوں گی۔" اسے یاد ہی نہیں آیا وہ بھاگتی ہوئی لفٹ سے نیچے آئی اور کیبن میں بیٹھ کر اپنے گھومتے سر کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ چند منٹوں بعد سر جبار اس کے کیبن میں تھے۔ وہ اسے دیر تک تاسف سے دیکھتے رہے۔

"انہوں نے سختی سے تاکید کی ہے کہ میں ایسے ورکرز کو فوراً" سے پہلے فارغ کردوں جنہیں یہی معلوم نہیں ہے کہ اس کے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کا آفس کہاں ہے۔ ایسے لوگ کیا کام کریں گے۔"

"میں معافی چاہتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"زینب! اس پورے آفس میں صرف تم ہی ہو' جس کا سب سے آسان کام ہے..... آدھے سے زیادہ تمہارا کام میں کرتا ہوں اور پھر بھی تم دھیان سے کام نہیں کرتیں۔"

"اس سارے آفس میں صرف اسی کا باپ سڑک پر لمحہ بھر میں بکھر کر مر گیا تھا۔"

"حتیٰ کہ صفائی کا عملہ بھی تم سے زیادہ توجہ سے کام کرتا ہے۔ میں تمہیں کور کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔ چند ماہ میں ہی تم نے مجھے تھکا دیا ہے۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں۔"

"بار بار شرمندہ ہونے سے بہتر ہے کہ تم محنت سے کام کرو۔"

"میں اب دھیان سے کام کروں گی..... آج آفس سے کام کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

☼ ☼ ☼

"اگر تم اس سے ایک اور سوال کرلیتے تو وہ یہیں رونا شروع کردیتی..... میں ہوتا تو ضرور اگلا سوال کرتا۔"

یہ بات کہنے والا ریان تھا اور سوال پوچھنے والا عاسل جو بڑی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کمپنی کے چھ مالکوں میں سے ایک.....

عاسل نے جیسے سنا ہی نہیں۔ آج کل وہ بہت غصے میں رہتا تھا۔ کالج سے یونیورسٹی تک ایک لڑکی فارحہ اس کے ساتھ رہی۔ دونوں نے چپکے سے دریائے ٹیمز کے کنارے منگنی بھی کرلی۔ دوستوں کو پارٹی بھی دے دی۔ ہنستے کھیلتے دن گزرنے لگے۔ ایک اور لڑکے کا فارحہ کی طرف جھکاؤ تھا' جب کبھی بلکہ اکثر ہی عاسل وقت پر ڈنر' لنچ یا کسی پارٹی میں نہیں پہنچ پاتا تو فارحہ غصے میں اسی لڑکے مارشل کے ساتھ چلی جاتی.....

ایک بار عاسل نے نیو ایر کی سیلیبریشن مس کردی..... فارحہ انتظام کیے بیٹھی تھی۔ اتفاق سے ٹھیک اسی دن اس کی فیملی کے سب ہی لوگ خاص اسے سرپرائز دینے کے لیے اس کے گھر اکٹھے ہوگئے۔ وہ بری طرح پھنس گیا اور فارحہ کو سمجھانا چاہا..... لیکن اس نے اپنے جنونی غصے کے ہاتھوں عجیب ہی کام کیا۔ اس نے اگلے ہی دن مارشل سے رجسٹرڈ میرج کرلی.....

اس کی فیملی فارحہ کو جانتی تھی لیکن تعلق کی گہرائی جاننے کے لیے اسے وقت چاہیے تھا۔ لیکن بات بری طرح سے بگڑ گئی۔ فارحہ نے عاسل کو سزا دینے کے لیے باقاعدہ مارشل کے ساتھ رہنا شروع کردیا۔ پہلے عاسل کو لگا' وہ صرف مذاق کررہی ہے اس کے دوستوں نے بتایا کہ اس رات وہ ہوٹل کو آگ لگا دینے کے درپے تھی۔

اپنی آخری ملاقات میں فارحہ نے عاسل کو ہر وہ ڈنر' لنچ' پارٹی' پکنک' ایونٹ گنوایا جس پر وہ کبھی وقت پر یا سرے سے آیا ہی نہیں تھا۔ اس نے اتنے سالوں کے وہ دن بھی گنوائے جن میں اس نے کبھی خود سے فون نہیں کیا تھا..... وہ کہاں ہے۔ کیسی ہے' تک نہیں پوچھا تھا۔

اس کے پاس شکایات کے نام پر بہت کچھ تھا اور عاسل کے پاس اسے بتانے کے لیے صرف محبت ہی تھی جس پر اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ چاہے زمین ہی کیوں نہ پھٹ پڑتی۔ اسے ہر صورت اس کے پاس آنا چاہیے تھا۔

غلطی عاسل کی تھی اس نے مان لیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنی فیملی کو بتا دیتا اور نہیں تو جا کر اسے ہوٹل سے لے آتا۔

جو ہوا' بہت برا ہوا اس کے ساتھ۔ وہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس پاکستان آگیا۔ چند سال گزرے اسے معلوم ہوتا رہا کہ فارحہ جو غلطی کر بیٹھی ہے اسے بری طرح نبھا رہی ہے۔ ایک بار ماں بنتے بنتے رہ گئی۔ مارشل اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ ایک اچھا انسان تھا اور وہ اچھا انسان فارحہ کے جنونی غصے اور دوروں سے جو اسے عاسل کے نام پر پڑتے تھے' تنگ آگیا تھا۔ اور اسی ڈپریشن نے مارشل کی جان لے لی۔ مارشل کے گھر والوں نے فارحہ پر قتل کا الزام لگا کر مقدمہ کردیا۔

عاسل پہلی فرصت میں فارحہ کے پاس موجود تھا۔ دونوں میں موجود محبت پھوٹ کر باہر آنکلی۔ فارحہ نے اپنی انا اور غصے کو سلا دیا۔ عاسل سب کچھ بھول گیا۔ اب وہ اسے اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا لیکن مقدمے کی وجہ سے فارحہ ملک نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ کورٹ کی ایک سماعت کے دوران جب عاسل کا نام بھی لیا گیا تو عاسل کو واپس آنا پڑا۔

یہ آدھی کہانی ہے۔

اس کہانی کا دوسرا اور اہم حصہ مام جی ہیں۔ یہ عاسل کے ڈیڈ ارسلان احمد کی پہلی بیوی ہیں' جنہوں نے اپنے شوہر کی دوسری بیوی سے اولاد کو اپنی اولاد سمجھا۔ انہیں جگر کا سرطان ہوچکا ہے اور دنیا کے ہر بڑے ڈاکٹر کے مطابق ان کے پاس صرف چند ماہ ہیں۔ وہ ساٹھ سالہ مام جی ہیں۔ شادی کے بارہ سال بعد تک جب وہ بے اولاد ہی رہیں تو انہوں نے اپنے شوہر کو بخوشی شادی کی اجازت دے دی بلکہ ان کی شادی میں پیش پیش رہیں۔ اس گھر میں ان کا وہ مقام ہے' جو ارسلان احمد کا اپنا بھی نہیں۔ یہ مقام رعب یا بڑائی کا نہیں بلکہ محبت کا ہے۔ ان کی بے تحاشا محبت اور اپنائیت کے آگے سب بے بس ہوجاتے ہیں۔ ان سب میں عاسل بھی شامل ہے۔ یہی مام جی عاسل کو سرپرائز دینے کے لیے نئے سال پر باقی سب کو ساتھ لے کر اس کے پاس پہنچی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ حکم یا محبت جتا کر سختی کرتی تھیں۔ وہ بے حد پیاری بھولی بھالی' بس پیار کرنے والی تھیں۔ کمپنی کی ایک مالک وہ بھی تھیں۔ بیماری کی ایسی نوعیت ظاہر ہوتے پر انہوں نے فوراً" اپنی ملکیت عاسل اور دونوں دوسرے بچوں کے نام کردی۔

عاسل سے چھوٹی ثمو کی شادی کروادی۔ شادی عاسل کی بھی ہونا تھی لیکن عاسل نے کچھ وقت مانگ لیا..... این سی اے کالج میں پہلے سال کی ثمو نے مام جی کے فوری کہنے پر جھٹ شادی کروالی۔ شادی ثمو کی پسند سے ہی ہوئی تھی بس ذرا وقت سے پہلے اور جلدی میں ہوئی تھی۔

عاسل سے بھی کہا گیا کہ "اپنی پسند بتا دو" مگر اس کی پسند تو کورٹ کے چکر کاٹ رہی تھی۔ ارسلان احمد زیادہ دکھی تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ مام جی کم از کم ارسل کی خوشی تو دیکھ جائیں۔ فارحہ نہ ہوتی تو وہ اگلے ہی دن مام جی کی پسند کی کسی بھی لڑکی سے شادی کرلیتا۔

سب دوست اسے طرح طرح کے مشورے دیتے..... فارحہ کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کب کورٹ سے فارغ ہوسکے گی۔ اگر وہ عاسل سے شادی کرلیتی تو اس پر وکیل استغاثہ کا الزام ثابت ہوجاتا کہ اس نے اپنے سابقہ دوست کے ساتھ مل کر مارشل کو مارا ہے۔ اسے ذہنی اذیت دی۔ اسے ذہنی مریض بنا دیا۔ اسے صدمے دے دے کر مار دیا۔

مام جی روز اس کی طرف دیکھتیں' منہ سے کچھ نہیں کہتی تھیں لیکن سب جانتے تھے۔ انہیں کیا چاہیے۔ عاسل کی بیوی.....

سب جاننے سے قاصر تھے کہ وہ اتنی دیر کیوں کررہا ہے۔ اپنی پسند بتا نہیں رہا ان کی پسند سے کر نہیں رہا۔ گھر کا ماحول ویسے ہی سوگوار تھا۔ اس کے لیے بھی دبا دبا غصہ تھا سب کے اندر۔

سب سے چھوٹا اسد صرف سولہ سال کا تھا' ورنہ شاید اس کی شادی کردی جاتی۔ ویسے مام جی نے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی منگنی کرکے جائیں گی..... اور اسد برا سا منہ کھول کر کہتا "کیوں نہیں' کیوں نہیں۔"

ایک وہی "ہاں" کہنے میں سب سے پیچھے تھا۔
ریان اسے کہہ رہا تھا کہ وہ مام جی کی بتائی کسی بھی لڑکی سے شادی کرلے۔ بعد میں اسے طلاق دے کر فارحہ سے شادی کرلے ورنہ فارحہ سے دوسری شادی کرلے۔۔۔ اس کے ڈیڈ نے بھی تو دو کی تھیں۔
گھر آیا تو مام جی شمو کی بتائی ایک فیملی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پہلی بار وہ فارحہ کے شادی کرنے پر رویا تھا۔ آج اپنی شادی ہونے پر رونے والا تھا۔ فارحہ سے متعلق کہانی اتنی الجھی ہوئی تھی کہ وہ مام جی کو کیا بتاتا، وہ انتظار کرسکتا تھا لیکن مام جی۔۔۔
گاڑی نکال کر وہ شہر سے باہر آگیا۔ پکی سڑک سے کچی سڑک اور پھر دور اندر میدان میں گاڑی کھڑی کر کے وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔
فارحہ نے اس کا یقین نہیں کیا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اسے واقعی ہر بار اس کی سالگرہ بھول جاتی، ڈنر کے لیے کہہ کر بھول جاتا، اسے اپنی تعلیم کی بھی فکر تھی۔ یونیورسٹی کی دوسری لڑکیوں کی بھی فکر تھی۔ کبھی کبھی وہ نظر بچا کر ایک آدھ کو ڈیٹ پر لے جاتا۔
کئی بار فارحہ نے اسے پکڑا۔۔۔ ہر بار اسے معاف کیا۔ اسے یہ سب مذاق لگتا تھا وعدہ کیا اور بھول گئے۔ تھرل لگتا۔ اسی تھرل کی وجہ سے اسے سزا دینے کے لیے فارحہ نے شادی کرلی تو اسے معلوم ہو گیا کہ تھرل سانحہ کیسے بنتا ہے۔ نظر بچا کر ڈیٹ پر جانے والے عاسل کو بہت بڑا دھچکا لگا۔ تب اسے معلوم ہوا اپنی محبت۔
کسی دوسرے کے ساتھ بانٹ لینا کیسا دل دہلا دینے والا ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ وہ مارشل کے ساتھ ہے۔۔۔ شاید اس کی بانہوں میں۔۔۔ یا اس کے ایک کندھے پر سر ٹکائے۔۔۔ یا۔۔۔
ایک دوست نے اسے جلانے کے لیے فارحہ کے ہنی مون کی تصویریں اسے بھیج دیں۔ اس نے دیکھ بھی لیں۔۔۔ اور اسی دن اس کا جی چاہا کہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دے اور آٹھویں منزل سے زمین پر مردہ پایا جائے۔
جس یونیورسٹی میں وہ ہاٹ بوائے بنا پھرتا تھا۔ اسی یونیورسٹی نے اسے ماڈرن جوگی کے روپ میں دیکھا۔
"جس دن تم میرے ساتھ بیٹھ کر کافی پیو گے اور کافی کے مگ میں کافی اور کافی پینے والے کے دماغ میں صرف میں ہوں گی اس دن تمہیں معلوم ہو جائے گا ساتھ ساتھ بیٹھنے کا حقیقی مطلب کیا ہوتا ہے۔"
اس نے کار کے چاروں دروازے کھول دیے اور تیز میوزک لگا دیا۔
"لڑکیاں تمہیں دیکھتی ہیں مجھے برا نہیں لگتا جب تم ان کے دیکھنے کا نوٹس لیتے ہو تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ ہوتے ہوئے تمہیں آس پاس کا ہوش ہی کیسے رہتا ہے۔"
اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ سورج غروب ہو چکا ہے۔
"ہر چیز کا پیمانہ ہے تو محبت کا کیوں نہیں۔۔۔ میرے ساتھ تو یہ زیادتی ہوئی نا۔۔۔ مجھے عاسل کی محبت پیمانے پر پرکھنی تھی۔" محبت پرکھی گئی اور دونوں الگ ہوگئے۔
ریان فون کر رہا تھا۔۔۔ اس نے فون بجنے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد مام جی کا فون آگیا۔ شاید وہ اسے بتانا چاہتی ہوں گی کہ لڑکی کتنی پیاری ہے اور انہیں کس قدر پسند آگئی ہے۔ کتنا پیار کرتی ہیں وہ اس سے۔۔۔ وہ بہت نکما انسان تھا۔ محبت لیے ہی جاتا تھا، دیتا نہیں تھا۔ اس نے مام جی کو آنے کا کہہ کر فارحہ کو فون کیا۔
"تم نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا۔ کیوں؟" وہ چلایا۔
دوسری طرف گہرے سانس کے ساتھ خاموشی ہی رہی۔ شاید اس کا بھی یہی سوال تھا۔
"تم نے ڈھنگ سے محبت کیوں نہ کی؟"
"تمہاری جلد بازی مجھے لے ڈوبی۔"
آنکھیں صاف کر کے وہ واپسی کے لیے چل پڑا۔

☆ ☆ ☆

زینب عبدالکلام ایک گھنٹے سے کرسی پر بیٹھی

تھی۔
"کپڑے تو تبدیل کرو۔"
اماں کہہ کر چلی گئیں۔ وہ اٹھی اور واپس آکر ویسے ہی بیٹھ گئی۔ سامنے کے کمرے میں میوزک سی ڈیز لائن در لائن ایسے ہی رکھی تھیں۔ اسی طرح ناول رکھے تھے اور ایک طرف ڈائری رکھی تھی جسے اس نے آٹھ ماہ سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔
گئے ساغر کے دن
جل گئیں ساری دھنیں۔
دوسری طرف کے کمرے میں دانش اور فرقان بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ ٹی وی کا ریموٹ ٹی وی کے اوپر رکھا تھا جس پر ہر رات اتنی لڑائی ہوتی تھی کہ لگتا آج تو ضرور ایک آدھ مرے گا۔ سو وہ اب بند ٹی وی کے اوپر رکھا رہتا تھا۔ اب کسی ڈرامے کی قسط نہیں نکلی جارہی تھی، نہ ہی فلاں سین کے نکلنے پر اس کی جان نکل رہی تھی۔
دانش نے فرقان کو کہنی ماری۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ایک اٹھا اور ٹی وی آن کر دیا اور پاس ہی بیٹھ گیا۔
وہ چونکی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دو منٹ بعد ٹی وی پھر بند ہو گیا۔
"کمپنی کا آدمی ابھی ہو کر گیا ہے۔" اماں نے بتایا تھا۔
کپڑے استری کر چکی تو دیکھا استری ٹھنڈی ہے۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔
جس وقت وہ آفس میں آئی۔ صفائی ہو رہی تھی۔ عملے نے اسے حیرت سے دیکھا۔ آتے ہی اس نے تیزی سے کام شروع کر دیا۔
کمپنی کے آدمی نے کہا کہ گھر کمپنی کو بیچ دیں۔ کمپنی اپنا قرضہ لے کر باقی انہیں دے دے گی۔ گھر۔۔۔ اس کے بابا کا گھر۔۔۔ بابا کا خاندان کہاں جائے گا؟
اس نے ڈیڑھ ماہ پیشتر سر جبار کو درخواست دی تھی قرضے کی۔ انہوں نے فوراً انکار کر دیا تھا۔ ایک تو وہ نئی تھی، دوسرے اسے بہت کوشش پر ہزاروں کا قرض تو مل سکتا تھا لاکھوں کا نہیں اور پھر کوئی بھی اس کے کام سے خوش نہیں تھا۔ اسے کسی بھی وقت نکالا جا سکتا تھا۔
اس نے سوچا آج وہ سر جبار کو اپنے کام سے خوش کر دے گی۔ انہیں یقین دلائے گی کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی اچھا کام کرے گی۔ اس نے کل کا سارا کام جلدی جلدی سمیٹا پھر سر جبار کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔
ان کے آتے ہی وہ ان کے آفس میں آسانی سے چلی گئی۔ اس کا کام دیکھ کر وہ واقعی خوش ہوگئے۔
زینب نے جھٹ اپنی درخواست ان کے آگے کی۔ زبان سے الگ التجا کی کہ وہ اس کے لیے کچھ کریں۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئے۔ اس کی گیلی آنکھوں پر انہیں بڑا ترس آیا۔ ہر وقت گیلی ہی رہتی تھیں۔ وہ پھر انکار کرنا چاہتے تھے لیکن پھر انہوں نے درخواست کو ہیڈ آفس دینے کا وعدہ کر لیا۔
"مجھے ایک فیصد بھی امید نہیں ہے زینب!"
اس نے سر ہلا دیا اور کیبن میں بیٹھ کر سو فیصد کے لیے دعا کرنے لگی۔
اماں نے کہا "ٹھیک ہے گھر بیچ دیتے ہیں، کرائے پر رہ لیں گے۔ اتنا قرض کیسے اترے گا۔"
گھر۔۔۔ جس کے ہر دروازے پر عبدالکلام نے ہاتھ سے رنگ کیا تھا۔
"بہت پیسے مانگ رہا ہے وہ۔۔۔ میں اور زینب ہیں نا۔ ہم مل کر کرلیں گے۔" بابا نے برش کے چھینٹے مارے اور اس کے کپڑے۔۔۔
"بابا! میں آپ سے کبھی نہیں بولوں گی۔"
"اوہ۔۔۔ شکر خدایا! فریدہ میرا بٹوہ لے جا کر سامنے کارنس پر رکھ دو۔ اب کوئی ڈر نہیں۔" بابا کی ہنسی۔
"پیسوں کی بھوکی نہیں ہوں میں۔۔۔"
"فریدہ! تین ہزار نکال لو اپنے لیے گرم کپڑے لے آنا۔ ایسے ہی الگ رکھے تھے۔"
"ہاں تو میں پرانے دھرانے کپڑوں میں چلی جاؤں گی شایان کی سالگرہ میں۔"
"دانش! پانچ سو تم نکال لو۔۔۔ پیٹرول کا خرچ بچا۔"

"ہاں تو! بس سے چلی جاؤں گی۔"
"فرقان! ڈیڑھ سو تم لے لو..... آئس کریم کھا آؤ۔"

"بابا!" اس نے بھی برش سے چھینٹے مارے اور ان کے کپڑے خراب کر دیے۔

☆ ☆ ☆

"مام جی نے اتنے بڑے صنعت کار گھرانے میں رشتہ دیکھا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے وہ لڑکی مجھے دوسری شادی کرنے دے گی یا وہ مجھ سے چپ چاپ طلاق لے لے گی....."
ریان نے کافی دیر تک اس کی پریشان صورت دیکھی۔
"تمہیں کس نے کہا اس گھرانے میں رشتہ کرو۔"
"تو پھر.....؟" عاسل نے بے بسی سے اسے دیکھا۔
"خود سوچو یار! دوسری شادی وہ کرنے نہیں دے گی اور اگر تم نے طلاق دی تو اس کا خاندان بنا کسی وجہ کے طلاق لینے پر چپ چاپ راضی نہیں ہو گا۔ تمہارے کاروبار اور خاندان کی ساکھ تباہ ہو جائے گی۔ یہ سب ناممکن ہے..... تم اس کے الٹ کرو۔ تم ایک غریب گھرانے کی لڑکی آگے کر دو کہ تم اسے پسند کرتے ہو ..... جب تم اسے طلاق دو گے تو تمہارے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں بنے گا۔"
"یہ ٹھیک نہیں۔" عاسل پریشان ہو گیا۔
"پھر جو ٹھیک ہے، وہ کر لو۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا پھر اس کی شکل دیکھ کر ترس آ گیا۔
"سوچ لو..... کچھ برا بھی نہیں۔ دیکھو! صرف نکاح ہی کرنا ہے نا..... تم اس کے خاندان کو ہر طرح سے سپورٹ کر دینا۔ چند کروڑ تمہارے لیے مسئلہ نہیں ہیں لیکن ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، تم کسی غریب خاندان کی قسمت بدل دو گے..... کیا لوگوں کو طلاق نہیں ہوتی۔ تم ان کے لیے مسئلہ نہیں بنو گے نہ وہ تمہارے لیے۔ تم نکاح کرو، وقت آنے پر بات ختم..... سیدھی سی بات ہے۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔
"سر! میں ذاتی طور پر آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"کس بارے میں؟"
"چند دن پہلے میں نے آپ کو ایک درخواست دی تھی..... مس زینب بہت پریشان ہیں سر! انہیں لون چاہیے۔"
"مس زینب!" اسے یاد بھی نہیں تھا کہ کس درخواست کی بات ہو رہی ہے۔
"سر! ان کے فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ ان کا گھرانہ بہت مشکلات کا شکار ہے۔"
"میں نے درخواست کے بارے میں کیا کہا تھا؟"
"آپ نے تو کہہ دیا تھا۔"
"جواب ابھی بھی وہی ہے..... پلیز۔" اشارہ باہر جانے کی طرف تھا۔
چند گھنٹے بعد سر جبار کو ان کے کیبن میں فون آیا کہ مس زینب کو درخواست دے کر آفس میں بھیجا جائے ..... سر جبار نے زینب کو اچھی طرح سمجھا بجھا کر کہ اسے کیسے بات کرنی ہے کہ اسے لون مل جائے۔ آفس بھیج دیا۔
اس کا اپنے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کے علاوہ کسی اور ڈپارٹمنٹ کے باس کے ساتھ کبھی بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ نہ ہی اسے معلوم تھا کہ کون کیا ہے۔
باس نے اس کی درخواست پر ایک نظر ڈالی۔ چند سوال اس کی فیملی کے بارے میں پوچھے۔ اس نے جواب دے دیے۔
"آپ مجھے جانتی ہیں..... میں کون ہوں۔"
"جی آپ باس ہیں۔"
"میرا نام....."
"نام مجھے نہیں معلوم۔"
عاسل کو حیرت ہوئی۔ وہ رو دینے کے قریب تھی۔ جیسے وہ اس کا اسکول ٹیچر ہو۔
"کیا میں آپ کے گھر آ سکتا ہوں؟"
وہ بوکھلا گئی۔ "میں نے سب سچ بتایا ہے۔ مجھے

اتنے ہی پیسوں کی ضرورت ہے۔"
"میں پیسوں کی بات نہیں کر رہا..... میں آپ کی بات کر رہا ہوں۔"
"میری....." وہ چھوٹے بچوں کی طرح حیران ہوئی۔
"میں اپنی مام جی کو لے کر آپ کے گھر آنا چاہتا ہوں۔"
سارے آفس والے مل کر بھی اسے سمجھاتے تو بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا۔
"آفس کا ڈرائیور آپ کو گھر ڈراپ کر دے گا۔ آپ آفس میں کسی کو یہ بات مت بتائیے گا بلکہ آپ بھول جائیے کہ آپ نے کبھی اس آفس میں جاب کی ہے۔"
وہ بھول گئی کہ اس نے ابھی کیا سنا ہے۔
"میں آپ سے لون مانگ رہی ہوں۔ آپ مجھے جاب سے نکال رہے ہیں؟"
عاسل کا منہ بگڑ گیا..... "مس زینب! میں آپ کو پروپوز کر رہا ہوں۔ آپ جاب کی بات کر رہی ہیں۔"
"پروپوز۔" اس نے چندھی آنکھوں سے سامنے بیٹھے باس کو دیکھنا چاہا۔ وہ دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔
"ڈرائیور آپ کا انتظار کر رہا ہے۔"
وہ کھڑی نہیں ہوئی۔ گم صورت لیے اسے دیکھے گئی۔ جاب سے نکالنے کا یہ انداز نیا تھا.....

☆ ☆ ☆

اگلا دن آ گیا۔ اماں نے آفس جانے کا پوچھا تو وہ رو پڑی۔
"انہوں نے مجھے جاب سے نکال دیا۔"
اس نے باس کی بات پر ذرہ برابر بھی یقین نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس امیر زادے نے اپنے انداز میں اسے آفس سے نکال باہر کیا تھا۔ جو اس نے کہا تھا وہ تو سوچنے سے رہی۔
اماں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کیا تھا۔ صرف ہر سال خریدی جانے والی ڈائریوں پر صفائی سے شاعری اتاری تھی یا بیل بوٹے بنائے تھے۔ چند ماہ جاب کر لی تھی، کافی تھا۔ دانش گیارہویں میں تھا اور فرقان میٹرک میں..... دونوں ایک اسٹور میں شام کو سیلز مین کی نوکری کرتے تھے۔
رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئیں۔ "ایسا کیوں ہوا اماں؟"
"کیسا.....؟" وہ اداسی سے پلٹیں۔
"بابا....."
"میں کیا کہوں....." وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔
اس پر زندگی کے وزنی بوجھ نہیں تھے۔ صرف بابا کے بغیر زندگی وزنی تھی اور بس..... اماں نے اسے دیکھا۔ کبھی یہاں جھولتی تھی کبھی وہاں..... اب کیسے جامد تتلی سی بن گئی ہے ہاتھ لگاؤں تو ڈھیر ہو جائے۔ حالات اچھے ہوتے تو فوراً اس کی شادی کر دیتیں۔ وہ جانتی تھیں کہ باپ کے ساتھ لپٹ لپٹ جانے والی کو ایسا ہی ایک اور سہارا سنبھال لے گا۔
دن ڈھلا تو ان کے پانچ مرلے کے یک منزلہ گھر میں پاکستان میں فائبر کی تیسری بڑی کمپنی کے مالک کا خاندان موجود تھا۔ ورطۂ حیرت میں اماں تھیں تو ورطۂ حیرت میں وہ لوگ بھی تھے..... دونوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کو ہی معلوم نہیں تھا کہ یہ کیسے ہوا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اماں بھی خاموش تھیں اور ان کے خاندان کی تینوں خواتین بھی..... انہوں نے بمشکل چائے کے چند گھونٹ بھرے اور چلی گئیں۔
زینب کو یہ اس سے بڑا مذاق لگا۔ اماں خواتین کے چہروں پر در آنے والے تاثرات نہیں بھول پا رہی تھیں۔ اس نے ساری بات اماں کو بتا دی کہ باس نے اس سے کیا کہا تھا۔
دو ہی دن گزرے تو وہ تین اور ایک مرد رشتہ مانگ گئے۔ اس بار وہ ذرا پُرسکون تھے۔ مام جی نے ساری بات صاف بیان کر دی کہ کیسے وہ بیمار ہیں اور ان کے بیٹے نے زینب کو پسند کر لیا ہے اور نہ چاہتے ہوئے

بھی وہ اس رشتے پر راضی ہیں۔ شادی کے لیے کل کا دن بھی ہو سکتا ہے..... کل سے بھی جلد شاید.....

رات گئے تک وہ سب اس سامان کے آس پاس دم سادھے بیٹھے رہے، جو ان کے دو کمروں میں پھیلا تھا۔

اماں نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما..... آپا آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

زینب کو مام جی کی کہی ایک ہی بات رہ رہ کر یاد آ رہی تھی "عاسل نے زینب کو پسند کر لیا تو....."

"عاسل نے زینب کو کب پسند کیا.....؟ کیا بھی تو کیوں..... کیسے؟"

اماں نے زینب سے کہا کہ وہ شکرانے کے نفل پڑھے۔ اس نے پڑھ لیے۔

عاسل نے زینب کو پسند کر لیا۔ صرف اس پہلی ملاقات میں جب وہ غلطی سے اس کے آفس چلی گئی تھی۔

زینب کے وجود میں ٹھنڈی آبشار کا جھرنا جاری ہو گیا۔

پہلی بار پسند کیے جانے کا احساس ہوا۔ شدت سے ہوا۔ بہت خوب ہوا۔

اس کے اندر کا سماں بدلا۔

اس نے اسے پسند کیا۔ رشتہ بھی آ گیا۔ اتنا کچھ زینب کے لیے۔ تھا کیا زینب میں..... نہ وہ عاسل کی طرح خوب صورت تھی، نہ ہی اس کے خاندان کی طرح امیر..... نہ ہی لائق فائق..... ذہین فطین..... کون سی بات عاسل کو اس میں پسند آ گئی؟

وہ چھوٹا سا مکالمہ جو اتفاقاً "دونوں کے درمیان ہوا؟

اس وقت اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عاسل کمپنی کا مالک ہے..... بلکہ وہ ڈر گئی تھی جب سر جبار نے کہا کہ اسے نکالنے کے لیے کہا گیا ہے۔ زینب سوچتے سوچتے مسکرانے لگی۔ اس نے سارا واقعہ اول و آخر اپنی ڈائری میں لکھا۔ ساتھ چند اشعار لکھے اور لکھتے لکھتے وہ سو گئی۔



زینب کے گھر صرف نکاح ہوا تھا۔ باقی کے سب انتظامات ان کے تھے۔ بارات اور رخصتی ان ہی کے بک کروائے گئے ہوٹل سے ہوئی تھی۔ زینب کی ایک دوست شدید ترین ڈپریشن میں چلی گئی۔ اتنی دولت..... اتنا حسن..... زینب کے لیے..... عاسل۔

تقدیر لکھنے والے قلم نے زینب کا نام ہی کیوں لکھا۔

آفس کے بعد سے اس کی عاسل سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی نہ ہی بات ہوئی تھی۔ اس پر جب بھی زینب کی نظر پڑی وہ خاموش ہی ملا..... جیسے معلوم ہی نہ ہو کہ کہاں کھڑا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ ان کا گھر چند ایکڑ پر بنا تھا..... بس زینب کو ہنسی آ گئی۔ اس نے اپنا بیڈ روم دیکھا تو حیران رہ گئی۔ گھر ایسے بھی ہوتے ہیں۔ وہ کیسے سوچ سکتی تھی دیکھتی تو سوچتی۔

عاسل ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لایا تھا۔ اس نے اسے کاؤچ پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا تھا اور وہ کافی دیر تک سوچوں میں گم رہا۔

"زندگی کا بڑا عرصہ میں نے یورپ میں گزارا ہے۔"

اس نے سر کو جھٹکا گویا بات یہاں سے شروع نہیں کرنی..... "مام جی میری شادی کرنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ اچانک بہت بیمار ہو گئی ہیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں..... میں بھی ان سے پیار کرتا ہوں..... ان کی خواہش تھی میری شادی اور میں نے کر لی..... میں اچانک اس طرح شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک بار تمہیں دیکھا۔ تم مجھے اچھی لگیں۔ میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں کو کچھ وقت ملے۔ ایسے ہی ڈائریکٹ شادی..... مجھے یہ پسند نہیں، لیکن مام جی کی ضد کے آگے..... میں نے ان کی مان لی۔"

زینب کو بڑی خوشی ہوئی کہ اتنا خوب صورت دولہا اس کے عین سامنے بیٹھا کہہ رہا ہے کہ وہ اسے پسند آ گئی تھی وہ بھی پہلی نظر میں۔

"اگر ہم پہلے ایک دوسرے کو سمجھ جاتے تو ٹھیک تھا۔"

زینب نے تائید میں سرہلایا۔
"اچانک شادی۔۔۔" وہ جھنجلا کر اٹھا۔
چند ماہ سے زینب لگاتار رو رہی تھی "وہ یتیم ہوگئی۔۔۔ یتیم ہوگئی۔" سُن رہی تھی۔ "تم مجھے اچھی لگیں۔" یہ سنا تو بہت اچھا لگا۔ رونے والی اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔
بھول جانے والے دماغ کو ساری غزلیں، سارے اشعار یاد آنے لگے، چند گانوں کے بول بھی یاد آگئے۔
اس نے اپنے بے حد خوب صورت شوہر کو کمرے میں چلتے پھرتے دیکھا، اس کے چہرے پر در آئی جھنجلاہٹ کو۔۔۔ آنکھوں میں اتر آنے والی تھکن کو ۔۔۔
اس بار وہ غزلیں اسے ادھوری لگیں۔
اشعار ناکافی لگے۔
کوئی ایک بار پھر عاسل کو دیکھ لے اور نئے سرے سے شاعری کرے۔۔۔
دلہن بنی بیٹھی وہ اسے دیکھے گئی۔۔۔ اس نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ ایک بار بھی عاسل نے اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔
اس نے کپڑے بدلے اور جہازی سائز بیڈ پر سوگئی۔

☼ ☼ ☼

عاسل نے کہا کہ وہ مام جی کے ساتھ ساتھ رہا کرے اور وہ ان کے ساتھ ساتھ ہی رہتی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ حقیقت کو تسلیم کرچکی ہیں اور اپنے گھر اور خاندان میں ہی مرنا چاہتی ہیں۔ زینب کو شروع میں مام جی سے اور باقی سب سے بھی بہت ڈر لگتا تھا وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہوتی۔ اسے لگتا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتے ہوں گے لیکن وہ سب بری طرح مام جی میں ہی الجھے رہتے تھے اور وہ اسے ناپسند کیوں کرتے جب مام جی اسے پاس بٹھائے باتیں کرتی رہتی تھیں، سب ان ہی کے آس پاس رہتے تھے۔ زینب بھی زیادہ تر ان ہی کے کمرے میں رہتی تھی۔ مام جی کہتیں۔

"زینب! جاؤ اچھی طرح سے تیار ہو کر آجاؤ۔"
زینب تیار ہو کر آجاتی۔
"زینب! فلاں رنگ کا سوٹ پہن آؤ۔ وہ میری پسند کا تھا۔" زینب پہن آتی۔
وہ اسے بتاتیں کہ کیسے دودھ کو دو چار بار ابال کر اسے چائے بنائی ہے وہ بنا کر لے آتی۔ وہ ایک گھونٹ لیتیں اور کہتیں "ہاں ایسی ہی۔۔۔ بالکل ایسی ہی۔"
وقفے وقفے سے جب وہ اسپتال داخل ہوئیں تو وہ ان کے ساتھ رہتی۔ عاسل بھی ساتھ ساتھ ہی رہتا۔۔۔ عاسل ان کا ہاتھ پکڑے پکڑے سہلاتا رہتا اور جب وہ باتیں کرتے کرتے سو جاتیں تو کرسی پر بیٹھے بیٹھے خود بھی گردن ایک طرف کرلیتا۔۔۔ وہ ایک طرف رکھے صوفے پر دراز ہر رات یہی ایک منظر دیکھتی۔ دونوں خوب باتیں کرتے ہنستے اور ایک کے بعد دوسرا سوجاتا، ایک دن اس نے چھوٹا کشن احتیاط سے عاسل کی گردن اٹھا کر پیچھے رکھ دیا۔ اس نے ذرا کی ذرا آنکھ کھولی اور پھر بند کرلی۔
وہ رات بھر عاسل کو دیکھتی رہتی۔
چند دن پہلے اس نے اس سے کہا کہ وہ اس کی ٹائی باندھنا چاہتی ہے۔ ٹائی باندھتے عاسل کے ہاتھ رک گئے۔۔۔ اس نے تیز نظروں سے اسے دیکھا "کیوں؟" ابرو چڑھ گئے۔
"کیونکہ مجھے اچھا لگے گا اور آپ نے کہا تھا کہ میں آپ کو اچھی لگتی ہوں۔"
عاسل پچھتایا۔ "میں اپنے کام خود کرتا ہوں۔"
"یہ کام تو نہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر ٹائی پکڑلی۔
عاسل نے ہاتھ چھوڑ دیے۔۔۔
انوکھی صورت حال تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور وہ تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ کھڑا ہونے پر مجبور تھا وہ اسے بتا رہی تھی کہ صرف اس کے لیے اس نے ٹائی باندھنا سیکھی ہے اور وہ ایسے ہی اس کا ہر کام سیکھ جائے گی۔
"کون سے کام۔۔۔؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔
"ہیں بہت سے کام۔۔۔" بلاوجہ کی مسکراہٹ۔

یہ مسکراہٹ ہمہ وقت اس کے ہونٹوں، اس کی آنکھوں میں رچی بسی رہتی ۔۔۔ زینب کو ہر آنے والے اور گزر جانے والے پل یہ سوچ سوچ کر بہت خوشی ہوتی کہ عاسل اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ اچھی شکل و صورت کی مالک تھی، سفیدی مائل گندمی رنگ تھا، کمر تک لمبے بال تھے۔۔۔ آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور بہت بھلی لگتی تھیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ وہ بے حد خوب صورت نہیں تھی لیکن عاسل کے خاندان میں آکر اسے ساری خوب صورتی مل گئی تھی۔ ثمو اس کے لیے شاپنگ کرتی۔ اسے اپنے ساتھ پارلر لے کر جاتی۔۔۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ کوئی لباس پہنتی اور اس پہ جچتا نہیں۔۔۔ اور پھر اس نے صرف ایک سچ کو مان لیا تھا۔
جب وہ عاسل کو اچھی لگ گئی تو بھلے سے وہ خوب صورت لوگوں کی صف میں کھڑی نہ ہو پائے، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اتنے سے دنوں میں اس نے بہت کچھ جان لیا تھا۔ یہ بھی کہ مام جی کی وجہ سے عاسل بہت پریشان ہے۔
وہ مام جی کی وجہ سے ساری ساری رات نہیں سوتا اور سوتا ہے تو لائبریری میں۔
ایک بار وہ رات گئے لائبریری گئی اور عاسل سے پوچھا کہ اسے کچھ چاہیے تو نہیں؟ اس نے کہا کہ اسے دروازہ بند چاہیے۔ زینب کو برا لگا اور ساری رات سو نہیں سکی مگر اگلے دن اسے دیکھتے ہی سب بھول گئی۔
ایک دن وہ اس کی وارڈ روب ٹھیک کررہی تھی کہ اس نے اس کا بازو پکڑ کر پیچھے کیا اور کہا کہ وہ اس کی چیزوں میں نہ گھسا کرے۔ اس کا انداز اتنا برا تھا کہ وہ رونے لگی۔۔۔ چھپ کر روتے وقت اسے بابا بھی یاد آجاتے پھر وہ دل کھول کر روتی۔
شام کو مام جی کے پاس اسپتال جانے لگے تو زینب نے فرنٹ سیٹ کی کھڑکی سے دیکھ کر اسے کہا کہ وہ اس کی گاڑی میں نہیں بیٹھے گی اور کسی اور کے ساتھ چلی جائے گی۔

پلٹتے پلٹتے اس نے عاسل کو مسکراتے دیکھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے باہر نکلا۔
"سوری۔"
اس کی کسی بات پر وہ مسکرا رہا تھا۔ سوری بھی کہا۔ اسے بہت خوشی ہوئی۔ اس کا سارا غصہ جاتا رہا اور وہ گاڑی میں جا بیٹھی۔
"اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم پھر سے وہ کرو جس سے میں نے منع کیا ہے۔"
اس نے تائید میں سرہلایا۔
زینب نے کئی بار لڑکیوں کو گردن موڑ موڑ کر اسے دیکھتے دیکھا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ ان سب کے پاس جائے اور کہے "یہ میرا ہے اور میں بھی اس کی ہوں۔"
وہ بے حد خوب صورت اور شان دار تھا۔
زینب اکثر الفاظ جوڑتی رہتی کہ جب کبھی ان دونوں میں ذرا زیادہ دوستی ہو جائے گی تو وہ عاسل کی تعریف کرے گی۔۔۔ وہ اسے اپنے الفاظ میں بیان کرے گی۔
سوتے ہوئے۔۔۔ جاگتے ہوئے۔۔۔ کھانا کھاتے۔۔۔ باتیں کرتے۔۔۔ الجھی شکل لیے لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے۔۔۔ وہ اسے ہر بار کتنا اچھا لگتا ہے۔

☼ ☼ ☼

اس نے ہاتھ روک کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ واش روم کے ادھ کھلے دروازے سے اندر آکر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔
"جاؤ یہاں سے۔"
"نہیں۔۔۔ مجھے دیکھنا ہے۔"
"کیا۔۔۔؟" اس کی آواز میں غصہ تھا۔
"میں نے کبھی دیکھا نہیں کہ شیو کیسے بنتی ہے۔۔۔ بابا کی داڑھی تھی تو میں۔"
"تم پاگل ہو۔"
وہ مسکرائی لیکن دیکھتی رہی۔ اس نے ہاتھ روک کر اسے باہر کیا اور دروازہ بند کردیا۔
اسے غصہ آگیا اور وہ منہ پھلا کر بیٹھی رہی۔ وہ باہر

نکلا اور چلا گیا اسے اندازہ بھی نہیں ہوا کہ وہ ناراض ہے۔

"میں تو کبھی بھی نہیں مانوں گی۔"

"روسٹ کڑاہی سے بھی نہیں؟"

"نہ۔"

"دو ہزار سے؟"

"دو ہزار اور ساتھ روسٹ کڑاہی۔۔۔ پھر شاید۔"

"پھر بھی شاید۔۔۔" وہ ڈاڑھی کھجانے لگے۔

اس نے سوچا کہ عاسل کے پاس تو اتنے پیسے ہیں پھر بھی وہ اس سے بنا پیسوں کے ہی مان جاتی۔۔۔ کیسے؟ شاید صرف اس کی ایک ہلکی مسکراہٹ سے۔ اس نے اپنی عادتیں بابا کے ہاتھوں خراب کر ڈالیں۔ ابھی وہ خاموش تھی۔ وہ سوچتی اگر مام جی بیمار نہ ہوتیں اور عاسل کی پسند کی یہ شادی عام حالات میں ہوئی ہوتی تو وہ روز عاسل کو ایسے ہی تنگ کرتی جیسے بابا کو کرتی تھی۔

وہ ہر گزرتے پل کے ساتھ اسے شدت سے سوچتے رہنے کی بیماری میں مبتلا ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ مام جی بہت لاغر ہوتی جا رہی تھیں۔ ناشتے کے دوران، کھانے کی ٹیبل پر، لاؤنج میں بیٹھے سب خاموش ہی ہوتے تھے۔ ثمو اپنی نم آنکھیں صاف کرتی رہتی، عاسل ضرورت سے زیادہ چپ ہوتا۔ ہر فرد خاموش اور اداس تھا۔ مام جی کی موت قبل از وقت ہی ان سب پر طاری ہو چکی تھی۔

وہ کسی کی نم آنکھیں دیکھ لیتی تو خود رونے لگتی۔ اسے بابا یاد آجاتے۔۔۔ عاسل اور ڈیڈ نے آفس جانا تقریباً" ختم کر دیا تھا۔ رشتے دار، ملنے والے مزاج پرسی کے لیے آتے۔۔۔ مام جی گھبرا جاتیں۔ انہیں لگتا ان سے ان ہی کی موت کی تعزیت کی جا رہی ہے۔ عاسل مام جی کو لے کر کینیڈا جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

مزاج پرسی کے لیے آنے والے لوگ انہیں شدت سے موت کا احساس دلا رہے تھے۔ ایک ایک کر کے وہ سب کینیڈا چلے گئے۔

عاسل مام جی کے چھوٹے چھوٹے کام خود کرتا، مام جی کو بہت خوشی ہوتی جب عاسل اپنے ہاتھوں سے ان کے کام کرتا۔ اکثر مام جی زینب کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس کئی کئی گھنٹے بٹھائے رکھتیں۔

"عاسل کو بھولنے کی بہت عادت ہے۔ مجھے حریم نام بہت پسند ہے۔ عاسل باپ بنے گا تو تم اس کی بیٹی کا نام حریم رکھ دو گی؟"

اس نے فوراً" اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لڑکے کے لیے بھی ایک نام بتا دوں؟" ان کے انداز پر زینب ہنسنے لگی وہ خود بھی ہنسنے لگیں۔

"تم اچھی لڑکی ہو۔۔۔ زندگی کے اس موڑ پر آکر احساس ہوتا ہے کہ زندگی کی خوشیاں انسانوں سے جڑی ہوتی ہیں۔ چیزوں سے نہیں عاسل کی خوشیاں بھی تم سے جڑی ہیں۔ میں بے اولاد ہو کر بھی اولاد والی ہوں۔۔۔ میں نے صرف کھلے دل سے محبت کی۔۔۔ اور مجھے اس کا انعام ملا بھی۔ تم بھی کرتی ہو؟" وہ پوچھ رہی تھیں، وہ مسکراہٹ دبا رہی تھی۔

"کتنا شرماتی ہو تم۔" انہوں نے اس کے گال پر چٹکی لی۔

"معاف کرنا جانتی ہو؟ سیکھ جاؤ۔۔۔ جو بیوی معاف کرنا سیکھ جاتی ہے بہت سکھی زندگی گزارتی ہے۔"

اس نے سر ہلایا۔

"میرے عاسل کو دکھی نہ کرنا۔۔۔ میں نے اسے پندرہ سالوں کی دعاؤں کے بعد پایا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کے ختم ہونے کا دکھ نہیں ہے کیونکہ عاسل میں ہی میری زندگی ہے۔۔۔ وہ اپنی زندگی جیسے۔۔۔ میری کوئی ایسی دعا نہیں۔ جس میں عاسل کا نام نہ آیا ہو۔ میں نے ثمو اور اسد کو بھی بھلائے رکھا۔ مجھے عاسل کو یاد رکھ کر بہت سکون ملتا ہے۔"

"مجھے بھی۔" اس نے کہا نہیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ دوا کے زیر اثر سو گئیں۔ ان کا علاج ممکن نہیں تھا۔ ان کی صرف تکلیف کم کی جا رہی تھی۔

چند دنوں بعد وہ دو دن کی مسلسل بے ہوشی میں فوت ہو گئیں۔ زینب اور عاسل کی شادی کے ٹھیک نو ماہ بعد۔

ان کی موت کا سوگ تو وہ ان کی زندگی میں ہی منا رہے تھے۔ لیکن حقیقی موت نے گہرا اثر کیا۔ عاسل چند دن اسپتال رہا۔۔۔ ذہنی اور جسمانی طور پر اس نے کافی اثر لیا تھا۔ جو خاموشی ان کی بیماری کے دوران تھی وہی خاموشی ان کے جانے کے کئی ہفتوں بعد تک رہی۔

☼ ☼ ☼

ثمو کو اس کا شوہر فارن ٹرپ پر لے گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح اس کا دل بہل جائے گا۔ عاسل کو بھی کہا لیکن وہ نہیں مانا۔ ڈیڈ نے ماما اور زینب کو امریکا بھیج دیا۔ وہ عاسل کے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی لیکن ڈیڈ اور ماما کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ماما کو اکیلا نہیں بھیج سکتے اور خود ان کے ساتھ جا نہیں سکتے۔

نیو جرسی میں ان کا چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ حقیقتاً" وہ پہلی بار عاسل سے دور ہوئی تھی۔ اسے نیو جرسی کی ہر چیز کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھی۔

زینب نے عاسل کو کتنی بار کہا کہ وہ ساتھ چلے لیکن اس نے سرد مہری سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر غصے سے اٹھ کر ہی چلا گیا۔ وہ یہ جانتی تھی کہ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے اور جب وہ اپنی مرضی کرتا ہے تو کسی کی بھی نہیں سنتا۔۔۔ جن کی سنتا تھا۔ وہ جا چکی تھیں۔ وہاں پہنچتے ہی باتھ روم کا دروازہ بند کر کے وہ رونے لگی۔

زینب نے چاہا کہ اس کی آواز ہی سن لے۔ مگر اس نے فون ہی نہیں اٹھایا۔

اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔۔۔ رات بھر سوئی بھی نہیں۔ کبھی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر سوچتی کبھی بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ کبھی جی چاہتا کہ بدتمیزی کی انتہا کر دے اور ماما کو چھوڑ کر اکیلی ہی واپس چلی جائے۔

ماما اسے شاپنگ پر لے کر جاتیں۔ اسے نیو جرسی کے مشہور اسٹور سے ڈائمنڈ کے ٹاپس لے کر دیے۔۔۔ بڑے بڑے ہوٹلز میں جاز میوزک میں اسے ڈنر کروائے۔۔۔ صبح و شام اس کے ساتھ پارکوں میں واک کی۔۔۔

رات کو وہ سوتی تو آنسو چھلکنے لگتے۔ وہ فون کرتی تو کبھی تو اٹھایا ہی نہ جاتا اور اگر اٹھا لیا جاتا تو۔۔۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔۔۔ جلدی میں ہوں۔۔۔ بزی ہوں۔۔۔ ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔۔۔ لنچ کر رہا ہوں۔" کہا جاتا۔

چند حرفی جملے اور اس کی بات سنے بغیر ہی فون بند۔ آدھی رات کو اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوتی اسے میسج کرتی کہ وہ کہاں کہاں گئے کیا کیا دیکھا۔۔۔ مگر کسی میسج کا جواب نہ آتا۔

وہ اس کے ساتھ گزارا ایک ایک پل یاد کرتی بار بار دہراتی۔

ایک بار وہ لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا کہ اس نے اس پر جان بوجھ کر چائے چھلکا دی۔ اس نے اتنے غصے سے زینب کی طرف دیکھا کہ اس کا دم ہی نکل گیا۔ مگر وہ صاف مکر گئی۔ "وہ غلطی سے گر گئی۔"

اس نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔ "تمہارا انداز سب بتا رہا ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔ "کیا بتا رہا ہے؟" جواب دینے کے بجائے وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

چند دنوں میں ہی وہ چائے والی بات بھول گئی اور اپنے فریش جوس میں سے آئس کیوب نکال کر اس کی گردن پر رکھ دیا۔۔۔ خالصتاً" غریبانہ مذاق تھا جو دانش وغیرہ کے ساتھ وہ کرتی تھی اور اسے بھاتا بھی بہت تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ پوری قوت سے دھاڑا۔ وہ سچ مچ ڈر گئی اور اسے دیکھنے لگی۔ وہ اسے ہی گھور رہا تھا اس نے بمشکل کہا۔

"مذاق۔"

"ایسے مذاق تم کسی اور کے ساتھ کرنا۔"

"کس کے ساتھ۔۔۔؟"

"جاؤ یہاں سے۔" وہ چلایا۔

"کس کے ساتھ؟" بے ساختہ منہ سے نکل گیا۔
"شٹ اپ!" وہ دھاڑا۔
زینب نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ مذاق تھا برا تھا لیکن گھٹیا نہیں تھا عاسل کے رد عمل پر اسے بہت افسوس ہوا۔ زینب نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔
"آپ بہت بے رحم ہیں۔" اس نے کہہ دیا۔ وہ جو اٹھ کر باہر جارہا تھا۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔
"بات نہیں کرتے اور دیکھتے بھی نہیں۔"
چند لمحے اسے دیکھ کر وہ چلا گیا' چند بار رو کر زینب نے خود کو تسلی دے لی کہ مذاق ہی گھٹیا تھا ورنہ وہ اتنے غصے میں نہیں آتا اور پھر وہ تو اتنا پیارا ہے کیسے مام جی کا ہاتھ تھام کر گھنٹوں باتیں کرتا رہتا ہے۔ ایک دن وہ اس کا ہاتھ تھام کر بھی گھنٹوں باتیں کرے گا۔ ہنسے گا۔ ہنسائے گا۔ لیکن ہوا کچھ یوں کہ زینب نے اسے ایک چھوٹے بچے کی طرح ہر صورت خوش رکھنا' منانا اور اس کے آگے پیچھے ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس نے عاسل کا ہر کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ کئی راتیں مام جی کے پاس گزارتے ایک رات مام جی نے اسد کو روک کر اسے گھر جانے کے لیے کہا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے ہوا تو اس نے عاسل سے کہا کہ وہ گاڑی روک دے..... اس نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا اور گاڑی نہیں روکی۔
"میری کوئی بات نہیں مانتے۔" وہ غصے سے بڑبڑائی۔

اس نے اس سے زیادہ غصے سے بریک پر پاؤں رکھے جیسے کہا "تو مرو روک دی اب۔"
"مجھے کچھ کہنا ہے۔" وہ جھجکی۔
"تو اسپتال میں کہہ دیتیں۔"
"اسپتال کا ماحول ٹھیک نہیں تھا۔"
"گھر جاکر کہہ دینا۔"
"گھر جاتے ہی آپ فوراً سو جاتے ہیں۔ لائبریری میں۔"
"کہو اب....." وہ جھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"آپ اصرار تو کریں..... کیا بات ہے زینب؟"
اس بار عاسل نے مسکراہٹ روکنے کے لیے ہونٹوں کا کونا دانتوں میں دبالیا۔
"نظم سنانی ہے۔" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔
"تم مجھے پوئٹری سنانے لگی ہو..... آدھی رات کو اس طرح گاڑی رکوا کر؟"
وہ کھل کر مسکرادیا۔ اس امر سے ڈرے بغیر کہ وہ اس کی مسکراہٹ دیکھ لے گی۔ اور کچھ سمجھنے لگے گی۔
وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سڑک پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ان کی گاڑی کنارے پر کھڑی تھی۔ وہ دور تک چل کر گیا۔ زینب نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا..... وہ بلند بانگ قہقہے لگا رہا تھا۔ دو منٹ تک ہنستے رہنے کے بعد وہ واپس آکر بیٹھ گیا۔ ٹشو سے اپنی آنکھوں کے کونے صاف کیے..... اور ایک ٹشو اس کے آگے بھی کیا کہ اگر اس کا دل ٹوٹ چکا ہے اور وہ رونے والی ہے تو آنکھیں صاف کر سکتی ہے۔
سارا راستہ وہ روہانسی بیٹھی رہی اس انتظار میں کہ وہ کہے گا "چلو سناؤ" لیکن برا ہو ہر اس چیز کا جس نے عاسل کو ایسا بنا دیا تھا۔ خاص کر اس یورپین یونیورسٹی کا جہاں سے عاسل ایسا روکھا بن کر نکلا تھا۔
اس نے اپنی لکھی نظم میسج میں لکھ کر اسے بھیج دی..... دن گزر گیا اور جواب کیا آیا۔
"سوالیہ نشان.....؟"
چند اور دن گزرے تو عاسل نے اسے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دیا اور ایک گھنٹے بعد خود بھی گھر آگیا زینب کو بہت برا لگا۔
زینب کو حیرت تھی پسند کی شادی کرلی تھی۔ اب اس پسند کو مزید پسند کرنے کا اس کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو کبھی اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا پھر بھی زینب کو لگتا وہ ہر وقت صرف اسے ہی دیکھتا ہے اسے پسند جو کرتا ہے۔
اس نے ماما سے کہا کہ وہ عاسل سے کہیں کہ وہ بھی یہاں آجائے' ماما نے کہا بھی مگر اس نے کہا آفس میں کام بہت ہے۔
ماما کا میڈیکل چیک اپ ہو چکا تھا رپورٹس آتی

تھیں۔ ان کی صحت اچھی ہوتی جارہی تھی۔ مام جی اور ان میں بہت دوستی تھی۔ ماما ڈیڈ کے ساتھ پارٹیز اٹینڈ کرتی رہتی تھیں۔ گھر اور بچوں کو مام جی نے ہی دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی مشکور رہیں۔ ایک اولاد دینے پر ایک اولاد کی پرورش کرنے پر..... رشتہ سوکن کا تھا۔ یہ ظاہر ہی نہیں ہوتا تھا۔ اتنے سے عرصے میں زینب بھی جان گئی تھی کہ مام جی کس شدت سے سب سے پیار کرتی ہیں' سب کا خیال رکھتی ہیں۔
نیوجرسی میں وہ اپنے بہترین وقت سے گزر رہی تھی۔ لیکن جب ماما نے بتایا کہ عاسل بزنس کے سلسلے میں فارن ٹرپ پر ہے تو زینب کو بہت خوشی ہوئی۔ وہ نیوجرسی بھی ضرور آئے گا وہ جانتی تھی۔ وہ ہر روز ایسے بن ٹھن کر رہتی کہ جیسے وہ ابھی آجائے گا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اسے سرپرائز دے گا۔
لیکن اگلے کئی دنوں تک وہ نہیں آیا نہ ہی فون کیا۔ وہ باتھ روم میں چھپ چھپ کر روتی رہی۔
چند مزید ہفتے گزار کر ماما نے تمرو کے پاس لندن جانے کا سوچا۔ ڈیڈ کا آنے کا ارادہ بھی تھا۔
زینب واپس جاکر کیا کرتی۔ عاسل پاکستان میں بھی نہیں تھا..... اس نے عاسل کو میسج کیا کہ وہ لوگ لندن میں ہیں اور وہ اپنے بزنس ٹور سے فارغ ہو کر ان کے پاس آجائے اور اس نے یہ بھی لکھا کہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔
اسے یقین تھا کہ وہ لندن ضرور آجائے گا۔ ماما بتا رہی تھیں کہ یہ شہر اسے بہت پسند ہے اور وہ بھاگ بھاگ کر یہاں آتا ہے۔ بزنس ٹور کہیں کا بھی ہو' یہاں ضرور رک کر جاتا ہے۔
یہاں آکر اس کا انتظار بڑھ گیا۔ اس نے ماما کے ساتھ کی گئی شاپنگ استعمال کرنی شروع کردی۔ وہ بہت اچھی طرح سے تیار ہونے لگی تھی۔ اس کی رنگت نکھر کر سرخی مائل لگنے لگی تھی۔ گہری سیاہ بھنوؤں کے ساتھ گہرا سیاہ کاجل اس کی آنکھوں میں بہت اچھا لگتا ماما نے پہلی بار اسے ایسے کاجل لگائے دیکھا تو دل کھول کر تعریف کی۔
ماما ایک بڑے سیلون سے بال سیٹ کروا رہی تھیں' وہ اٹھ کر باہر آگئی' سیلون ایک بڑے شاپنگ سنٹر میں تھا۔ کافی کا مگ لے کر وہ گلاس وال کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ بوندا باندی ہو رہی تھی اور اس نے لانگ کوٹ اور سرخ مفلر میں عاسل کو تیزی سے سڑک پار کرتے دیکھا۔
وہ شاپنگ سنٹر کے سامنے بنے پارکنگ لاٹ سے نکل رہا تھا۔ مگ چھوڑ کر وہ تیزی سے تیسری منزل سے پہلی منزل پر آئی۔ بھاگتی ہوئی بیرونی دروازے سے باہر نکلی..... یقیناً" ماما نے اسے بتا دیا ہوگا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اچانک ہی آئے گا۔ وہ اسے جان گئی تھی۔ وہ اسے سرپرائز دینے والا تھا..... وہ سڑک کے دونوں طرف بنی دوکانوں سے اس کے لیے پھول لینے گیا ہوگا۔ تیزی سے بھاگتے ہوئے بھی اس نے کافی کچھ سوچ لیا۔
وہ مارکیٹ کے اندر چلی گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر اسے صاف ستھرے شیشے کے پار وہ نظر آگیا۔ وہ عاسل ہی تھا۔
وہ بے انتہا خوش ہوئی..... گہرا سانس لیا۔ خود کو نارمل کیا' پرس میں سے آئینہ نکال کر خود کو دیکھا..... پھیل جانے والے کاجل کو ٹھیک کیا..... بالوں میں ہاتھ گھما کر ذرا اسٹائل دیا..... پھر آہستہ آہستہ چلتی اس

دوکان کے پاس آئی..... وہ ذرا سا ترچھا ہو کر کھڑا تھا اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھولا ..... اور عین اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"تم؟" عاسل نے اس طرح کہا کہ اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"یہ کیسا ہے۔" دوسری آواز آئی عاسل کی نظروں کے تعاقب میں اس نے آواز کا تعاقب کیا..... وہ لڑکی ذرا فاصلے پر ہاتھ میں دو مختلف جوتے پکڑے پکڑے پوچھ رہی تھی۔

"یہ فارحہ ہے۔"

"ہائے!" وہ کھڑی ہو گئی ہاتھ آگے کیا۔ اگر عاسل دنیا کا سب سے خوب صورت لڑکا تھا تو وہ دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔

زینب نے بمشکل اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ زینب ہے۔ سرد انکل کی بیٹی۔"

"او..... زینب! تمہارے ڈیڈ سے مل چکی ہوں میں ایک بار۔" زینب نے الجھ کر عاسل کی طرف دیکھا اور اس نے اس انداز میں اسے گھورا کہ وہ خاموش کھڑی رہی۔

"یونیورسٹی سے آ رہی ہو؟" اس کی آواز بہت خوش کن تھی۔

زینب نے سر ہلایا۔

"ہم شاپنگ بعد میں کرلیں گے..... کچھ کھاتے ہیں۔"

زینب نے نظر چُرا کر عاسل کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے کھڑا تھا جیسے اسے جانتا ہی نہیں۔ اپنی بیوی کو وہ پہچان نہیں رہا تھا۔ اس کا یہی انداز اسے حیران و پریشان کر رہا تھا۔

"میں جلدی میں ہوں۔" شکر رہا کہ وہ روئی نہیں۔

"جلدی میں ہو..... کم آن۔" وہ مسکرائی۔

"چلو میرے ساتھ مجھے تمہارے کزن کی کچھ شکایتیں کرنی ہیں۔" اس نے ادا سے مسکرا کر عاسل کی طرف دیکھا۔

زینب نے ہاتھ آگے کیا..... "میں چلتی ہوں۔"

"اوکے!" فارحہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا پھر اپنا بایاں ہاتھ زینب کے آگے کیا۔

"کیسی ہے؟" اس کا اشارہ انگوٹھی کی طرف تھا۔

"تمہارے کنجوس کزن نے دی ہے۔" کہہ کر اس نے عاسل کا بازو تھام لیا اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

زینب نے دور تک بنی دکانوں کے شیشے ٹوٹتے دیکھے۔

"میں اور عاسل انگیج ہو گئے ہیں۔" اس نے کہا۔

اس نے اس بار عاسل کی طرف نہیں دیکھا اور باہر کی طرف لپکی..... فارحہ کا کہا "بائے" دُور تک اس کے پیچھے آیا۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھی تو اس نے عاسل کو تیزی سے پیچھے آتے دیکھا لیکن فارحہ کا بائے گونجتا ہی رہا۔

اس کا فون بجنے لگا پھر میسج آیا۔ اس نے نہ فون سنا نہ میسج پڑھا، اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ اسے ایسی جگہ لے جائے جہاں اس کے علاوہ کوئی نہ ہو وہ اسے درختوں میں گھری ایک جھیل تک لے گیا۔ جہاں دور دور تک اکا دکا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی روتی رہی بہت دیر تک۔

پھر احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی بے وقوف ہے، پاگل ہے، نا سمجھ ہے..... عاسل کی بات سنے بغیر وہ کیا کیا سوچ رہی ہے۔ اس لڑکی نے "مذاقاً" کہہ دیا ہوگا، دوستوں میں تو ایسے مذاق چلتے ہیں.....

عاسل کا فون آ رہا تھا اس نے پوچھا وہ کہاں ہے اس نے جگہ کا نام بتا دیا۔

"میں آ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔

"وہ آ رہا ہے۔" وہ خوش ہو گئی لیکن پھر رونے لگی۔

کچھ ہی دیر میں عاسل اس کے پاس تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی..... اتنے سے وقت میں اس نے اسے بہت بری طرح سے کھویا تھا..... کھو کر مل جانے والوں کی طرح وہ اس سے لپٹ گئی۔

عاسل نے سرد مہری سے اسے الگ کیا پھر اسے لے کر گاڑی میں آ بیٹھا۔ سارا وقت وہ اس کی طرف بار بار دیکھتی رہی لیکن وہ خاموشی سے لب بھینچے کار چلاتا رہا جیسے کار میں اکیلا بیٹھا ہو۔ اس کی آنکھوں کا کاجل رو رو کر پھیل چکا تھا۔

"سرد انکل کی بیٹی۔" وہ پوچھنا چاہتی تھی اس نے ایسا کیوں کہا لیکن خاموش بیٹھی رہی اور یہ کہ وہ لندن کب آیا؟

☼ ☼ ☼

"بیٹھو۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ یہ عاسل کا فلیٹ تھا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس کا زرخیز دماغ چپ تھا ہاں دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ زینب کا خیال تھا کہ وہ اسے بتائے گا کہ وہ کتنا غلط سمجھ کر وہاں سے چلی آئی۔

"میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔" وہ سفید پڑ گئی۔ وہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"آئی ایم سوری زینب! لیکن ایسا ہی ہونا ہے..... میں تمہیں سب بتا دیتا ہوں۔"

ایک تیز رفتار جھکڑ اس کے دماغ میں سے ہو کر گزرا۔

"میں فارحہ سے محبت کرتا ہوں۔"

وہ محبت کا لفظ جانتا تھا۔ وہ غلط نہیں تھی۔

"صرف اسی سے شادی کرنی تھی مجھے۔"

کس نے کہا تھا کہ وہ کم بولتا ہے۔

"حالات ہم دونوں کے درمیان ایسے بدلے کہ ہم الگ ہو گئے۔"

"ہم۔" در در راہ ڈھونڈ کر اندر گھسنے لگا۔

"مام جی کی بیماری ان کی خواہش سے مجبور تھا۔"

عاسل مجبور تھا..... بُرا نہیں۔

"مجھے تم سے شادی کرنی پڑی۔ ریان نے کہا اگر میں کسی ضرورت مند خاندان کی لڑکی۔"

ضرورت مند، غریب اور یتیم بھی۔

"میری نیت بری نہیں تھی۔ ارادہ بھی..... بس محبت جو فارحہ سے ہے مجھے۔"

بس محبت ہی..... تو لے ڈوبتی ہے۔

"حالات اتنے خراب ہو گئے اتنے الجھ گئے۔" وہ آہستہ آہستہ اسے بتانے لگا۔ "میں فارحہ کے بغیر نہیں رہ سکتا زینب!"

"اور میں عاسل کے بغیر۔"

آخر اس نے کہہ دیا۔ اونچی آواز میں عاسل کی طرف دیکھ کر..... وہ چونکا اور پھر انجان بن گیا۔ اتنی بڑی بات سن کر بھی وہ انجان بن گیا۔

"میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں دو کروڑ جمع کروا دیے ہیں۔" اس کی بات کا جواب تھا۔

اس نے شادی کے فوراً بعد زینب کو پچاس لاکھ کا چیک بھی دیا تھا۔

"وہ تمہارے ہیں، جیسے چاہو خرچ کرو۔" اس نے بابا کا قرض اتار دیا۔ عاسل نے اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کے پرائیوٹ کالجز میں ایڈمیشن کروا دیے تھے۔ زینب خوشی سے نہال ہو گئی کہ اسے کتنی فکر ہے وہ اس کا شوہر تھا لیکن بابا کی طرح ان کا خیال رکھ رہا تھا۔ آپا کے شوہر کو اچھی فرم میں اچھی پوسٹ پر لگوا دیا تھا انہیں گاڑی اور گھر مل گیا.....

"ڈیفنس میں ایک گھر خریدا ہے تمہارے لیے۔"

"قبرستان میں ایک قبر خریدنی چاہیے تھی۔ وہ نہیں خریدی؟" اس نے سرخ آنکھوں کو رگڑ کر اس سے پوچھا۔ اس نے جواب نہیں دیا، دیکھتا ہی رہا۔

"تم جانتی ہو میں ہمیشہ لائبریری میں سوتا رہا ہوں ..... ہمارا صرف نکاح۔"

اتنی وقعت میری..... میرے جسم کی..... اور میرا دل..... اس کا نہیں سوچا۔

"اتنے پیسے نکاح کے دے رہے ہیں؟" وہ چلائی "صرف نکاح کے لیے اتنے پیسے؟ کتنے پیسے والے ہیں آپ..... مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ ایک سال چند ماہ اتنے پیسے۔ اور دوسری چیزوں کے؟"

عاسل نے لب بھینچ کر اس کی طرف دیکھا۔

"پہلی چیز میری محبت..... دوسری چیز بھی میری

محبت ..... تیسری' چوتھی محبت ..... محبت کے ایک ایک پل کو صدیوں سے ضرب دو..... ان گنت کا حساب نکالو۔ میرے حصے میں آپ آئے؟"

"میں نے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرو۔" وہ تلخی سے بولا اور کھڑا ہو گیا۔

زینب نے دھندلی آنکھوں سے اسے کھڑے ہوتے دیکھا۔

جیسے آپ نے مجھ سے شادی کرلی۔ میں نے آپ سے محبت کرلی۔ اب دیں میرا بقایا مجھے۔" اس نے کھڑے ہو کر اس کے آگے ہاتھ پھیلایا۔

"کہا نا محبت کا نام مت لو۔ یہ تمہارے لیے نہیں تھی۔" اس کی کڑوی آواز گونجی۔

"عاسل خود کو کسی کٹہرے میں کھڑا کریں اور پوچھیں۔

پوچھیں خود سے آپ سے نہ کرتی محبت تو کس سے کرتی؟ ایک بیوی اپنے شوہر سے محبت نہیں کرے گی تو کس سے کرے گی؟ رات دن میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے محبت کسی تیسرے سے کرتی؟" اس کی آواز بلند ہو گئی۔ "ہزاروں لوگوں میں آپ نے مجھے اجازت دی کہ میں آپ سے محبت کروں کیسے نہ کرتی؟"

عاسل نے نظریں کہیں اور ہی ٹکائی ہوئی تھیں۔ عاسل کے اس انداز پر اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور رونے لگی۔

"میرا ہاتھ پکڑ کر آپ نے کہا تھا۔ میں آپ کو اچھی لگی۔"

"وہ جھوٹ تھا۔"

"تو ساتھ یہ بھی بتانا تھا عاسل کہ یہ جھوٹ ہے۔ اسے سچ مت سمجھ لینا۔"

"میں شرمندہ ہوں۔" تنے ہوئے اعصاب اور بے رحم ساکت نظروں کو نہ جانے کس نکتے پر ٹکائے اس نے کہا۔

"میں نے محبت کرلی۔" وہ رونے لگی۔ "غلطی ہی سہی..... مگر مجھے اس کا حل بھی تو بتائیں۔"

"بھول جاؤ مجھے۔" اس نے حل نکال دیا۔

وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ رکنا نہیں چاہتا تھا۔

"عاسل!" اس نے بے غیرت بننا بھی گوارا کرلیا۔

"زینب! تم بہت ضدی ہو۔" وہ اکتا گیا۔

"کیسے؟" وہ حیران ہوئی۔

"میں تمہیں ہر چیز لے کر نہیں دے سکتا۔"

"مجھے ہر چیز نہیں چاہیے۔ جو مانگ رہی ہوں صرف وہی۔" وہ چلائی۔

بہتی آنکھوں کو بہنے دیا اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"ایسا مت کریں..... مجھے طلاق مت دیں۔ میرے ساتھ رہیں عاسل پلیز! میں رہ لیتی اگر آپ کے بغیر رہ سکتی۔ میں دنیا میں ہر کام کو کرنے کے لیے کوششیں کروں گی۔ آپ کے بغیر رہنے کی کوشش کی تو مر جاؤں گی۔"

عاسل نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم پاکستان چلی جاؤ..... جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

اس کے پاس زینب کے ہر سوال کا جواب تھا۔

"کیا میں آپ کو کبھی اچھی نہیں لگی؟"

اس کی نظریں واپس پلٹ چکی تھیں زینب کے تو سوال ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔

"کتنی بار آپ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ مام جی کا دیا ہوا سفید ڈریس جب میں نے پہنا تو آپ نے میری طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ جب میں نے آپ کو ایک شعر سنایا تو آپ نے کہا' وہ میری طرح کا ہے..... آپ نے کہا زینب! تم پاگل ہو..... ایک بار آپ نے میرے گال پر چٹکی لی اور کہا ایک بچہ بھی مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو گا۔ دو بار میں نے آپ کو کافی بنا کر دی اور آپ نے کہا کہ آپ کو ایسی ہی کافی دوبارہ چاہیے..... مام جی جب چپکے چپکے آپ سے میری باتیں کرتی تھیں تو آپ ہنستے تھے آپ نے میری طرف دیکھا جب میں اپنے بال بنا رہی تھی اور وہ مجھ سے بن نہیں رہے تھے آپ نے لیپ ٹاپ کے پیچھے اپنی ہنسی کو چھپالیا۔ ایک بار صبح آپ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے ناشتا کرلیا ہے۔

کتنی بار آپ مجھے دیکھ کر مسکرائے..... کیا وہ سب محبت نہیں تھی؟"

وہ خود نہیں سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اسے کیا کہنا ہے۔ اسے دلائل دینے ہیں یا شکایات کرنی ہیں یا عزت نفس رکھنے والوں کی طرح گردن اٹھا کر وہاں سے چلے جانا ہے۔ وہ وہاں سے چلی جاتی ہم اس کا دل یہ فیصلہ قبول تو کرتا۔

عاسل اندر کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا مطلب اب جاؤ یہاں سے زینب عبدالکلام! کھیل ختم ہوا۔ وہ زینب عاسل سے زینب عبدالکلام ہوئی۔

☼ ☼ ☼

ٹیکسی سے آتے ہوئے وہ کھڑکی کے پار ایسے دیکھ رہی تھی جیسے دریا میں اس کے ایک پاؤں کا جوتا گر گیا ہو اور اسے ایک جوتے کے ساتھ واپس آنا پڑا ہو..... کتنی بکی ہوئی ایک پاؤں میں جوتا پہن کر..... ایک ننگے پاؤں سے چل کر..... اچھا ہوتا وہ دوسرا جوتا بھی اتار پھینکتی۔ یک طرفہ محبت ایک پاؤں میں پہنے جوتے کی طرح ہوتی ہے۔ نہ ٹھیک سے چلا جاتا ہے اور اتارا بھی نہیں جاتا۔

وہ بیڈ کے کنارے بیٹھی تھی۔

وہ کام چور' نااہل لڑکی ایک ہی انداز میں ایک ہی جگہ بت بنی بیٹھی رہی نہ تھکی نہ ٹوٹی۔ سانسوں کی آمد و رفت قدرتی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ میں ہوتی تو انہیں بھی روکے رکھتی۔

بہت دیر بعد اٹھ کر اس نے پردے برابر کیے..... قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر عاسل کی تصویر رکھی تھی اس نے ہاتھ مار کر اسے گرا دیا۔

کوٹ اور مفلر اتار کر پھینکا..... کانوں کے بندے' انگلیوں کی انگوٹھیاں گھڑی' بریسلٹ' جوتے۔

"دو کروڑ اکاؤنٹ میں جمع کروا دیے ہیں۔"

وارڈ روب کھول کر اس نے کپڑے نکالے..... کھڑکی کھولی اور باہر پھینکنے لگی۔ بیگ' جوتے' جیولری گھر والوں کے لیے خریدے تحائف عاسل کے لیے چند چیزیں۔

"ڈیفنس میں گھر۔"

عین کھڑکی کے نیچے بیٹھ کر اس نے اپنا سر تھام لیا۔ اتنی چیزیں دیں ایک خود کو ہی اس انبار میں نہیں رکھا۔

دماغ کی نسیں پھٹنے کے قریب تھیں۔ دولت کے بل بوتے پر کیسی تجارت کی..... اس نے اسے کتنی بری طرح سے خریدا تھا۔ نہ خریدتے ہوئے اسے بتایا نہ پھینکتے ہوئے۔ دونوں طرف کے سودے اپنے ہاتھ میں ہی رکھے۔

اپنی بے وقعتی کا احساس بڑھنے لگا۔ اتنی تذلیل' اتنی بے رحمی' اتنی دھتکار..... اس کا جی چاہا اپنے وجود کو ملیا میٹ کر کے اس دنیا پر تھوک دے اور پھر پوچھے عاسل سے اب خوش ہو؟

"محبت بھی میں نے کی..... جان بھی میں نے دی۔"

☼ ☼ ☼

اس کے پاس چند ہزار پونڈز اور کاغذات تھے۔ عاسل سے آخری ملاقات "خط" بھی وہ اس کے فلیٹ کے دروازے سے اندر ڈال آئی تھی۔ ابھی صبح کے آثار نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ ایک پبلک بوتھ سے اس نے پاکستان اماں کو فون کیا کہ اگلے چند ہفتے وہ اتنی مصروف ہے کہ فون نہیں کر سکے گی۔

فٹ پاتھ پر چلتے اس کی نظر جیسے ہی پہلے شخص پر پڑی اسے روک کر اس نے کہا کہ کیا اس کے پاس اس کے لیے تھوڑا سا وقت ہے؟ اجازت ملنے پر اس نے اسے بتایا کہ وہ لندن میں اکیلی ہے۔ نئی ہے۔ ابھی ابھی آئی ہے..... بے سرو سامان ہے۔ اسے سستی سی کوئی جگہ چاہیے رہنے کے لیے۔ وہ آدمی کھڑا غور سے اس کا مسئلہ سنتا رہا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا اور ایک کیفے تک لے گیا کہ وہ وہاں بیٹھ کر کمپیوٹر پر کرائے کی جگہ تلاش کرے۔ اس نے اسے اچھی طرح سمجھایا۔ زینب نے غور سے سب سنا اسے یاد

رکھا اور چند گھنٹے بیٹھی کمپیوٹر استعمال کرتی رہی۔

چند گھنٹوں بعد ٹرین میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے ناشتا کیا۔

عاسل رات سے جاگ ہی رہا تھا۔ اس نے دوبار ہمت کی کہ وہ زینب کو فون کرے لیکن اس نے سوچا اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہیے۔

شرمندگی کا احساس لیے وہ ساری رات جاگتا رہا۔ اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے دن چڑھنے سے پہلے اس نے زینب کو سڑک پار کرتے دیکھا۔ وہ اسی کے فلیٹ کی بلڈنگ سے نکل رہی تھی۔ وہ فوراً" اپنے بیڈ روم سے باہر نکلا۔۔۔ دروازے کے پاس ہی اسے تہہ شدہ کاغذ ملا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔۔۔ اسے زینب کے انجام پر دکھ ہوا۔ خط پڑھ کر اس نے ایک طرف رکھا اور سر پر ہاتھ رکھ کر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ ماما کا فون آیا۔۔۔ اس نے جھوٹ بولا کہ زینب اس کے ساتھ ہے۔

"تم دونوں میں کوئی لڑائی ہوئی ہے؟"

"نہیں۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"میں اس کے بیڈ روم میں گئی تو وہاں سب کچھ بکھرا ہوا تھا حتیٰ کہ اس کی چیزیں کھڑکی سے پھینکی گئی تھیں۔ اس نے کل بتایا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ ہے رات کو واپس کیوں آئی؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"کیا ہوا ہے عاسل؟ اس کے کمرے کے آثار کسی اچھی بات کی طرف اشارہ نہیں کر رہے۔ اس وقت وہ کہاں ہے۔ اس کا فون بھی یہیں ہے۔"

"اس نے کہا وہ اپنی دوست کے پاس جا رہی ہے۔"

"اس طرح بنا بتائے؟"

"مجھے بتا دیا تھا۔"

"اس کی کون سی دوست بن گئی یہاں۔ اتنے دن وہ میرے ساتھ رہی اس نے تذکرہ تک نہیں کیا۔ تم دونوں کیا کر رہے ہو عاسل! کل تک تو سب ٹھیک تھا۔ آج اچانک۔"

"آج سب ٹھیک نہیں ہے ماما!"

"کیوں۔۔۔ رات ہی رات میں کیا ہو گیا؟"

"ماما! میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔ یہ ہم دونوں کا مسئلہ ہے اسے ہم دونوں تک ہی رہنے دیں۔"

انہوں نے فون غصے سے بند کر دیا وہ اپنے مطلب کی بات کرنے کے بعد کم ہی بولتا تھا۔ عاسل نے سوچا تھا کہ وہ اپنی فیملی کو کوئی بھی کہانی سنا دے گا اور بتا دے گا کہ دونوں ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ فارحہ کے ساتھ شادی کر کے وہ یورپ میں ہی رہنا چاہتا تھا سام جی کی وجہ سے ہی پاکستان جانا پڑتا تھا اب وہ وجہ بھی گئی۔

ان کا ایک آفس برطانیہ میں تھا۔ اتنے دنوں سے وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ زینب نے خط میں لکھا تھا کہ وہ اپنی فیملی کو بتا دے کہ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ چلی گئی ہے۔ عاسل نے دونوں کو ساتھ دیکھ لیا اور طلاق دینے کا سوچ لیا۔۔۔ لیکن عاسل نے یہ وجہ نہیں بتائی۔

عاسل نے ہمیشہ وہ کیا جو اس کا جی چاہا۔۔۔ اس نے اپنی طرز سے ہی محبت کی تھی۔۔۔ فارحہ کے گلے میں باہیں ڈال کر۔۔۔ اس کے ساتھ گھوم پھر کر موج مستی کر کے۔

وہ اس کی تفصیل اور جزئیات سے واقف نہیں تھا۔۔۔ اس نے بری طرح سے فارحہ کو اس وقت یاد کیا جب وہ اس سے دور چلی گئی۔ اس کا انتظار کرنے والی اس کے لیے انتظار بن گئی۔

اسے فارحہ کے آخری الفاظ ہمیشہ یاد رہ گئے کہ وہ ہر ٹھیک کام غلط طریقے سے کرتا ہے۔

وہ اس سے محبت کرتا تھا لیکن ٹھیک طرح سے نہیں کر رہا تھا۔

آزادی کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرتی جاتی ہے اور پھر حد پھلانگ کر آزادی کے زمرے سے بھی نکل جاتی ہے۔۔۔ عاسل کی آزادی بھی حد پھلانگ گئی تھی اور زینب کے نام یہ آزادی کے زمرے سے باہر نکل گئی۔۔۔ وہ ظلم بن گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ فارحہ کے پاس آ گیا وہ آج کل بہت خوش رہتی تھی اس پر بنا کیس جھوٹا ثابت ہو گیا تھا۔ اسے ہرجانے کے پیسے بھی ملے تھے۔ اس کی فیملی نیوزی لینڈ میں رہتی تھی۔

"کیا تم رات بھر جاگتے رہے ہو؟"

"ہاں!" اس نے اقرار کیا۔

"ایسا پہلی بار ہوا ہو گا تمہاری لائف میں۔" وہ ہنسی۔

"ہاں! وجہ نہیں پوچھو گی۔"

"نہیں۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"کیسا ڈر۔۔۔"

"یہی کہ تم کسی اور سے محبت کرنے لگے ہو۔" فارحہ نے قہقہہ لگایا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"ایسے موقع پر کہا جاتا ہے ایسا سوچنا بھی نہیں اگر کوئی اور ہے بھی تو وہ تم ہی ہو۔" وہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ ڈر گیا۔ "ہاں ایسا ہی ہے۔"

تم اتنے سست ہو کہ میرے کہے الفاظ دہرا بھی نہیں سکتے۔" اس نے منہ بنایا۔

آنے والے بہت سے ہفتے اس نے فارحہ کے ساتھ شاپنگ کر کے گزارے۔ ماما پاکستان جا چکی تھیں۔ وہ عاسل اور زینب دونوں سے خفا تھیں۔ زینب سے ان کا رابطہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ عاسل نے فارحہ سے ماما کو ملوانا چاہا پھر ان کا مزاج دیکھ کر ارادہ ملتوی کر دیا۔

عاسل وقت پر اسے ڈنر اور لنچ کروانے لگا اسے گھمانے لگا۔ اس کی بتائی جگہ پر آنے لگا ٹھیک وقت پر۔

"تم روبوٹ بن گئے ہو۔" فارحہ نے کہا۔

"آخر تم سب کو چاہیے کیا؟" اس نے چمچہ پلیٹ میں پٹخا۔ آس پاس والے اس کی اونچی آواز پر چونک گئے۔

فارحہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ واپسی پر اسے اس کے اپارٹمنٹ چھوڑتے وقت اس نے فارحہ سے سوری کر لیا۔ فارحہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

زینب کا لکھا خط کبھی کچن ٹیبل پر ہوتا کبھی لاؤنج کے صوفے پر، کبھی بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل پر۔۔۔ پڑھنا چاہتا پھر رک جاتا۔۔۔ ایسے ہی اس کی نظر اس صوفے کی طرف اٹھ جاتی جہاں وہ بیٹھی تھی۔

"اچھی تھی۔" اس نے خود سے کہا۔

"مجھ سے شادی کر لی۔۔۔ اور چلی بھی گئی۔۔۔ ضرورت مند غریب لڑکی۔"

اس نے ریان کو فون پہ بتایا۔

ریان بہت دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ "سچ بتاؤں۔۔۔ میں نے کئی بار خود پر لعنت بھیجی۔ جو کچھ اس دن آفس میں، میں نے تم سے کہا اور تم نے عمل بھی کر لیا۔"

اس نے تاسف سے گہرا سانس لیا "میں کیا کروں اب۔"

"یہ اب میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔۔۔ اچھا برا کچھ بھی نہیں۔۔۔ تم خود ہی سوچو۔۔۔ وہ کہاں چلی گئی؟"

"معلوم نہیں۔"

"جو آفس میں راستے بھول جاتی تھی۔ اتنی بڑی دنیا کے راستے کیسے یاد رکھے گی۔" ریان نے کہا۔ عاسل نے سن کر فون بند کر دیا۔

چار مہینے گزر چکے تھے۔

فارحہ نیوزی لینڈ جا چکی تھی۔ اسے بھی جلدی آنے کا کہہ گئی تھی آئے دن فون کرتی کب آؤ گے۔ وہ وعدہ کر لیتا مگر جا نہیں پاتا۔

وہ زینب سے ملنا چاہتا تھا۔۔۔ آخری بار اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔۔۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ اسے طلاق دے دے لیکن اس کے گھر نہ بتائے۔۔۔

"میری اماں کہا کرتی ہیں کہ اچھے لوگوں کے ساتھ اکثر برا ہوتا ہے۔ مجھے طلاق ملی تو انہیں یقین ہو جائے گا کہ اچھوں کے ساتھ برا ہی ہوتا ہے۔ میں خود کو اچھا نہیں کہہ رہی۔۔۔ میں اماں کی بات کر رہی ہوں۔ بابا کی موت کا سن کر انہیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا، میری طلاق کا سن کر دوسرا ضرور ہو گا۔ وہ روز رات کو میرے

لیے دو نفل شکرانے کے پڑھ کر سوتی ہیں کہ مجھے ایک ایسا شوہر ملا جس نے مجھے اپنے پروں میں چھپالیا۔ جو لڑکی کونے کھدروں میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔ وہ مسکرانے لگی تھی۔ آپ ہمارے لیے وہ پناہ بن گئے جس میں ہم سب آگئے۔۔۔ ہمیں لگا کہ ہمیں کسی نے بکھرنے سے پہلے سمیٹ لیا' بے گھر ہونے سے بچالیا۔۔۔ آپ کے دیے پیسوں سے میں نے بابا کا قرض اتار دیا۔ آپ نے اتنے دن مجھے اپنے نکاح میں رکھا۔۔۔ اپنے گھر میں مجھے کھلایا' پلایا' کیا نہیں کیا۔۔۔ میں نے آپ سے جھوٹ کہا تھا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ آپ نے میرے خاندان کے ساتھ بہت سی نیکیاں کی ہیں ایک یہ بھی کیجیے گا کہ ابھی میرے خاندان کو طلاق کا مت بتائیے گا میں جب تھوڑی مضبوط ہو جاؤں گی تو خود بتادوں گی۔"

"نیکی۔" کیا اس نے واقعی زینب کے خاندان کے ساتھ نیکیاں کی تھیں۔۔۔ وہ تو احسانات کر رہا تھا ان پر۔

"اس نے قریبی ہوٹلوں' فلیٹوں' کرائے کے گھروں میں معلوم کرنا شروع کردیا' وہ کوئی سامان بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ ہفتے مہینے بن رہے تھے اور زینب کا پتا نہیں چل رہا تھا۔

ناچار اس نے زینب کے گھر فون کیا۔ انہیں فرضی کہانی سُنائی کہ اس کا فون گم ہو گیا ہے۔ وہ کسی دوسرے شہر میں ہے اور اسے زینب کا نمبر چاہیے۔

دانش نے فوراً" ایک نمبر لکھوا دیا۔۔۔ یہ لینڈ لائن نمبر تھا عاسل نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی رہائشی بلڈنگ کے آفس کا نمبر ہے۔ ایڈریس لے کر وہ وہاں آگیا۔ ایڈریس بریڈ فورڈ شہر کا تھا۔

بلڈنگ کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ یہاں دوسرے ممالک سے آئے پیشہ ور رہتے تھے۔ ایک ایک کمرے میں دس دس۔ عاسل نے زینب کا نام بتایا تو اس کے فلیٹ کا نمبر بتا دیا گیا۔ کافی دیر بعد جب وہ بیل دینے کے بعد آفس میں آیا اور زینب کا پوچھا تو کاؤنٹر بوائے نے بتا دیا کہ وہ رات کو واپس آئے گی۔ وہ ذرا فاصلے پر واقع اسٹور میں کام کرتی ہے۔ اسٹور کا پوچھ کر عاسل وہاں آگیا۔ اسٹور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ عاسل نے جلد ہی اسے ڈھونڈ لیا۔

وہ ایک ریک میں چیزیں رکھ رہی تھی۔ دو اور لڑکیاں اس کے ساتھ تھیں۔ نیلی جینز اور سفید شرٹ میں۔ سر پر سفید ہی کیپ تھی' گلے میں ورکر کارڈ جھول رہا تھا۔ اس کے انداز اور چہرے پر اتنی سختی تھی جیسے وہ انسان نہ ہو۔ وہ اسے دیکھ کر پلٹ آیا۔ اسٹور کی پارکنگ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔

رات ہوئی تو وہ باہر نکلی۔ وہ گاڑی سے باہر نکل کر اس کے پیچھے آیا۔ زینب کی اس پر نظر پڑی تو وہ تیز تیز چلنے لگی۔

"زینب! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اس نے جیسے سُنا ہی نہیں۔

عاسل نے اس کا بازو پکڑ کر روکنا چاہا۔

"میں سُن رہی ہوں۔ مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔" اس نے جھٹکے سے بازو الگ کیا۔

وہ تذبذب کا شکار تھا ایسے کیسے راہ چلتے کہہ دے۔ وہ بس اسٹاپ پہنچ گئی۔ اس نے روبوٹ صورت لیے زینب کو دیکھا کہ یہ وہی ہے جو چند ماہ پہلے اس کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔

"زینب! میں نے بہت بُرا کیا۔۔۔ میں نے تمہاری آسان زندگی کو مشکل بنا دیا۔۔۔ تم واپس اپنے گھر چلی جاؤ۔۔۔ انہیں سب بتادو۔۔۔ اس طرح تم ان سب کے ساتھ تو رہو گی۔۔۔" وہ کہہ نہیں سکا کہ یہاں جاب نہ کرے اور اس کے دیے پیسے استعمال کرلے۔

"اور۔۔۔ مجھے معاف کردو۔۔۔ پلیز۔"

زینب نے پل کے پل اس کی طرف دیکھا۔

"میں شرمندہ ہوں زینب!"

زینب کی بس آچکی تھی وہ بڑھ کر اس میں بیٹھنے لگی "آپ یہاں مجھ سے صرف معافی مانگنے آئے ہیں؟" وہ پلٹی۔

اس نے سر کو ہاں میں حرکت دی۔

چند ساعتیں وہ عاسل کو دیکھتی رہی پھر بس میں چڑھ گئی۔۔۔ اس کی طرف رخ موڑ کر وہ کہہ گئی تھی۔

"میں نے آپ کو معاف کیا۔ دوبارہ کوئی اور سوال لے کر مت آنا۔"

"کوئی اور سوال۔۔۔؟"

بس کی سیٹ پر بیٹھ کر زینب نے اپنے گھومتے سر کو تھاما' وہ بے وقوف یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس اپنی محبت کا سوال لے کر آیا ہے۔ وہ تو اپنے ضمیر کا سوال لے کر آیا تھا۔ اس کا ضمیر زینب کے لیے جاگ اٹھا تھا صرف دل ہی مردہ تھا۔

رات گئے عاسل نے "کوئی اور سوال لے کر نہ آنا" پر سوچا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس سے اس کا کیا مطلب تھا۔۔۔ اس نے اس کے خط کو جو یہاں وہاں ہر جگہ اسے نظر آجاتا تھا' جلا دیا۔ چائے بناتے ہوئے اسے بھی آگ پر رکھ دیا۔ معافی اس نے مانگ لی تھی۔ بس سب ہو گیا۔

آفس میں کام بہت تھا۔ اس لیے وہ چاہ کر بھی فارحہ کے پاس نہیں جاسکا۔ اس نے اب کہنا ہی بند کردیا تھا روز ان کی فون پر بات ہو جاتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنا سامان پیک کر رہا تھا کہ جیسے ہی فارغ ہوگا' اگلی فلائٹ سے فارحہ کے پاس چلا جائے گا۔

فارحہ کو جیولری کے نام پر اس کی دی انگوٹھی بہت پسند تھی پھر بھی اس کے لیے بریسلٹ لے لیا۔ وہ جو غلطیاں کرچکا تھا انہیں بھلا کر اپنی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ جتنی رنگین' پُر آسائش اس کی زندگی شروع ہوئی تھی' اتنی ہی بے رنگ اور بے آرام ہوتی جا رہی تھی۔ بے تحاشا دولت اور حسن کے باوجود وہ اپنی گرل فرینڈ کو خوش نہیں رکھ سکا۔۔۔ وہ ڈھنگ سے محبت نہیں کرسکا' رشتے بنا لیتا تھا۔۔۔ نبھانا بھول جاتا تھا۔

ڈیڈ نے کئی بار اسے فون کرکے پوچھا کہ دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے۔ لیکن وہ بات کو گول مول کر دیتا پہلے اسے جاکر فارحہ کی فیملی سے ملنا تھا پھر وہاں ماما اور پاپا کو لے کر جانا ہے اور پاکستان جاکر زینب کو طلاق دینی تھی۔

موقع ملتے ہی وہ نیوزی لینڈ چلا گیا۔ فارحہ کا خاندان اسی کے انتظار میں تھا۔ اس کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ فارحہ اسے لیے جگہ جگہ گھومتی۔۔۔ اس کے ساتھ فیملی لنچ' ڈنر کیے جا رہے تھے۔

فارحہ اس کے ساتھ بہت خوش رہتی۔ کسی بات پر بُرا بھی مان جاتی تو ظاہر نہ کرتی۔۔۔ اس کا بات بات پر غصہ کرنا ختم ہو چکا تھا۔ غصہ کرتی تو خاموش ہو جاتی' اس کا خاص خیال رکھتی۔

لندن تک تو سب ٹھیک تھا۔ نیوزی لینڈ آکر اسے سونے کے لیے نیند کی گولی کھانی پڑتی۔ فارحہ ناراض ہوتی کہ وہ نیند کی گولی کیوں استعمال کرتا ہے وہ اسے کیا بتاتا اسے خود نہیں معلوم تھا۔

اس دن وہ فارحہ کے ساتھ واک کر رہا تھا کہ ایک جھکی کمر والی بوڑھی عورت دو شاپنگ بیگز لیے دور سے نظر آئی۔۔۔ فارحہ بھاگ کر گئی اور اس سے بات کر کے واپس آگئی۔

"مارتھا آنٹی ہیں۔۔۔ غلط سڑک پر آگئی تھیں۔ کارنر پر ان کا گھر ہے اور اس روڈ پر آگئیں۔ بھول جاتی ہیں۔"

فارحہ بتاتی رہی۔۔۔ اس نے سنا ہی نہیں۔

فارحہ کے بیڈ روم میں ایک تصویر تھی مارشل کی۔۔۔ اس نے کہا کہ بے شک وہ ناراض ہو لیکن شادی کے بعد وہ اس تصویر کو اپنے ساتھ ضرور لائے گی۔

"یہ مت پوچھنا کیوں۔۔۔ مجھے خود نہیں معلوم کیوں' اس کے خاندان نے بالکل ٹھیک مقدمہ کیا تھا مجھ پر۔۔۔ میں نے ہی اسے مار ڈالا۔۔۔ یک طرفہ محبت کا بوجھ وہ اکیلا اٹھا ہی نہیں سکا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور وہ مر گیا۔۔۔ جتنی دیر تک وہ اسپتال میں رہا۔ میں دعا کرتی رہی کہ مجھے ایک اور موقع مل جائے۔"

وہ روانی میں کہہ گئی اور پھر چپ کرکے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ایک موقع؟" عاسل نے الفاظ پر غور کیا۔ "اگر تمہیں وہ موقع مل جاتا فارحہ۔۔۔ تو تم کیا کرتیں؟"

"میں اس کے ساتھ ہوتی۔۔۔ اس سے محبت بے شک نہ کرتی لیکن اس کی محبت کا قرض ضرور اتارتی

..... اور پھر محبت بھی ہو ہی جاتی ..... جس دل میں ہمارے لیے اتنی بے تحاشا محبت ہو..... کیا اس دل سے محبت نہیں ہوتی..... کیا اس دل پر پیار نہیں آتا؟

آجاتا ہے، آگیا تھا۔ مارشل کے جانے کے بعد اس دل پر پیار آگیا تھا۔"

ایک مر چکا تھا ایک مر رہا تھا۔

دو میں سے ایک نے مار دیا تھا ایک مرنے کے لیے چھوڑ آیا تھا۔



"اس نے میرے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے ..... ایسے اور اس نے کہا کہ "میں رہ لیتی..... اگر رہ سکتی لیکن میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

میرا دل چاہا کہ میں اس کے ہاتھ تھام لوں..... لیکن میرے دماغ میں تم تھیں..... تمہیں نظرانداز کیسے کرتا ..... مجھے اس کے رونے پر پہلے حیرت ہوئی، وہ مجھ سے کب اتنی محبت کرنے لگی تھی..... اس نے کہا "آپ سے نہ کرتی تو کس سے کرتی؟"

"میں تم سے صرف ایک بار ملنا چاہتا ہوں!" عاسل نے زینب کو میسج کیا۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ اس طرح راضی نہیں ہوگی ملنے پر "صرف ایک آخری بار" اگلا میسج کیا۔

کئی راتیں اسے میسج کرتا رہا..... فون کرتا رہا..... گھنٹوں بعد اس کا فون آن بھی ہو جاتا تو اٹھایا نہ جاتا۔ وہ زینب کے میسجز کو بنا پڑھے ہی مٹا دیا کرتا تھا ۔اسے یقین تھا کہ زینب بھی ایسا ہی کر رہی ہوگی۔

ایک رات اس نے اسے ایک ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھا تو لپک کر اس کے پاس گیا "میری بات سنو زینب!"

زینب کے اعصاب اسے دیکھتے ہی تن گئے۔ سختی آنکھوں میں در آئی ۔وہ تیز تیز چلنے لگی۔ عاسل کو بہت برا لگا۔ تیز تیز چلتی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی..... غصے میں عاسل واپس آگیا۔ اس نے سوچا کہ اس کی طرف سے مرے یا جیے زینب۔

چند ہفتے اسے مرنے یا جینے کے لیے چھوڑنے کے بعد وہ پھر اسی ہوٹل کے باہر تھا جہاں وہ جاب کرتی تھی۔

"زینب!" اس نے اسے آواز دی۔ "میری بات سن لو۔"

"آپ نے مجھے ابھی تک طلاق نہیں دی؟" الٹا زینب نے اسے اپنی بات سنا دی۔

ہکا بکا وہ اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا "تمہیں طلاق چاہیے مجھ سے؟"

"اور آپ مجھے کیا دے سکتے ہیں؟" سوال جائز تھا۔ لاجواب ہو کر وہ پلٹ آیا۔

"ٹھیک ہی کہا زینب نے اور میں اسے کیا دے سکتا ہوں۔"

"مجھے اگلو سا ہو گیا بار بار اس کی اس التجا پر کہ اسے عاسل چاہیے۔ میں نے عہد کر رکھا تھا کہ میں ہر صورت تمہیں اپناؤں گا۔ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا اور میں یہ نہیں جان پا رہا کہ یہ سب میں احساس میں کرنا چاہتا ہوں یا محبت میں ہمیں نے اس کا احساس کیا نہ ہی محبت، پھر بھی سب کچھ جان لینے پر اس کا ایک ہی مطالبہ تھا میں ہوتا تو کبھی ایسا مطالبہ نہ کرتا۔ مجھے بہت دیر میں یہ باتیں سمجھ میں آرہی ہیں۔ تم ٹھیک کہا کرتی تھیں میں صرف "آئی لو یو" ہی کہتا ہوں..... میں لو کرتا نہیں ہوں..... کیسا انسان ہوں میں..... ہر بار نقصان ہونے پر ہی سوچتا ہوں۔"

فارحہ نے گہری ٹھنڈی آہ کی صورت ہی رد عمل ظاہر کیا بس..... اس کی آنکھیں چھلکنے کے قریب تھیں۔

آج وہ اس کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑا تھا۔

"میں نے فارحہ سے شادی نہیں کی۔" اس پر نظر پڑتے ہی اس نے جیسے اسے خوشخبری سنائی۔ اس نے اپنی نظریں بدلیں اور چلی گئی۔ ہر تیز انگلی کے اشارے پر مل جانے والے عاسل کو اس کا یہ انداز برا لگا۔ اس نے غصے سے کار کا دروازہ بند کیا اور فارحہ کے پاس جانے کا سوچا..... اس کا خیال تھا کہ وہ مسکرا کر ایک

دوبار زینب کی طرف بڑھے گا تو وہ بھاگ کر اس کے ساتھ چلنے لگے گی۔

لیکن چند ہی دنوں میں اس کا غصہ جاتا رہا۔ وہ جس نے صرف ایک آخری ملاقات اور صرف ایک ہی بات زینب سے کرنی تھی' وہ پھر اس کے گھر کے باہر تھا۔

"عاسل! آپ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔" اسے دیکھتے ہی زینب بولی۔

"تم نے کہا تھا۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔"

"جھوٹ کہا تھا۔"

"تو ساتھ یہ بھی بتانا تھا کہ جھوٹ ہے۔"

"اب بتا رہی ہوں۔"

"اب تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"ابھی تو سچ بولنا سیکھا ہے۔" نظریں بدلیں اور بات ختم۔

غصے کے شدید احساس کو لیے عاسل وہاں سے آگیا۔

وہ بار بار اس کے پاس کیوں جا رہا ہے۔ کیوں..... کیوں.....

"میں نے دو لوگوں کو محبت کرتے دیکھا تھا فارحہ..... اور کسی ایک کو بھی خوش نہیں رکھ سکا۔ نہ ہی خود خوش ہوا..... میں تم سے ہی محبت کرتا تھا فارحہ! میرا یقین جانو..... اور ایسا بھی نہیں ہے کہ اب میں زینب کے لیے پاگل ہو گیا ہوں..... لیکن میرے لیے اس کے پاس جو محبت ہے اس نے مجھے دیوانہ ضرور بنا دیا ہے۔"

فارحہ نے آخری لفظ سُن لیا تھا محبت۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... لیکن میں زینب کا کیا کروں..... وہ جو بن گئی ہے۔ میری ہی وجہ سے بنی ہے..... میں نے اس سے کہا کہ مجھے معاف کر دے اور اس نے کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ کوئی اور سوال لے کر نہ آنا۔"

"اس نے تم سے ایسا اس لیے کہا کہ وہ چاہتی تھی کہ تم اس کے پاس پہلا سوال محبت کا لے کر جاتے..... اور تم معافی مانگ آئے۔"

عاسل نے چونک کر فارحہ کی طرف دیکھا تھا۔ یہ بات اس نے نہیں سوچی تھی۔

وہ فارن یونیورسٹی کے امتحانات میں فیل ہو جاتا یا اپنے بزنس کا دیوالیہ کر دیتا تو اچھا تھا' لیکن ایک انسان اس سے کیا چاہتا ہے' یہ جاننا سیکھ لیتا..... وہ احساسات کو پڑھنا سیکھ جاتا۔

زیادہ خوب صورت نہ ہوتا لیکن زیادہ محبت کرنے والا ہوتا۔

زیادہ پیسے والا نہ ہوتا لیکن زیادہ خیال رکھنے والا ضرور ہوتا۔

اور نہیں تو خود کو بھی جان جاتا کہ اسے کیا چاہیے۔

اسے ٹھیک سے معلوم ہی نہیں تھا کہ زینب کے پاس بار بار کون سی بات کرنے کے لیے جا رہا ہے.....

فارحہ کے بیڈ روم میں مارشل کی تصویر لگی رہی..... اس نے کہا کہ مارشل کا اتنا تو حق بنتا ہے نا کہ وہ تصویر کی صورت ہی کہیں دکھائی تو دے..... اور زینب کا کتنا حق بنتا ہے..... وہ بھی اس کی کوئی تصویر نکال لے..... کسی دیوار سے ٹانگ دے..... ہو گیا حق ادا.....؟

اکاؤنٹ کی رقم بڑھا دے..... تین چار گھر اور لے دے..... کیا کرے.....؟

وہ اس کی محبت کی قیمت ادا نہیں کر سکتا تھا۔ کئی دن اور شامیں وہ اس کی تیز چال کے ساتھ چلتے اس سے بات کرنے کا خواہاں رہا..... اسے دیکھتا تو رک جانے کی منت کرتا اور اصل بات چاہ کر بھی نہ کر سکتا۔

"میں تم سے محبت کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے ایک دم اس کے قریب جا کر کہا اچانک..... اچھا تو اتنے مہینوں سے وہ یہ کہنے کے لیے اس کے پیچھے آ جا رہا تھا..... اس پر بھی اسی وقت انکشاف ہوا۔

زینب اس پر بھی نہیں رکی۔ وہ حیرت سے اسے جاتا دیکھتا رہا..... اسے لگا زینب نے اسے دھتکار دیا۔

واپسی پر فارحہ نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ خطرناک حد تک خاموش ہو گئی۔ نہ کوئی سوال نہ منت..... ہر چیز کے لیے بہت دیر ہو چکی تھی..... وہ فارحہ سے کہہ کر آیا تھا کہ وہ آئے گا مگر وہ تو ایک بار پھر صرف زینب سے ملنے جا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں واضح بے یقینی تھی۔ اس نے پھر بھی عاسل سے کوئی وعدہ نہیں لیا۔

اسے زینب کا ہر رویہ حیران کر رہا تھا۔

جب ہاتھ جوڑے وہ سوال کر رہی تھی۔ وہ جواب دینے کے لیے تیار نہیں تھا..... اب لپک لپک کر وہ سوال کر رہا تھا تو وہ بھاگ رہی تھی..... بات اتنی معمولی بھی نہیں تھی..... یہ واقعہ نہیں' زینب کے لیے سانحہ تھا..... نکاح کے نام پر خریدے جانے والا تھپڑ بہت زور سے اسے لگا تھا۔ یک طرفہ سودے کی بازگشت اسے بھولتی ہی نہیں تھی۔ اگر وہ اس کی ہوئی تھی تو صرف ایک اس جملے سے کہ وہ اسے اچھی لگی۔

اس بار وہ بن ٹھن کر اس کے پاس گیا۔ گاڑی میں پھول بھی رکھے تھے۔ وہ اسے کہنے جا رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گھر نہ چلے لیکن ڈنر تو کر سکتی ہے نا..... کبھی کبھی مل تو سکتی ہے نا..... یہ ٹھیک ہے..... اس طرح وہ اس سے دوستی کر لے گا..... وہ بلڈنگ سے باہر نکل رہی تھی' اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ہے' وہ دوڑ کر اس کے پاس گیا۔

"یہ کون ہے؟" اس نے غصہ دبا کر کہا۔

"جب آپ فارحہ کے ساتھ تھے تو میں نے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے۔"

"زینب!" اس نے انگلی اٹھائی..... "اگر تم مجھے جیلس کر رہی ہو تو بھی یہ ٹھیک نہیں۔ اٹس ٹو مچ ناؤ۔" وہ دھاڑا۔

دونوں کے درمیان کھڑا وہ گورا لڑکا حیرت سے عاسل کی طرف دیکھنے لگا۔

"چلائیں مت کیونکہ آپ کے پاس یہ حق نہیں ہے۔"

"تم میری بیوی ہو..... ابھی بھی۔" وہ چلایا۔

"چلو میرے ساتھ۔" اس نے ان سنی کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس لڑکے کی طرف منہ کر کے کہہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر جا رہا ہے۔ زینب نے ہاتھ آزاد کروانے کی لاکھ کوشش کی۔ منہ بگاڑا۔ چلائی لیکن اسے گاڑی میں بٹھا کر وہ اپنے ساتھ لے آیا۔

اسی گھر میں جہاں سے وہ نکلی تھی۔ لاؤنج کے صوفے پر گر کر وہ رونے لگی..... آس پاس نظر آنے والی ہر چیز اس نے پھینک دی..... عاسل نے اسے کرنے دیا جو وہ کر رہی تھی۔ اس کا رونا اسے سمجھا رہا تھا کہ اس نے کتنی اذیت جھیلی ہے۔ اس کا غصہ گواہ تھا کہ عاسل نے زبردستی اسے اپنی زندگی میں سے نکالا اور اپنی ہی مرضی سے کھینچ کر لے آیا.....

کئی بار عاسل نے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کرنے چاہے مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ ہر بار اس کی طرف غصے سے دیکھا۔ اس نے اسے پانی پلانا چاہا..... کھانا کھلانا چاہا لیکن وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"زینب..... مجھ سے کچھ کہو گی نہیں..... اپنی لکھی ہوئی شاعری؟"

زینب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا غصے سے..... وہ ہنس پڑا تو زینب نے اٹھ کر لاؤنج کی باقی ماندہ چیزیں بھی پھینکنی شروع کر دیں۔ آنسو تیزی سے باہر آنے لگے۔

"بس..... بہت ہو گیا۔"

عاسل اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر آنسو صاف کرنے کے بجائے اپنے دونوں بازوؤں کی گرفت میں اسے لے لیا۔ مضبوطی سے نہ چھوڑنے کے لیے۔

"محبت کی دو صورتیں ہیں زینب!" عاسل نے اپنی گرفت مضبوط کی "ایک محبت کرنا..... ایک محبت کو قبول کرنا..... تم مجھ سے محبت کرتی ہو..... یہ تمہاری صورت ہے..... میں تمہاری محبت کو قبول کرتا ہوں..... یہ میری صورت ہے۔ جلد ہی میں تمہاری صورت بھی اپنا لوں گا۔ میرے ساتھ رہو' پاس رہو۔ برا ہوں اچھا ہو جاؤں گا۔ نادان ہوں' سمجھ دار ہو جاؤں گا..... جلد ہی۔"

اور زینب کو یاد آگیا تھا۔ مام جی نے کہا تھا۔ "معاف کرنا سیکھ جاؤ۔ جو بیوی معاف کرنا سیکھ جاتی ہے..... بہت سکھی زندگی گزارتی ہے۔"

☼

صباحت یاسمین



جامن کا عمر رسیدہ درخت حیران سا تھا اور کافی حد تک متفکر بھی۔ جس چیز کی ٹن گن لینے کی وہ کوشش کررہا تھا وہ اسے سنائی دیتی تھی نہ دکھائی۔

ایسا بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ حیرت سے سوچتا اور پھر اسے صوفی ولا کے مکینوں کی ذہنی حالت پہ شبہ ہونے لگتا۔ اپنی جگہ پہ وہ ٹھیک ہی تھا۔ بھلا صوفی صاحب کے گھر والوں کو اس سے بہتر کون جانتا تھا سارے بچے اس کے سامنے پل کر جوان ہوئے اور بعد ازاں بال بچوں والے بھی ہوئے۔ صوفی صاحب کی زوجہ نے بھی اس کے سامنے ہی دلہن کے روپ میں اس آنگن میں قدم رکھا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس دلہن کے بالوں میں چاندی چمکنے لگی تھی۔

وہ ان سب کا مزاج آشنا تھا۔ اسے بخوبی پتا تھا کہ بڑی بیٹی بڑی ہمدرد اور نرم مزاج ہے منجھلی غصے کی بہت تیز اور جلد باز سی اور چھوٹی عقل مند تھی مگر کوئی اس کی عقل والی باتیں بھی سنتا نہ مانتا تھا کیونکہ وہ چھوٹی تھی سب سے ہی چھوٹی۔

بیٹوں میں سب سے بڑا ایک اچھے عہدے پر فائز تھا مگر سب جانتے تھے کہ وہ بیوی کے ماتحت ہے۔ دوسرے نمبر والا سب سے زیادہ دولت مند تھا حاجی اور نمازی بھی مانتا وہ بھی بیوی کی تھا پر اس کی بیوی اتنی ہوشیار تھی کہ سب کے سامنے مظلوم اور معصوم بنی رہتی مگر در پردہ حکمرانی اسی کی تھی۔ نصیبوں کا مارا بے چارہ تیسرے نمبر والا اس کی تو کوئی ویلیو ہی نہ تھی۔

سب سے غریب جو تھا۔ حالانکہ ایک وہی تو تھا جو ہر ایک کی بے لوث خدمت کرتا وقت پڑنے پر سب کے کام دوڑ دوڑ کر کرتا مگر اس کی قدر پھر بھی نہ تھی۔ چوتھے نمبر والا ذرا کم گو اور سنجیدہ طبیعت کا تھا مگر اس کی بیوی لاابالی امیچور اور بے وقوفی کی حد تک سادہ دل تھی۔ مزاجوں کے فرق کی وجہ سے ان دونوں میں اکثر ہی ٹھنی رہتی حالانکہ وہ لڑکی حقیقتاً "سب سے اچھی بہو تھی" سب کا خیال کرتی گھر کو چمکا کر رکھتی۔ بھانجے بھانجیاں بھتیجے بھتیجیاں ساس سسر دیور جیٹھ۔ سب ہی اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ مگر جامن کے درخت کی سوئی تو چھوٹی بہو میں اٹکی تھی۔

درمیانے سے قد بلکہ قریب قریب کوتاہ قامت والے سب سے چھوٹے لڑکے کے ساتھ وہ پستہ قد سی لڑکی خاصی جچتی تھی۔ اس کے کان بڑے بڑے تھے اور چہرے کے اطراف میں باریک مگر لمبے لمبے روئیں تھے خیر گورا رنگ سب عیب چھپا لیتا ہے کچھ وہ تیز طرار بھی بے حد تھی لمبے کانوں اور روئیں کو چھپانے کے لیے کس کے دوپٹا لپیٹے رہتی یوں یہ دونوں چیزیں بھی چھپ جاتیں اور وہ سب سے واہ واہ بھی پاتی۔

بڑی عمر کے تجربہ کار جامن نے اس کی فطرت تب ہی بھانپ لی تھی جب وہ بھاری بھر کم لہنگا پہنے شہر کے مہنگے ترین پارلر سے ڈھیر سارا میک اپ کروائے دہلیز کے اندر قدم رکھ رہی تھی۔ مگر حیرت بلکہ سوا حیرت کا مقام یہ تھا کہ شادی کو خاطر خواہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس نے گھر کے کسی فرد سے اس کی کوئی برائی نہ کی وہ اسی بات پہ پریشان تھا۔ ایسا تو ممکن نہیں کہ صوفی ولا کے مکین اس کی فطرت سے آگاہ نہ ہوئے ہوں۔ اچھے خاصے دنیا ساز لوگ تھے۔ کئی سمدھیانے بھگتا چکے تھے۔ آنکھ کان نظر بھی رکھتے تھے مگر پھر بھی خاموش تھے۔ یہ صورت حال اچھی ہو یا بری مگر جامن کے درخت کا تو اطمینان غارت ہو کر رہ گیا تھا جب بھی وہ دو لوگوں کو اکٹھے دیکھتا یہی سوچتا کہ اب کوئی بات ہوگی۔ کوئی کچھ کہے گا چھوٹی بہو کے متعلق اور میں مطمئن ہوجاؤں گا۔ مہینوں کی بے اطمینانی ختم ہوجائے گی۔ مگر ایسی صورت حال پیدا ہی نہ ہوئی تھی اور وہ مزید سے مزید تر بے چین ہوجاتا۔ اگرچہ ایسا نہیں تھا کہ وہ لوگ ہر وقت ایک دوسرے کی بدخوئیاں ہی کرتے رہتے تھے مگر کوئی نہ کوئی بات تو ہو ہی جاتی ہے اور کسی ایک کو دل کے دکھڑے سنانے کے لیے اچھا سامع تو چاہیے ہوتا ہے۔ یہاں سب طرح کی باتیں ہوتی تھیں مگر چھوٹی بہو کی بات کوئی نہ کرتا اسی لیے وہ بے چین تھا بری طرح بے چین۔

"میں بھی انسانوں کی دنیا میں رہ کر انسان ہی ہوگیا ہوں ورنہ یہ تو اچھی بات ہے کہ کوئی بات نہیں



ہوتی۔"
گہری خاموشی کے ساتھ سوچتے ہوئے وہ شرمندگی میں ڈوب جاتا۔ مگر شاید وہ واقعی انسان ہو گیا تھا جب ہی فوراً "ندامت سے نکل آتا اور اس کا ذہن پھر سے اسی الجھن میں الجھ جاتا چلو زبان سے برا نہ کہیں دل میں ہی برا بھلا کہہ لیں اسے۔۔۔ لگتا ہے کہ بھول بیٹھے ہیں کہ ہم سسرالی ہیں۔
لاڈلی بہو کے لاڈ اٹھاتے اٹھاتے تھکتے ہی نہیں۔
اچھا چلو نہ تھکیں دل میں پیار تو کم ہو سکتا ہے نا؟ آنکھوں کی محبت تو ماند پڑ سکتی ہے نا؟
وہ ایک ہی بات کو مختلف زاویوں سے سوچتا مگر اسے یہی دیکھنے کو ملتا کہ منہ زبانی بھی لاڈلی بہو کے ناز اٹھائے جاتے ہیں اور دلوں میں بھی اس کو ایک مقام دیا گیا ہے۔
"بڑے پکے ہیں!" وہ صدق دل سے گھر والوں کے عزم کو داد دیتا۔ اصل میں چھوٹا بیٹا بہت ہی لاڈلا تھا۔ گھر میں سیکنڈ لاسٹ نمبر تھا اس کا، صرف عقل مند بہن اس سے چھوٹی تھی تو شادی کی رسموں کی پلاننگ کے ساتھ ساتھ ہر ایک نے عہد کیا تھا کہ وہ چھوٹی بہو کو ہمیشہ لاڈلا رکھیں گے، ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھیں گے۔ "پتا نہیں کب تک میرا اطمینان یونہی غارت رہے گا۔"
بڑی سی چادر میں ملفوف لاڈلی بہو پھدکتی ہوئی اس کے سامنے سے گزری تو اس نے بے چینی سے سوچا تھا۔



"انکل!" حسب عادت اس نے دھیمی مگر سپاٹ آواز میں صوفی صاحب کو پکارا۔ جامن تلے تخت بچھا کر بیٹھی تسبیح رولتی زوجہ صوفی صاحب نے پہلو بدلا۔ انہیں برا ہرگز نہیں لگتا تھا مگر امید تھی کہ وہ کسی دن صوفی صاحب کو ابو جی نہ سہی تو انکل جی ضرور ہی کہے گی اگرچہ تاحال وہ صرف انکل کہنے پر اکتفا کرتی تھی۔
"جی بیٹا!" صوفی صاحب ہلکے سے تبسم کے ساتھ لاڈلی بہو کی جانب متوجہ ہوئے، جامن کا درخت ہمہ تن گوش ہو گیا۔ یوں تو لاڈلی بہو کی پھینی سی ناک پہ ہمیشہ بیزاری سجی رہتی مگر آج تو اس ناگواری کی چھب ہی اور تھی۔ جامن کا درخت ایک دم ہی بہت مشتاق ہو گیا۔
"وہ کہہ رہے تھے جہیز کا فرنیچر گھر میں ہی رہنے دو، لمبا راستہ ہے ٹوٹ پھوٹ ہو جائے گی اب تو انہوں نے فرنشڈ اپارٹمنٹ لے بھی لیا ہے۔۔۔ آپ کی سب مانتے ہیں، سمجھا دیجیے گا میرے بیڈ پہ کوئی نہ بیٹھے نہ ہی میری غیر موجودگی میں میرے صوفوں، کرسیوں کو رگیدنے کی ضرورت ہے۔۔۔ سخت بیزاری ہے مجھے اس سب سے۔ اور آپ ایک ہی دفعہ ٹھیک سے سمجھائیے گا سب کو شکایت کا موقع نہ ملے۔"
بات پوری کر کے وہ ایک لحہ کو بھی نہ رکی۔ صوفی صاحب کا تبسم کہیں گم ہو گیا تھا مگر ہونٹ مقفل ہی رہے۔ زوجہ صوفی صاحب نے نگاہ ترچھی کر کے انہیں دیکھا۔
"جو ایک بار خاموشی سے سن لیتا ہے اسے پھر ساری عمر چپ چاپ سننی ہی پڑتی ہیں۔" تسبیح کے دانے رولتے انہوں نے تاسف سے سوچا۔
وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے بیٹھے رہے۔ لاڈلی بہو کو ہمیشہ لاڈلی رکھنے کا ان کا عزم تو نہیں ٹوٹا تھا پھر بھی جامن کے درخت کو کچھ چٹخنے کی آواز واضح سنائی دی۔ دو بوڑھے محبت بھرے دل ایک ساتھ ٹوٹ گئے تھے۔ زبان سے تو اس نے لاڈلی ہی رہنا تھا مگر کانچ سے دل کی محبت میں آن ہی آن میں ڈھیروں لکیریں آ گئیں۔ جامن کا درخت اب مطمئن تھا۔ بے حد مطمئن۔



ناولٹ



آمنہ ریاض



"ہمارے مذہب میں پسند کی شادی کی سخت ممانعت کی گئی ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں۔ ہمارے خیال میں اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کو کم از کم چالیس کوڑے تو ضرور لگنے چاہئیں۔"

عبدالباقر لودھی نے حسب عادت اپنی چھڑی پر دونوں ہتھیلیاں مضبوطی سے جما کر ٹی وی پر دکھائے جانے والے ایک نہایت ہی بکواس ٹاک شو کو بے حد انہماک سے دیکھتے ہوئے جس وقت یہ "ایمان افروز" بیان جاری کیا۔ اس سے ٹھیک چند لمحے پہلے دوسرے صوفے پر نیم دراز اخبار میں سر دیے کر بیٹھے تقی نے کوک کا ایک بڑا سا گھونٹ منہ میں بھرا ہی تھا۔ اب ہوا کچھ یوں کہ ادھر ابا جی کے خیالات سماعت سے ٹکرائے، ادھر گلے میں زبردست پھندا لگ گیا۔

فوارے کی صورت میں کوک اخبار پر گری اور چند چھینٹے شرٹ اور صوفے پر۔

لودھی صاحب مستقل کڑی نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔

"س س..... سوری ابا جی..... سوری۔"

اس نے جلدی جلدی ٹشو پیپر نکال کر صوفہ صاف کیا۔ شرٹ پونچھی۔ گیلا اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھا۔ پھر ابا جی کی طرف دیکھا تو وہ ابھی بھی خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔

وہ اور بھی شرمندہ ہو گیا۔

"تھوڑی تہذیب سیکھو تقی!" انہوں نے اپنے مخصوص ڈھنگ لہجے میں کہا اور نظریں ٹی وی اسکرین پر مرکوز کیں۔

"تمہارا تو پڑھا لکھا بھی کسی کام نہیں آ رہا.....



نالائق کے نالائق..... ہونہہ۔" وہ کہہ کر لاتعلق ہو گئے۔

معذرت کر لینے کے باوجود ایسا طعنہ..... تقی کے سر پر لگی، تلووں میں بجھی۔

"ابا! اگر آپ کو برا نہ لگے تو جو بات آپ ابھی کہہ رہے تھے۔ اسے دوہرا دیں۔ میں سن نہیں سکا۔"

سرسری لہجے میں کہتا وہ در حقیقت کمر کس کر میدان میں اترا تھا۔

"اپنے کانوں کا علاج کرواؤ۔" تڑخ کر جواب آیا۔

"ٹھیک ہے جی..... آج ہی کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔" اس نے سعادت مندی سے کہا۔ "لیکن ابھی تو آپ بات دوہرا دیں۔ ممکن ہے کچھ فائدہ مجھ نالائق کا بھی ہو جائے۔"

عبدالباقر لودھی نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا اور چونکہ وہ اپنی نالائقی کا اعتراف کر چکا تھا، سو دل خود بخود گداز ہو گیا۔ پھر کچھ انہیں اپنے نادر خیالات دوسروں تک پہنچانے کا شوق بھی بہت تھا۔ اس لیے فوراً" بات دوہرا دی۔

"ارے بھئی! ہم کہہ رہے تھے 'ہمارے مذہب میں پسند کی شادی کی اجازت نہیں ہے' لیکن آئین میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔"

"لیکن ابا! جہاں تک مجھے پتا ہے اسلام میں اس کے متعلق بڑے واضح احکامات ہیں۔ لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کے بغیر تو ولی بھی شادی نہیں کروا سکتا اور آپ کہہ رہے ہیں....."

"رضامندی اور پسندیدگی میں فرق ہوتا ہے میاں!" انہوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

"کیا فرق ہے، بتائیں گے؟" وہ بضد ہوا۔

"بات سنو برخوردار! میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے کہ تمہیں بٹھا کر فرق سمجھاؤں۔ میری بات سے اختلاف تو تمہیں کرنا ہی ہے۔ میں صحیح بات کہوں یا غلط اور تم یہ نہیں کہو گے تو کون کہے گا۔ پسند کی شادی کر کے خاندان کا نام جو ڈبونا ہے۔"

"ابا! آپ بلاوجہ غصہ کر رہے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا، مذہبی معاملات میں اپنی طرف سے رائے دینا مناسب نہیں ہوتا۔ اس لیے بہتر ہے....."

"کیا بہتر ہے کیا نہیں..... مجھے مت بتاؤ۔" وہ حسب عادت خفا ہو گئے۔

"ابا! میں نے کتابوں میں پڑھا ہے۔"

"تم اور تمہارا مطالعہ دونوں ناقص ہیں۔"

اپنی بات سے اختلاف تو برداشت ہی نہیں ہوتا تھا گر جتے نہیں تو کیا کرتے۔

"ابھی تھوڑی دیر میں رضی آفس سے آجائے گا۔ وہ میرا ہونہار 'لائق' 'باادب' 'ذہین بیٹا ہے۔ اس کا مطالعہ بھی تم سے زیادہ ہے۔ ہماری مانو اس بڑے بھائی کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارا کرو۔ ممکن ہے اس کی اچھی صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر تم پر بھی پڑ جائے اور تم بڑوں کی بات سے اختلاف کرنا چھوڑ دو۔"

"جی ہاں..... آپ کے لیے تو رضی بھائی ہی لائق' ہونہار' باادب ہو سکتے ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے 'وہ احمق' گدھے ہیں' جو آپ کی ہر بات پر لبیک کہتے ہیں..... اونہہ! اللہ بچائے ہمیں ایسی لائقی سے۔" وہ بدمزا ہو کر بڑبڑایا، مگر برا ہو ابا کی تیز نگاہی کا۔

"یہ کیا بڑبڑا رہے ہو..... تقی! تمہیں تو محفل کے آداب بھی نہیں معلوم۔" تقی گڑبڑا گیا۔

"جی..... میں تو بس اس ٹاک شو کے اینکر پرسن کی بات کر رہا تھا۔" اس نے دل ہی دل میں دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"کس قدر مہارت سے شاہ رخ خان کی نقل کر رہا ہے کہ سرسری نظر ڈالی جائے تو پتا ہی نہیں چلتا اصل ہے یا نقل..... اور اس پر جذبہ حب الوطنی ملاحظہ ہو۔ دشمن ملک کے نامور اداکار کی کاربن کاپی بنا گھوم رہا ہے مگر پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہا ہے۔"

"ہوں....." عبدالباقر لودھی نے ایک ترچھی طنزیہ نظر اس پر ڈالی۔

"یہ دراصل تمہاری نوجوان نسل کا نمائندہ ہے اور اتفاق سے تمہاری نسل کا ہر فرد نقالی پر یقین رکھتا ہے۔"

"اور آپ کے ان پسندیدہ ماڈرن عالم صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے۔" مصلحت آمیزی کے ارادے کے باوجود تقی کو تاؤ آگیا۔

"اسی پروگرام میں محترم تین مرتبہ فرما چکے ہیں کہ ویلنٹائن ڈے منانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو کسی لڑکی کو پھول پیش کر سکتے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور اسلام محبت کا دین ہے۔ پھر ہم کس طرح اسلام کی رو سے ویلنٹائن ڈے کی مزمت کر سکتے ہیں۔"

"بس! دوسروں پر تنقید ہی کرنا۔" لودھی صاحب بھڑک اٹھے۔ "اور تمہیں آتا بھی کیا ہے۔ اتنا دھیان خود پر دیتے تو اب تک سدھر چکے ہوتے۔ یہ بال دیکھے ہیں اپنے۔ شکر کرو! بالوں کی زکوٰۃ نہیں دینا پڑتی۔ ورنہ تمہاری تو آدھی عمران زلفوں کی زکوٰۃ ادا کرتے ہی نکل جاتی....."

انہوں نے اس کے کندھوں سے کچھ اوپر تک آتے بالوں کو غضب ناک نظروں سے دیکھا اور آواز بڑھا کر انہماک سے ٹی وی دیکھنے لگے۔

تقی کے بال اس کی کمزوری تھے۔ اس نے پیار سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور گلاس اٹھا کر واک آؤٹ کر گیا۔



ساہر کی آنکھ لگے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کسی چیز کے گرنے کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا دل بے ہنگم انداز سے دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے دل کو سنبھلنے میں لگے۔ اسی دوران اسے خیال آیا کہ یہ خوفناک آواز اس کے کمرے کی کھڑکی کے شیشے سے کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز تھی۔ اس نے سرعت سے گردن موڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ لیٹنے سے پہلے اس نے پردے برابر کر دیے تھے۔ لیکن دونوں پردوں کے درمیان چھوٹی سی جھری دانستہ چھوڑ دی تھی۔ اب اسی جھری سے صحن کا مختصر سا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ وسیع و عریض صحن کے آخری کونے پر ٹیرس کی طرف جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ ان ہی سیڑھیوں پر شفا دبے قدموں اوپر چڑھتی دکھائی دے رہی تھی۔

ساہر چونکی۔ ساتھ ہی اس نے پیر کارپٹ پر رکھے، پھر کچھ خیال آنے پر دوبارہ لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور نظریں باہر کے منظر پر ہی تھیں۔ شفا محتاط نظروں سے کمرے کی طرف دیکھتی

سیڑھیوں پر غائب ہوگئی تھی۔

"یا اللہ۔۔۔ آج تو شیشے میں دراڑ پڑ ہی گئی ہو۔" اس نے گردن سیدھی کر کے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر ذہن کو ادھر ادھر کی باتوں میں الجھانے لگی۔

طبیعت اس کی صبح سے گری گری سی تھی۔ کل سے نزلہ زکام ہو رہا تھا۔ پھر پچھلی دو راتوں سے عادل کی وجہ سے نیند بھی پوری نہ ہو سکی تھی۔ وہ پاؤں پاؤں چلتا تھا۔ سیڑھیوں سے گر کر چوٹ لگوا بیٹھا تھا۔ اب رات بھر روتا رہتا۔ خود بھی جاگتا ماں کو بھی جگاتا۔ صبح ہی صبح عمیر نے آفس سے فون کر دیا کہ پانچ لوگوں کا لنچ تیار کر دو۔ آفس کا پیون آ کر لے جائے گا۔ سماہر نے شفا کو کالج سے چھٹی کروائی کہ کچھ مدد کروا دے گی۔ پھر دونوں نے مل کر لنچ تیار کیا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ تقریباً" سارا ہی کام شفا نے کیا' کیونکہ عادل اس کی گود سے اترنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دوسرے سماہر کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ سارے جسم میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ سر بھی بوجھل سا تھا۔ لگتا تھا' بخار ہو گا۔

شفا نے ماتھے پر تیوری ڈالے بغیر سارا کام سمیٹا۔ سماہر شکر گزاری ظاہر کرتی رہی۔ تھوڑی دیر پہلے پیون آ کر کھانا لے گیا تھا۔ پھر دونوں نے کھانا کھایا۔ شفا نے ہی کچن سمیٹا اور نہانے گھس گئی۔

"بھابھی! چائے بناؤں؟" گیلے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"اتنی گرمی میں چائے؟" سماہر نے منہ بنا کر کہا۔ "عادل سو گیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔ میں بھی تھوڑی دیر لیٹ جاؤں۔ بلکہ میں تو کہتی ہوں تم بھی میرے کمرے میں آ جاؤ۔ ابھی لائٹ ہے۔ اے سی آن کر کے تھوڑی تھوڑی دیر سو جاتے ہیں۔" سماہر نے گویا لالچ دیا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی۔ آپ سو جائیں۔۔۔ میں کچھ پڑھنے کا سوچ رہی تھی اور چائے کے بغیر میرا دماغ کام نہیں کرے گا۔" شفا نے مسکرا کر کہا۔

"سارا دن چولہے کے سامنے گزارا ہے۔ اب پھر چائے بنانے کچن میں گھسو گی۔۔۔ تم تو پاگل ہو شفا!" سماہر نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر مسکرائی اور پیار سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔

"اچھا سنو۔۔۔ باہر کوئی آئے تو پوچھ کر احتیاط سے گیٹ کھولنا۔ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ بس ڈر ہی لگتا ہے۔" وہ معمول کی تاکید کرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ عادل کو لٹا کر اسے تھپکتے ہوئے خود اس کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ تب ہی کوئی چیز کھڑکی سے ٹکرائی اور اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

عادل نیند میں کسمسا رہا تھا۔ سماہر کروٹ بدلتے ہوئے ایک ہاتھ سے اسے تھپکنے لگی۔ ساتھ ہی خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن نیند تھی کہ آ کر نہ دے رہی تھی۔ تب ہی برآمدے میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سماہر کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ لیکن اٹھنے کی کوشش اس نے ایک بار بھی نہیں کی۔

گھنٹی بجتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ چند سیکنڈز کے بعد بیل پھر بجنے لگی تھی۔ اس بار جب بیل بجنا بند ہوئی تو سماہر نے کچھ سوچا اور عادل کو تھپک کر اس کے گہری نیند سونے کا اطمینان کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ دروازے کو اس نے نیم وا رہنے دیا تھا۔

یہ جون کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی۔ صحن میں دھوپ پنجے گاڑے بیٹھی تھی برآمدے کا پنکھا چل رہا تھا۔ اس کے باوجود ٹھنڈے کمرے سے باہر آتے ہی بڑی ناگواری محسوس ہوئی۔ سماہر نے محتاط نظروں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سی ایل آئی پر نمبر چیک کیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمک سی اتر آئی۔

سی ایل آئی پر عمیر کے آفس کا نمبر چمک رہا تھا۔

اسی وقت شفا کے موبائل فون کی بپ بھی بجنے لگی۔ ٹیلی فون اسٹینڈ تخت کے قریب تھا۔ یہیں شفا کی کتابیں اور موبائل پڑا تھا۔ عمیر نے لینڈ لائن سے مایوس ہو کر شفا کے موبائل پر کال کرنا شروع کر دی تھی۔

سماہر چپ چاپ واپس چلی آئی۔ شکر ہے ابھی تک عمیر نے اس کا نمبر ٹرائی نہیں کیا تھا۔ تب ہی اس نے جلدی سے سیل فون آف کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اسے دل ہی دل میں بڑی گدگدی محسوس ہونے لگی تھی۔



وہ گلاس رکھنے کچن میں آیا تو امی کفگیر ایک ہاتھ میں پکڑے دوسرا ہاتھ کمر پر رکھے اس کی کلاس لینے تیار کھڑی تھیں۔

"کیا ضرورت تھی ان سے بحث کرنے کی؟"

"واہ واہ۔۔۔ سبحان اللہ۔" وہ جھوم اٹھا۔

"امی حضور! کیا آپ کے پاس موکل ہیں؟ بات وہاں ابا سے ہو رہی تھی۔ یہاں کچن میں آپ کو اطلاع بھی پہنچ گئی۔ کیوں بھابھی! آپ نے دیکھے ہیں امی کے موکل؟"

اس نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ننھی مشعل کو دلیہ کھلاتی ببین بھابھی سے پوچھا۔ بھابھی اس کی بات سن کر مسکرائیں' لیکن خاموش رہیں۔

"بات؟" امی نے غصے سے کہا۔ "جب تم اور تمہارے ابا بحث کر رہے ہوتے ہو تو دونوں کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ آدھے محلے کو خبر ہو جاتی ہے۔ میں تو پھر اسی گھر کے کچن میں موجود ہوں۔"

"جانے دیں امی! کہاں میں' کہاں ابا۔۔۔ میری آواز تو ان کے والیوم کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی۔" اس نے انکساری سے کہا اور پانی کا گلاس بھر کر لبوں سے لگا لیا۔

"میں جو پوچھ رہی ہوں۔ اس کا جواب دو۔ کیا ضرورت تھی ان سے بحث کرنے کی؟"

"انہیں کیا ضرورت تھی مجھ سے بحث کرنے کی؟" اس نے جملہ توڑ مروڑ کر انہیں لوٹایا۔ امی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولیں۔

"جب تمہیں پتا ہے' وہ اپنی بات سے اختلاف برداشت نہیں کرتے تو کیوں اختلاف کرتے ہو؟"

"جب انہیں پتا ہے۔ میں غلط بات برداشت نہیں کرتا تو کیوں غلط بات کرتے ہیں؟"

"تم کان بند کر لیا کرو۔۔۔ مت سنا کرو۔"

"وہ زبان بند نہیں رکھ سکتے۔ میں کیوں کان بند کروں؟" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔

"گستاخی معاف امی! لیکن میں بتا دوں' ابا سٹھیا چکے ہیں۔ ہر معاملے میں اپنی چلاتے ہیں۔ آج تو مذہب کو بھی نہیں چھوڑا لودھی صاحب نے۔"

امی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ کفگیر کا زوردار وار کندھے پر کیا۔

"اف۔۔۔ آپ اپنے میکے سے ہی ایسی آئی تھیں یا لودھی صاحب کی صحبت نے وحشی بنا دیا؟" تقی بلبلا ہی اٹھا۔

"تقی۔۔۔ تقی!" امی جھنجلا گئیں۔ "آخر تمہیں عقل کب آئے گی؟"

وہ جو فروٹ باسکٹ میں سے کوئی صحت مند سا سیب تلاش کر رہا تھا۔ ذرا سنجیدگی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"آپ کے نزدیک عقل آنے کی نشانی کیا ہوتی ہے؟"

"تقی! اب میرے ساتھ بحث مت کرنا۔" انہوں نے کہا۔

"کمال ہے امی! آپ سے بات کرنے لگوں تو آپ کو بحث لگتی ہے۔ ابو سے بات کرتا ہوں تو وہ نالائق کہہ کر بات سننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ جب آپ لوگ میری بات ہی نہیں سنتے تو آپ کو کیسے پتا میں محض بحث کرتا ہوں یا ابا کیسے جانتے ہیں' میں نالائق ہوں؟"

"تقی! میری بات سنو۔" امی نے اس کے لہجے سے جھانکتا شکوہ سن کر نرمی سے کہا۔

"مجھے مت سنائیں۔۔۔ میں جانتا ہوں' آپ نصیحت کریں گی۔ اثر مجھ پر ہو گا نہیں۔۔۔ تو پھر آپ شکوہ کریں گی۔ اس لیے مجھے نہ سنائیں۔ لودھی صاحب کو سنائیں۔ بشرطیکہ وہ بھی آپ کی سن لیں۔"

اس کو پسند کا سیب مل گیا تھا۔ آستین سے رگڑ کر صاف کیا اور عین درمیان میں زور سے دانت گاڑ دیے۔

"دیکھا! پھر وہی بات۔۔۔ پہلے خود بدتمیزی کرتے ہو اور پھر شکایت بھی کرتے ہو۔ یہ لودھی صاحب کیا ہوتا ہے؟"

”ابا کا خاندانی نام ہے..... کمال ہے امی! آپ کو شادی کے اتنے سال بعد بھی نہیں پتا۔“ اس نے معصوم بن کر پوچھا۔

”مجھے تو پتا ہے‘ لیکن شاید تمہیں نہیں معلوم بڑوں کو نام سے مخاطب کرنا بدتمیزی ہوتی ہے۔ ابا نہیں کہہ سکتے؟“

”وہ بھی تو مجھے نالائق‘ نکما‘ نانہجار کہتے ہیں۔ میں نے تو آج تک برا نہیں مانا۔“ وہ کندھے اچکا کر بولا۔

”نالائق‘ نکما کہنے میں اور باپ کا نام لے کر پکارنے میں فرق ہوتا ہے۔“ امی جیسے اس کی باتوں سے عاجز آ کر بولیں۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ واقعی فرق ہوتا ہے۔“ عادت کے برخلاف وہ قائل ہو گیا۔ ”لودھی صاحب عزت اور پیار میں کہا جاتا ہے۔ جبکہ نالائق‘ نکما بے عزت کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔“

”تمہاری یہی عادت بری ہے تقی! ہر بات میں ان سے مقابلے بازی شروع کر دیتے ہو۔ بتاؤ! پھر وہ تمہاری باتیں تحمل سے کس طرح سنیں؟“

”میں نے مقابلہ بازی کبھی نہیں کی تھی۔ انہوں نے شروع کی تھی۔ بار بار یہ کہتے تھے‘ جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو ایسے تھے۔ تم تو یوں ہو..... ہم تو یہ تھے ..... ہونہہ..... سارے خاندان میں مجھے نالائق مشہور کر دیا ہے۔ اب کون ایسے لڑکے کو اپنی بیٹی دے گا۔ جس کا باپ ہی اسے نالائق‘ نکما کہتے نہ تھکتا ہو۔“ اس نے اس قدر بے چارگی سے کہا تھا کہ سبین بھابھی کو ہنسی آ گئی۔ امی کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

”آپ کو بڑی ہنسی آ رہی ہے۔“ اس نے جل بھن کر سبین کو دیکھا۔

”خود تو آپ کے شوہر نامدار نے چپکے چپکے افیئر بھی چلایا۔ لومیرج بھی کروائی اور ابا کی نظروں میں اچھے بھی بن گئے اور ایک ہم ہیں..... کچھ کیے بنا ہی برے ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں‘ بد سے بدنام برا۔“

سبین کی ہنسی اور تیز ہو گئی۔

”مت ہنسیں بھابھی! کسی کی بے بسی پر ہنسنے سے دکھی دل کی بددعا لگ جاتی ہے۔“

”استغفراللہ..... اسے کیوں بددعا لگے؟ سوچ سمجھ کر بولا کرو تقی!“

”اسے کہنے دیجئے خالہ امی!“ سبین اسے چڑاتے ہوئے بولیں۔

”خود تو یہ ابا کے ڈر سے افیئر چلانے جیسی بہادری کر نہیں سکتا اور جو یہ بہادری کر چکے ہیں‘ ان سے یہ حسد کرتا ہے..... بے چارہ!“

”دیکھ لیں امی! آپ کی بہو میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”تو اور کیا کرے؟“ امی بھی سبین کے ساتھ مل گئیں۔ ”تمہاری باتیں ہی ایسی ہیں کہ مذاق اڑایا جائے۔“

تقی نے غصے اور خفگی سے دونوں کو دیکھا۔

”ایک طرف ابا ہیں۔ جنہیں یقین ہے میں کسی دن لومیرج کر کے ان کے خاندان کا نام ضرور ڈبو دوں گا۔ بڑی امیدیں ہیں انہیں مجھ سے..... اور دوسری طرف یہ بھابھی جان ہیں‘ جو ہر وقت طعنے دیتی ہیں کہ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کم سے کم اس معاملے میں ابا کو مایوس نہیں کروں گا اور ان شاءاللہ ان کی امیدوں کو پورا کر کے طعنے دینے والوں کا منہ بند کر دوں گا۔“ اس نے انقلابی انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

”شاباش ہے بیٹے! تم بس یہی کر سکتے ہو۔“ امی نے جل کر کہا اور سبز دھنیے کے پتے ٹہنیوں سے علیحدہ کرنے لگیں۔

”آپ کیا چاہتی ہیں‘ اور کیا کروں؟“

”کوئی ڈھنگ کا کام کرو۔ جس سے تمہارے ابا کا نام روشن ہو۔ انہیں لگے کہ تم میں بھی رضی جیسا احساس ذمہ داری ہے۔ تم زندگی میں بہت کچھ کر سکتے ہو.....“

”امی! میری پڑھائی تو مکمل ہو جانے دیں۔ ابا کو کیوں لگتا ہے‘ میں اپنی ذمہ داریاں نہیں اٹھاؤں گا؟“ تقی نے جھنجلا کر کہا۔

”اس میں سارا قصور تمہاری زبان درازی کا ہے۔ ہمیشہ ان سے بحث کرتے ہو۔ ہر بات کا الٹا جواب دیتے ہو۔ جب پتا ہے ان کا مزاج مختلف ہے تو ان کے مزاج کے مطابق بات کیوں نہیں کرتے؟ یہ بھی نہیں کہ تمہیں بات کرنا نہ آتی ہو۔“

”یعنی کل ملا کر غلطی ہمیشہ میرے ہی نامہ اعمال میں لکھی جائے گی؟“ اس نے سرد مہری سے پوچھا۔

”وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔“ امی نے گہری سانس بھرتے ہوئے سوچا اور غصے کے اظہار کے طور پر زور زور سے ہنڈیا میں چمچ ہلانے لگیں۔

عجیب سی صورت حال ہو گئی تھی۔ سبین نے سنجیدگی سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”تقی! تم خالہ امی کی بات تو سمجھو۔“ سبین نے نرمی سے کہا۔ تقی کا موڈ بری طرح خراب ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر ایک گلاس پانی سے بھرا اور غٹاغٹ پی گیا۔

”یونیورسٹی میں چھٹیاں ہو گئی ہیں۔ میں کل اپنے دوستوں کے ساتھ مری جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے‘ ناران کاغان تک بھی ہو آئیں..... کچھ دن تک واپس آ جاؤں گا۔“ اس نے خفگی بھرے انداز میں اطلاع دی۔

”تم پھر دوستوں کے ساتھ جا رہے ہو..... تمہیں پتا ہے ناں! تمہارے ابا کو تمہارے دوست پسند ہیں۔ نہ ان کے ساتھ تمہارا گھومنا پھرنا۔“ امی نے تیزی سے کہا۔

”گھر میں رہتا ہوں تو ابا کو اعتراض ہوتا ہے۔ باہر جاتا ہوں تو اعتراض ہوتا ہے..... انہیں میرے دوست پسند ہیں نہ میں..... جس دن خودکشی کر لوں گا‘ اس دن شاید ابا پرسکون ہو جائیں۔“ اس نے گلاس سلیب پر پٹخا اور غصے سے کچن سے باہر نکل گیا۔ امی سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”میں کیا کروں اس لڑکے کا۔“

”جاؤ..... مشعال! چاچو سے کہو آپ کو آئس کریم لے کر دیں۔“ سبین نے جھٹ پٹ اس کا منہ پونچھا اور ٹیبل سے اتارتے ہوئے تاکید کی۔ مشعال بھاگتی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی۔ وہ دو سال کی تھی۔ ابھی بول چال میں روانی نہیں آئی تھی۔ لیکن اپنی زبان میں سب سمجھا دیتی اور اپنے مطلب کی بات سمجھ بھی لیتی تھی۔ اب بھی آئس کریم کا نام سن کر دوڑ گئی اور سبین جانتی تھی۔ اس کے تقی کے پاس جانے کی دیر ہے۔ اس کا موڈ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ یوں بھی جتنی جلدی اسے غصہ آتا تھا۔ اتنی ہی جلدی اتر بھی جاتا تھا۔ مشعال تو پھر اس کی لاڈلی تھی۔

”کیوں پریشان ہوتی ہیں خالہ امی!“ سبین نے امی سے کہا۔

”پریشان نہ ہوں تو کیا کروں؟ اب خود تو منہ اٹھا کر کل چلا جائے گا۔ میں تمہارے ابا کے سامنے کیا جواب دوں گی۔ وہ بھی ایسے ہیں‘ جب تک تقی واپس نہیں آئے گا‘ مجھے ہی اسے بگاڑنے پر باتیں سناتے رہیں گے۔“ وہ دونوں باپ بیٹا سے عاجز تھیں۔

”سچ کہوں تو دونوں ایک جیسے ہیں۔ نہ یہ کسی کی سنتے ہیں۔ اپنی بات پتھر پر لکیر سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں سب لوگ بس اسی پر عمل کریں‘ جو انہوں نے کہہ دیا ..... اور تقی بھی بالکل ان ہی پر ہے۔ دونوں کی آپس میں بالکل نہیں بنتی۔ دونوں ضدی ہیں‘ دونوں غصہ ور ہیں اور دونوں ڈھیٹ ہیں۔“

سبین کو ہنسی آ گئی۔

”پھر آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ جب دونوں ایک سے ضدی‘ غصہ ور اور ڈھیٹ ہیں تو آپ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت بھی ایک جتنی کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے موٹے جھگڑے اور بحثیں تو جنریشن گیپ کی وجہ سے ہوتی ہی ہیں‘ جو آہستہ آہستہ سلجھ بھی جاتی ہیں کون سی ایسی فیملی ہو گی‘ جہاں باپ بیٹا میں چھوٹے موٹے اختلاف نہ ہوں۔“

”شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو‘ مگر سچ کہوں تو مجھے ان کے ضدی پن سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کی ضد کی وجہ سے پہلے بھی بڑا نقصان اٹھا چکے ہیں ہم..... اب تک دل سے پھانس نہیں نکلی۔“ وہ آزردہ ہو گئیں۔

”چھوڑیں ناں امی! اس بات کو یاد کر کے دکھی

ہونے سے فائدہ؟ چلیں! ہم چائے پیتے ہیں۔"
ثبین نے ٹی وی کمرشل کی طرح چائے کی ایک پیالی کو ہر پریشانی کا حل تجویز کرتے ہوئے انہیں ذہنی طور پر ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔
"بات تو ٹھیک ہے۔ بس فکر اس بات کی ہے کہ ان دونوں باپ بیٹا کی ضد کوئی اور نقصان نہ کروا دے۔"
امی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ثبین کیتلی میں چائے کا پانی ڈالنے لگی۔



شفا نے منڈیر سے جھانک کر دیکھا۔ شہتوت کے درخت کے عین نیچے کرسی بچھائے ثمر اطمینان سے پیر جھلا رہی تھی۔
شفا کی آنکھوں میں شرارے بھر گئے۔ اس نے فی الفور دونوں ہتھیلیاں منڈیر پر جمائیں اور سہولت سے ساتھ والی چھت پر کود گئی۔ پھر گربہ پائی سے سیڑھیاں عبور کر کے ثمر کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ سر کرسی کی پشت سے لگائے آنکھیں بند کیے عاطف اسلم کی جانشین بنی اس محبوب کی یاد میں کوئی دکھی گیت گا رہی تھی، جس کا دور دور تک کوئی نام و نشان دکھائی نہ دیتا تھا۔
شفا کو بہت غصہ آیا۔ اس کے گھر میں پتھر مار کر خود بیٹھی گیت گا رہی تھی۔ گویا روم کو آگ لگا کر نیرو بیٹھا چین کی بنسی بجا رہا تھا۔
اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، رکھ کے ایک دھپ اس کے کندھے پر رسید کی۔
"آ..... " ثمر گڑبڑا کر پلٹی۔
"کیا تکلیف ہے تمہیں؟" شفا کمر پر ہاتھ رکھے جھانسی کی رانی کا پوز مار رہی تھی۔ آنکھوں میں شرارے نہیں پر انگارے۔
"ابھی تک تو کوئی تکلیف نہیں تھی، لیکن جتنی زور سے تم نے مارا ہے، لگتا ہے، یہ تکلیف اب سالہا سال ساتھ رہے گی..... ہائے ظالم۔" ثمر نے کندھا سہلاتے ہوئے دہائی دی۔
"ہونہہ..... ظالم..... کتنی بار کہا ہے۔ کھڑکی پر پتھر نہ مارا کرو۔ کسی دن شیشہ ٹوٹ گیا تو تم نیا ڈلوا کر دو گی؟"
"محترمہ! دو سال کی پریکٹس ہے میری۔ اب تک تو شیشہ ٹوٹا نہیں۔" ثمر نے اترا کر کہا تھا۔ شفا نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ کہتی تو وہ سچ تھی۔
"اچھا! جلدی بتاؤ کیوں بلایا ہے؟"
"بیٹھو ناں..... تھوڑی دیر باتیں کریں گے۔" ثمر نے دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے رکھی۔
"خدا کا خوف کرو ثمر! اس بھری دوپہر میں تم نے مجھے باتیں کرنے کے لیے بلایا ہے۔" شفا نے چڑ کر کہا۔
"صرف باتیں کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ چاٹ بنائی تھی، سوچا تمہاری دعوت ہی کر ڈالوں۔"
آلو چنے کی ڈھیر ساری ہرا مسالا چھڑکی ہوئی چاٹ۔ شفا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے جھٹ پٹ پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر کچھ خیال آنے پر دل مسوس کر بولی۔
"تم کھالو ثمر! میں چلتی ہوں۔ بھابھی سو رہی تھیں دروازے پر کوئی آگیا تو ان کی نیند خراب ہو گی۔"
"تمہاری بھابھی کو سونے کے سوا اور کوئی کام نہیں؟" ثمر ناک چڑھا کر بولی۔
"عادل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رات کو نہ خود سوتا ہے۔ نہ انہیں سونے دیتا ہے۔" شفا کی بات پر ثمر نے یوں سر جھٹکا، جیسے ان باتوں کو سننے کی عادی ہو۔ پھر دوڑ کر گئی اور چمچ لے آئی۔
"فٹافٹ کھالو۔" اس نے چمچ شفا کے ہاتھ میں پکڑایا اور خود بھی کھانے لگی۔ ثمر کے گھر میں برآمدہ نہیں تھا۔ کمروں کے آگے اس درخت کی اچھی خاصی چھاؤں بن جاتی تھی۔
دوپہر کارکرتا سا وقت تھا۔ خاموشی بڑی محسوس ہوتی تھی۔
"باقی گھر والے کہاں ہیں؟" شفا نے پوچھا۔
"قیلولہ فرما رہے ہیں..... تم کالج کیوں نہیں آئیں

"عمیر بھائی کو اپنے کولیگز کو لنچ کروانا تھا۔ بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے میں نے چھٹی کرلی۔"

"ویسے ایک بات ہے شفا..... تمہاری بھابھی ہے ذہین عورت۔"

ثمر نے حسب عادت آنکھیں مٹکا کر کہا۔ لیکن ابھی جملہ یہاں تک ہی پہنچا تھا کہ شفا نے اسے گھور کر دیکھا اور رسان سے بولی۔

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔ ذہین نہ ہوتیں تو ایم ایس سی میں گولڈ میڈل کیسے لیتیں۔" شفا نے بات ہی پلٹ دی۔

"کالج میں لانگ ٹرپ کی ڈیٹ فائنل ہوگئی؟"

"ہاں..... اچھا یاد کروایا..... اگلے ہفتے کی دو تاریخ فائنل ہوئی ہے۔ تم نے عمیر بھائی سے پرمیشن لے لی؟" ثمر نے پوچھا۔

"میں نہیں جارہی ثمر!"

"کیوں؟" ثمر نے تعجب سے پوچھا۔ "تمہیں تو اس لانگ ٹرپ کا شروع سال سے انتظار تھا ناں؟"

"انتظار تو تھا لیکن تجھے پتا ہے عمیر بھائی مجھے اتنی دور نہیں جانے دیں گے۔"

"کہیں تمہاری بھابھی تو اڑی نہیں کررہیں؟" ثمر نے مشکوک انداز میں پوچھا تو شفا جھنجلا کر بولی۔

"وہ کیوں کچھ کہیں گی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ مجھے پتا ہے' عمیر بھائی کس چیز کے لیے مانیں گے' کس چیز کے لیے نہیں۔ اتنی دور اکیلے بھجوانے پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ کہیں گے اگلے سال ہم سب جائیں گے۔ میں' تم' تمہاری بھابھی اور عادل..... اچھا ہے ناں ثمر! فیملی ٹرپ کا اپنا ہی مزا ہوتا ہے۔" شفا نے لاپروائی سے کہا۔ ثمر اسے گھور کر بولی۔

"تم کبھی اپنی فرینڈز کا خیال نہ کرنا۔ ہم کتنا خوش ہو رہے تھے کہ سب دوستوں کو چند روز اکٹھے گزارنے کا موقع ملے گا۔ لیکن تم کوئی نہ کوئی پنگا ضرور ڈالا کرو۔"

"سچ کہوں ثمر! دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ لیکن عمیر بھائی کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ جتنی مجھ سے محبت کرتے ہیں' اتنا ہی کانشس بھی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی بھابھی کہتی ہیں۔ شفا! عمیر کا بس چلے تو مرغی کی طرح تمہیں اپنے پروں میں چھپا کر رکھیں۔ اتنی محبت کرتے ہیں وہ مجھ سے اور میرا دل کہتا ہے' محبتوں کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔" شفا نے اتراتے ہوئے کہا۔

ثمر بے زاری سے اس کے ارشادات سنتی رہی۔ جتنی دیر میں چاٹ کی پلیٹ صاف ہوئی' وہ باتیں کرتی رہیں۔ شفا کو وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوسکا۔

☼ ☼ ☼

مشعال کو آئس کریم دلوا کر تقی واپس آیا تو ابا اس کے کمرے سے نکل رہے تھے۔

"پنکھا چل رہا تھا۔" انہوں نے حسب عادت خشمگیں نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں بند کرنا بھول گیا تھا۔" تقی نے بے اختیار سر کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بل بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ اونہہ! جیب سے ادا کرنا پڑے تو کبھی کچھ نہ بھولے۔" وہ لاٹھی ٹیکتے رخصت ہوئے۔ تقی نے گہری سانس بھر کر انہیں جاتے دیکھا۔ پھر کمرے میں آکر ہاتھ مار کر پنکھا آن کیا اور بیڈ پر گرنے کے انداز میں ہاتھ پیر پھیلا کر چت لیٹ گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر سرہانے کے قریب اس کی چند کتابیں' فولڈر' موبائل فون' اسائنمنٹ فائل اور کچھ فیشن شوبز سے متعلقہ میگزینز پڑے تھے۔

تھوڑی دیر وہ اسی طرح لیٹا پنکھے کے گھومتے پروں پر نظر ٹکانے کی کوشش کرتا رہا' پھر بنا گردن موڑے ٹٹول کر ہاتھ میں آنے والی پہلی کتاب کو کھول کر آنکھوں کے سامنے کیا اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ عجب بے زاری سی بے زاری تھی۔ گو کہ مشعال کے ساتھ کچھ وقت گزار کر اس کا موڈ خوش گوار ہوگیا تھا۔ مگر اللہ بھلا کرے "لودھی صاحب" کا جنہوں نے منٹوں میں اس خوش گوارت پر پانی پھیر دیا تھا۔

تقی نے کتاب بند کرکے ایک طرف پٹخی اور تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

ممکن ہے یہ بات سننے میں عجیب لگتی ہو۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ تقی کی اپنے ابا عبدالباقر لودھی سے کبھی نہیں بنی۔ گو کہ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی جس کی بطور خاص نشان دہی کی جاتی بس یہ تھا کہ ان کے ذہن آپس میں نہیں ملتے تھے۔

تقی اکثر سوچتا' ایسا کیوں ہے۔

ابا تھوڑے سے سخت مزاج ضرور تھے۔ لیکن سڑیل یا آدم بے زار ہرگز نہ تھے۔ پھر تقی اتنا خوش مزاج' زندہ دل بندہ تھا کہ منٹوں میں کسی اجنبی کو دوست بنالیتا۔ اس کی حس مزاح بھی بہت بہترین تھی کوئی کم ہی اس کے سامنے ناراض شکل بنا کر بیٹھ پاتا تھا۔ ایسے میں ابا کی چوبیں گھنٹے کی ناراضی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ ہر بات میں اس پر طنز کے تیر چلاتے' بات بے بات نکمے پن کے طعنے دیتے۔ تقی کے چھوٹے چھوٹے بے ضرر مذاق بھی ان سے برداشت نہ ہوتے تھے۔ وہ فوراً" غصے میں آجاتے۔

تقی اکثر و بیشتر ان کی باتوں کو ہنسی مذاق میں ٹال دیتا تھا۔ لیکن ہنس کر ٹال دینے کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ وہ ان باتوں کو محسوس نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھار ابا کی باتیں اسے بری طرح دل برداشتہ کردیتی تھیں اور وہ چڑ کر سوچتا کہ آخر ابا اس سے کس قسم کی تابعداری کی توقع رکھتے ہیں؟

ہاں! یہ ضرور تھا کہ ابا کی سخت مزاجی کے مقابلے میں اس کے مزاج میں کسی قدر بغاوت تھی۔ پتا نہیں ایسا خود بخود کیسے ہوجاتا تھا کہ ابا مشرق کی طرف چلنے کی بات کرتے تو عین اسی لمحے تقی کا ارادہ مغرب کی طرف جانے کا بن رہا ہوتا۔ ابا جنوب کا قصد کرتے تو اس کی سواری شمال کی سمت روانہ ہوجاتی۔

مزاجوں کے اتنے تصادم کے باوجود تقی ابا سے تابعداری جتانے کی کوشش کرتا۔ کئی بار اس نے اپنا من مار کر ابا کی مرضی کے مطابق سر تسلیم خم کیا تھا۔ لیکن ہر بار خوش ہونے کے بجائے ابا اس سے مزید خفا ہوجاتے۔ تقی چڑ کر اپنی من مانی کی کوششوں میں جت جاتا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد وہ صرف ایک وجہ تلاش کرپایا تھا' جس کی بنا پر ابا اس سے خفا ہوسکتے تھے اور وہ یہ کہ اس نے ابا کی مرضی کے بغیر کیڈٹ کالج چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

"میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔ اس طرف میرا رجحان ہی نہیں ہے۔" اس نے ابا سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں تمہارا رجحان کس طرف ہے؟" ابا کی سنجیدگی کے برعکس تقی نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا اور پرجوش انداز میں انہیں اپنے ہر ارادے کی تفصیل بتانے لگا۔

"میں شوبز جوائن کرنا چاہتا ہوں ابا! اسی کو اپنا پروفیشن بناؤں گا۔ پہلے کچھ سال محض ایکٹنگ' پھر ڈائریکشن اور اس کے بعد اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس..... میں نے اپنا سارا فیوچر پلان کرلیا ہے ابا! آپ دیکھیے گا ایک دن میں پاکستان کے صف اول کے اداکاروں کی صف میں کھڑا ہوکر آپ کا نام روشن کررہا ہوں گا اور آپ مجھ پر فخر محسوس کریں گے۔ میں نے سوچا' جب مجھے ایک مختلف فیلڈ میں ہی جانا ہے تو ابھی سے اس کی تیاری کرنا چاہیے۔ فلم اور ڈراما میکنگ کورسز۔"

"تمہیں لگتا ہے مراثیوں اور بھانڈوں کی طرح ناچ گا کر تم میرا نام روشن کروگے؟" ایک دم ابا نے مشتعل ہوکر کہا۔ تقی چپ ہوگیا۔ اب تک ابا نے کبھی اس سے اس طرح بات نہ کی تھی۔ شاید اس لیے کیونکہ تب تک وہ ان کا ہونہار بیٹا تھا' جو ان کا خواب پورا کرنے کیڈٹ کالج جارہا تھا۔ تقی کو گمان نہ تھا کہ ابا اس کی بات پر اس بری طرح رد عمل ظاہر کریں گے۔

"ابا! اداکاری' مراثیوں یا بھانڈوں کا کام نہیں ہے یہ تو بڑا مختلف اور توجہ طلب کام ہے۔ بہترین صوتی اثرات' چہرے کے اتار چڑھاؤ۔ میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں؟ آپ یوں سمجھیں! اللہ نے میرے اندر

اداکاری کے قدرتی جراثیم ڈال دیے ہیں۔ مطلب میرے اندر خداداد صلاحیت ہے۔ اس متعلق حاصل کی ہوئی تھوڑی سی تعلیم میرے اندر نکھار لاسکتی ہے۔"

"اور یہ کس عقل مند نے بتادیا تمہیں کہ تمہارے اندر خداداد صلاحیت ہے؟" ایک اور طنز۔

"اسکول میں اینول فنکشنز پر جو ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ میں ان میں حصہ لیتا رہا ہوں۔ پچھلے سال گیسٹ آف آنر کے طور پر ضیاء محی الدین صاحب اور راحت کاظمی صاحب آئے تھے۔ انہوں نے بھی میری ایکٹنگ دیکھ کر تعریفی کلمات کہے تھے۔ کاش! آپ اس وقت وہاں موجود ہوتے اور دیکھتے' وہ دونوں اس قدر باصلاحیت حضرات میری اداکاری کو کتنا سراہ رہے تھے اور۔۔۔ اور یہ دیکھیں! انہوں نے مجھے انعام کے طور پر ایک ہزار کا نوٹ بھی دیا اور اس پر ان دونوں کا آٹو گراف بھی موجود ہے۔ ضیاء محی الدین صاحب نے تو یہاں تک کہا کہ اگر میں ناپا (NAPA) میں آکر پڑھوں تو وہ مجھے میرٹ اسکالر شپ بھی فراہم کریں گے۔"

وہ پرجوش انداز میں بتاتا چلا گیا۔ لیکن لودھی صاحب کی پیشانی پر اتنے بل پڑ چکے تھے کہ گننے بیٹھتا تو صبح سے شام ہو جاتی۔ پھر ان کی ایک چنگھاڑ نے تقی کو خاموش کروا دیا۔ انہوں نے اس کے سارے جوش کے جواب میں ٹکا سا جواب دے دیا تھا کہ وہ یہ مراثیوں اور نوٹنکی بازوں والے کاموں کا خیال دل سے نکال کر پٹارو جانے کی تیاری کرے۔

تقی کے جوش کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ اسے اتنے سخت رد عمل کی توقع ہرگز نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوا۔ اگلے کچھ روز تک وہ ابا کو قائل کرنے کی کوششوں میں لگا رہا۔ اس نے اپنے موقف کے حق میں ہر طرح کی دلیل دی حتیٰ کہ یہ وعدہ بھی کیا کہ شوبز میں آنے کے بعد وہ کوئی عامیانہ کام نہیں کرے گا اور ایسا کوئی کردار بھی قبول نہیں کرے گا' جس کے اسکرین پر آنے سے اس کے خاندان اور لودھی صاحب کی آن بان پر فرق آئے یا انہیں تقی کی وجہ سے شرمساری کا سامنا کرنا پڑے لیکن لودھی صاحب کو نہ ماننا تھا' نہ مانے یہاں تک کہ تقی کو اپنی زندگی کے سب سے بڑے خواب کو حسرت بنا کر دل میں قید کرنا پڑا۔

لیکن وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ اپنی خواہش کے رد کیے جانے کے بعد اس نے ابا کی خواہش بھی رد کر دی اور واپس آنے کے بجائے وہیں لاہور کے ایک کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ یوں اس نے بدلہ بھی لے لیا اور بیچ کی راہ بھی نکال لی تھی۔ لیکن اس کے بعد ابا کا دل اس کی طرف سے کچھ ایسا کھٹا ہوا کہ پھر مان کر ہی نہ دیا۔ تقی غصہ اترنے کے بعد انہیں خوش کرنے کی کوشش "وقتاً فوقتاً" کرتا رہا۔ لیکن بے سود۔

ایک مصیبت یہ بھی تھی کہ وہ بدتمیزی کی حد تک صاف گو تھا۔ خود پر بڑا جبر کر کے زبان پر قابو رکھ بھی لیتا تو کہیں نہ کہیں زبان پھسل ہی جاتی تھی اور ابا کی نازک مزاجی کو ٹھیس پہنچا کر ہی دم لیتی۔ یوں سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

کبھی کبھی تقی کو ایسا محسوس ہونے لگتا تھا کہ تعلیم کے سلسلے میں جتنے سال اس کے گھر اور گھر والوں سے دور گزرے تھے' ابا اور اس کے درمیان ذہنی ہم آہنگی تشکیل ہی نہ پا سکی تھی۔ رضی بھائی اور اس سے چھوٹا جری بھی ابا کے مزاج کو اس حد تک سمجھتے تھے کہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بھی اپنا مطلب نکلوا لیتے۔ انہیں ابا کو ٹہلانے کا طریقہ آتا تھا۔ سوئے اتفاق اس طریقہ کی ابجد سے تقی ناواقف تھا۔ غالباً اسی لیے وہ ابا کا نالائق' ناہنجار اور بے کار بیٹا تھا۔

"شاید میں نوکری کرنے لگوں تو ابا مجھ سے خوش ہوں۔" اس نے سوچا۔

"لیکن ابا کو میری پڑھائی مکمل ہونے کا انتظار تو کرنا چاہیے۔ اب خالی خولی ایم ایس سی کو کون نوکری دے گا۔ میرا مطلب' میری پسند کی نوکری کون دے گا۔ ہاں! ایم فل ہو جائے تو۔۔۔ اور اگر ناپا سے ایکٹنگ کورس ہی کر لینے دیا ہوتا تو اب تک میں کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن ہونہہ! ابا کی بے جا ضد۔۔۔ ارے۔۔۔"

اونگھتے اونگھتے کچھ یاد آنے پر آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ جھٹ پٹ اپنی جینز کی جیب ٹٹول کر اس نے ایک چھوٹا سا ہرے رنگ کا وزٹنگ کارڈ برآمد کیا۔

سن شائن پروڈکشنز
کاسٹنگ ڈائریکٹر
جاثم علی

اس سے نیچے جاثم صاحب کی ملکی اور غیر ملکی ڈگریوں کی کچھ تفصیلات لکھی تھیں۔ تقی نے زیر لب پڑھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اتر آئی۔ لیکن اگلے ہی پل کسی خیال نے اس چمک کو ماند کر دیا۔ اس نے تھکے ہوئے انداز میں وزٹنگ کارڈ فولڈر پر پھینک کر پھر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

یہ کارڈ کئی روز سے اس کے پاس تھا اور اس کے خوابوں کی طرف لے جانے والا پہلا زینہ ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن ہر بار اس کارڈ اور اس کارڈ سے وابستہ پیش کش پر غور کرتے ہوئے اسے ابا کا سخت رد عمل یاد آجاتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔

ابا کے مستقل انکار کے بعد اس نے اپنے دل سے ناپا (نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس) کا خیال نکالنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن ان کوششوں کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی اس خواہش کو کسی حد تک قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا یہ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ جن دنوں وہ نیا نیا یونیورسٹی میں آیا تھا۔ اس کے ایک دوست کے کوئی انکل سلور اوتھ (Silver Oath) میں کسی چھوٹے موٹے عہدے پر تھے۔ ان انکل کے توسط سے وہ لوگ ایک روز کسی تھیٹر ڈراما کی ریہرسل دیکھنے ریواز گارڈن چلے گئے۔ لیکن یہاں آکر تقی کا دل میں دبا شوق پھر سے آنچ دینے لگا اور اس نے سلور اوتھ کے ایک ڈپلومہ کورس میں ایڈمیشن لینے کی ٹھان لی۔

اس کورس کی فیس پوری کرنے کے لیے تقی کو کڑی محنت کرنا پڑی۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹیوشنز پڑھاتا تھا۔ پزا ہٹ پر کچھ عرصہ اس نے بیرا گیری بھی کی اور ڈلیوری بوائے کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ وہ محنت سے گھبرانے والوں میں سے نہیں تھا۔ بس دعا تھی تو صرف اتنی کہ ابا کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ کورس پورا ہونے تک اس کا شمار سلور اوتھ کے بہترین اسٹوڈنٹس میں ہونے لگا۔ اس دوران اس نے سنجیدہ تھیٹر کے لیے بھی کام کیا۔ لیکن دونوں بار اس نے ایسے کردار لیے جن کا گیٹ اپ اس کی اصل شکل چھپا دے۔

اتنی احتیاط کے باوجود اس کے کارناموں کی خبر رضی بھائی تک پہنچ گئی تھی۔ تقی کو یہ جان کر بڑا اطمینان ہوا تھا کہ بھائی نے اسے سرزنش بھی نہیں کی۔ بلکہ وہ خوش ہوئے تھے۔ اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ کسی بڑی کامیابی کے ملنے تک وہ ابا کو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔

ایک سال پورا ہو جانے کے بعد گو کہ تقی کو سلور اوتھ کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ لیکن ایسے ادارے کو جس سے انسان کی دلی و جذباتی وابستگی بھی ہو جائے' چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ہر دو تین مہینوں کے بعد تقی کو ادارے کی طرف سے کسی نئے کورس یا ورکشاپس وغیرہ کے بروشر یا دعوت نامے ملتے رہتے۔ ایسی ورکشاپس عموماً "الحمرا یا آرٹس کونسل میں منعقد کی جاتی تھیں۔ تقی تقریباً" ہر ورکشاپ اٹینڈ کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک ورکشاپ میں اس کی ملاقات جاثم علی سے ہوئی' جو سن شائن پروڈکشنز میں بطور کاسٹنگ ڈائریکٹر کام کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کارڈ تقی کو دیتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہارے اندر بہت پوٹینشل ہے تقی! بلکہ اگر میں مختصر لفظوں میں کہوں تو تم ایک کمپلیٹ پیکیج ہو۔ اچھی شکل و صورت' کیمرا کمفرٹیبل اور اداکاری کی بہترین صلاحیت۔ تمہارے جیسے ٹیلنٹ کی ہماری انڈسٹری کو بہت ضرورت ہے' جو اتنے اخلاص کے ساتھ کام کرتے ہیں۔۔۔ سچ کہہ رہا ہوں تقی! اگر تمہیں آن اسکرین پہلا بریک دینے کا موقع مجھے ملے تو مجھے بہت فخر محسوس ہوگا۔"

اپنی تعریف سننا کسے برا لگتا ہے۔ تقی کے ہونٹوں کے کنارے کانوں تک پھیلتے جا رہے تھے۔ جاثم کی باتوں نے اس کے جوش کے غبارے میں پھر سے ہوا بھر دی تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ چند روز میں سوچ کر جواب دے گا۔ اب اس روز سے وہ مستقل سوچ رہا تھا۔ لیکن کوئی سرا ہاتھ نہ لگتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دوپہر میں اتنا فون کرتا رہا ہیں۔ لیکن کسی نے ریسیو نہیں کیا۔ تم دونوں کہاں تھیں؟"

کھانا کھاتے ہوئے عمیر بھائی نے اچانک پوچھا۔ شفا کا منہ میں نوالہ لے جاتا ہاتھ ٹھٹک گیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عمیر بھائی ان اوقات میں فون بھی کر سکتے ہیں۔

"میں تو دوپہر میں سو رہی تھی۔ عادل کو سلانے گئی تو اپنی بھی آنکھ لگ گئی۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی گہری لگ گئی تھی۔ تب ہی فون کی بیل کا بھی پتا نہیں چلا اور میرے موبائل کا حال تو آپ کو پتا ہی ہے۔ جب سے عادل نے گرایا ہے، سوفٹ ویئر گڑبڑ کر رہا ہے۔ اپنی مرضی سے آف، اپنی مرضی سے آن.... میرا خیال ہے اب بھی بند پڑا ہو گا۔" سماہر نے اپنی پلیٹ میں بریانی نکالتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

"کیوں شفا! تم بھی سو گئی تھیں؟"

"ج.... جی بھابھی!" اس نے جلدی سے کہا اور پلیٹ پر جھک گئی۔ عمیر نے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے ایک نظر اسے دیکھا۔

"لیکن تم تو کبھی اتنی گہری نیند نہیں سوتیں کہ بیل پر آنکھ نہ کھلے۔" عمیر نے کہا۔ شفا کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دے۔

"تم ثمر سے ملنے گئی تھیں؟" اسے خاموش دیکھ کر عمیر نے پوچھا۔ اس سے سر نہیں اٹھایا گیا۔

"تم ثمر سے ملنے گئی تھیں شفا؟" اب کی بار عمیر کے لہجے میں سختی تھی۔

"جی بھائی!" مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ بہانہ تلاش کرنا بے سود تھا کیونکہ عمیر بھائی کے سامنے وہ کبھی جھوٹ نہیں بول پاتی تھی۔ چوری نہ پکڑی جاتی تو اور بات تھی لیکن جھوٹ ناممکن۔

"میں نے منع کیا تھا، تم ثمر سے نہیں ملو گی۔" عمر نے یاددہانی کروائی۔ شفا خاموش رہی۔

"میں کچھ بھی کہوں، تمہیں فرق نہیں پڑتا۔ تمہیں میری بات بکواس لگتی ہے۔" عمیر کے لہجے کی سختی بڑھ رہی تھی۔ شفا شرمندہ شرمندہ سی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسے عمیر بھائی کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔

"ایسی بات.... نہیں ہے عمیر بھائی! مجھے آج کے اکنامکس کے لیکچر کے بارے میں بھی پوچھنا تھا۔ اسی لیے ثمر کے پاس گئی تھی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"اکنامکس کا لیکچر کسی اور کلاس فیلو سے نہیں پوچھا جا سکتا تھا؟ یہ فون کس مرض کی دوا ہے؟ یا ثمر کے پاس جانا ضروری تھا؟"

"س.... سوری عمیر بھائی!" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ عمیر نے بغور اسے دیکھا۔ گو کہ اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ مگر چہرے پر شرمساری اور آنکھوں میں نمی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ تھوڑی بہت سختی کرنا پڑتی تھی۔ لیکن عمیر کا دل پتھر کا تو نہیں تھا چھوٹی لاڈلی بہن کا چہرہ دیکھ کر فوراً پسیج گیا۔

"شفا! میں تمہارا بھائی ہوں، دشمن نہیں ہوں۔ جو کہتا ہوں بھلائی کے لیے کہتا ہوں۔ ثمر اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اسی لیے میں منع کرتا ہوں کہ تم اس سے نہ ملو۔" انہوں نے رسان سے کہا۔

"عمیر بھائی! آپ یہ نہ سمجھیں۔ میں ضد میں آپ کی بات سے اختلاف کر رہی ہوں۔ آپ کی ہر بات میرے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ نے ثمر میں کیا برائی دیکھ لی ہے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔" اس نے عمیر کے لہجے میں نرمی آتے دیکھ کر جلدی سے سہیلی کی طرف داری کی۔

"شفا بچے! تم ابھی چھوٹی ہو۔ جو بڑے دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں، وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اسی لیے بہتر ہے، جو میں کہتا ہوں، اس پر عمل کرو.... اگر امی یا ابو زندہ ہوتے تو کیا تم ان کی بات سے انکار کرتیں؟ مجھے دوبارہ پتا نہ چلے کہ تم ثمر کی طرف گئی ہو۔ اگر اسے تم سے ملنے کا شوق ہو تو یہاں آ کر ملے.... تمہیں اس کے گھر جانے کی ضرورت نہیں۔" عمیر نے ایک بار پھر سخت لہجے میں کہا۔

"اور تم اپنی نیند رات میں پوری کر لیا کرو تو زیادہ اچھا ہو گا۔" اب روئے سخن سماہر کی طرف تھا۔ پھر انہوں نے چند گھونٹ پانی حلق میں اتارا اور کمرے میں چلے گئے۔

"اب انہیں میری نیند پر بھی اعتراض ہو گا۔" سماہر نے چڑ کر کہا۔ شفا نے شرمساری سے اسے دیکھا اور گود میں رکھی انگلیاں موڑنے لگی۔

"تم واقعی ثمر سے ملنے گئی تھیں؟" سماہر نے پوچھا۔

شفا نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے بتا کر چلی جاتیں۔ کم سے کم میں عمیر کے سامنے بات تو سنبھال لیتی۔" سماہر نے نرمی سے کہا۔

"آپ سو رہی تھیں بھابھی! میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور.... اور پھر مجھے لگا، آپ بھی مجھے منع کریں گی۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں کیوں منع کرتی بھئی۔" سماہر نے حیران ہو کر کہا۔ "مجھے تو خود ثمر سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ اچھی لڑکی لگتی ہے وہ۔"

"ہے ناں۔" شفا ایک دم خوش ہو کر بولی۔ "وہ سچ مچ بہت اچھی ہے بھابھی! میری بچپن کی دوست ہے۔ ہمیشہ سے ہمارے گھر آتی رہی ہے۔ شروع سے وہ لوگ ہمارے پڑوس میں رہ رہے ہیں۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ اچانک عمیر بھائی کو وہ بری کیوں لگنے لگی ہے اتنی سختی سے تو آج تک عمیر بھائی نے کسی کے لیے ناپسندیدگی نہیں دکھائی۔ بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو وہ ثمر کو بھی اسی طرح ٹریٹ کرتے تھے، جس طرح مجھے.... لیکن دو تین سال سے پتا نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے۔" شفا فکرمندی سے بول رہی تھی۔

"دیکھو شفا! مجھے تمہارا ثمر سے ملنا بالکل برا نہیں لگتا۔ لیکن اگر عمیر کو پسند نہیں ہے تو میرا خیال ہے، تمہیں نہیں ملنا چاہیے.... وہ کچھ کہہ رہے ہیں تو کسی بنیاد پر ہی کہہ رہے ہوں گے۔"

سماہر اسے رسانیت سے سمجھاتی رہی۔ شفا خاموشی سے اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی۔ لیکن اس کی شکل اب بھی لٹکی ہوئی تھی۔

"اب کیا ہوا؟" سماہر نے بغور اسے دیکھا اور دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"بھائی کی ڈانٹ سے خفا ہو گئی ہو؟"

"نہیں.... بھائی کی کسی بات سے خفا نہیں ہوتی۔ وہ میری بھلائی کے لیے ہی کہتے ہیں۔ لیکن بھابھی! عمیر بھائی کو غصہ زیادہ آنے لگا ہے ناں؟"

"ہاں.... غصہ تو زیادہ آنے لگا ہے۔" سماہر نے فوراً کہا۔

"شاید آج کل آفس میں کام کا پریشر زیادہ ہے۔ دو روز پہلے بتا تو رہے تھے۔ خیر! چھوڑو اس بات کو.... تم بتاؤ! ثمر سے کیا باتیں ہوئیں؟" اس نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں.... کالج کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہماری بیچ کا لانگ ٹرپ مری جا رہا ہے۔ ثمر بھی جا رہی ہے۔ وہ اپنی تیاریوں کے متعلق بتا رہی تھی۔"

"واؤ.... لانگ ٹرپ.... تم لوگوں کو تو بہت مزا آئے گا۔ پتا ہے ہمیں کالج یونیورسٹی کا کوئی ٹرپ مس نہیں کرتی تھی۔"

شفا نے سارے برتن سمیٹ کر سنک میں رکھے۔ پھر ایپرن باندھ کر برتن دھونے لگی۔ سماہر نے پتیلی میں بچے ہوئے چاول ایئر ٹائٹ باؤل میں نکالتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ پھر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

"تم نے اپنی پیکنگ کر لی؟"

"کس لیے؟" شفا کا ذہن کہیں اور الجھا تھا۔ اس کا

سوال سمجھی نہیں۔

"بھئی! ٹرپ پر نہیں جاؤ گی؟"

"عمیر بھائی جانے دیں گے؟" شفاء نے الٹا اسی سے پوچھا۔

"تم نے عمیر سے پوچھا؟"

"مجھے پتا ہے' وہ پرمیشن نہیں دیں گے۔ اسی لیے نہیں پوچھا۔ کہیں بس کھائی میں نہ گر جائے۔ یہ نہ ہو جائے' وہ نہ ہو جائے۔ جب جواب معلوم ہے ان کا تو پھر کیوں پوچھوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ویسے بھی ہم ہر سال مری جاتے تو ہیں۔ اب تو میں وہاں کے چپے چپے سے واقف ہو چکی ہوں۔ پھر کالج ٹرپ کے ساتھ جا کر کیا کروں گی۔"

"عجیب لڑکی ہو تم۔" سماہر نے تعجب سے کہا۔

"شادی سے پہلے ہم سب بھی چھٹیوں میں سیر کے لیے جاتے تھے۔ لیکن کوئی جگہ کتنی بار ہی دیکھی ہوئی کیوں نہ ہو' میں فرینڈز کے ساتھ کوئی ٹرپ نہیں چھوڑتی تھی۔ تمہیں فرینڈز کے ساتھ گھومنے پھرنے کا کوئی شوق نہیں ہے؟"

"شوق تو ہے۔" شفا نے ایک پل کے لیے ہاتھ روک کر کہا۔

"لیکن عمیر بھائی کی پسند' ناپسند میرے لیے زیادہ اہم ہے..... شادی کے ساڑھے پانچ سالوں میں آپ اتنا تو سمجھ ہی گئی ہوں گی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

سماہر نے بمشکل مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر عادل کا فیڈر تیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں عمیر سے پوچھتی ہوں۔ انہیں منانے کی کوشش کروں گی کہ تمہیں جانے کی اجازت دے دیں۔ ان کی پسند' ناپسند اپنی جگہ اہم سہی۔ لیکن تمہیں بھی تو اپنی فرینڈز کے ساتھ گھومنے پھرنے کا حق ہے۔ پھر یہی تو عمر ہوتی ہے انجوائے منٹ کی..... پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد کہاں موقع ملتا ہے۔ میری قسمت اچھی تھی کہ مجھے عمیر ملے۔ لیکن اگر تمہاری قسمت میں ایسا شوہر ہوا' جسے گھومنے پھرنے کا شوق ہی نہ ہو تو تمہیں حسرت تو نہیں رہے گی نا کہ نارورن ایریا بھی نہیں دیکھا۔"

"بھابھی! آپ کو لگتا ہے کہ عمیر بھائی مان جائیں گے؟"

شفا نے اس کی باقی تمام باتیں نظر انداز کرتے ہوئے پرجوش ہو کر پوچھا۔

"نہیں مانیں گے تو میں صرف تمہاری خاطر انہیں منالوں گی..... بس تم اپنی پیکنگ شروع کر دو۔" سماہر نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا اور کچن سے باہر نکل گئی۔ عمیر بھائی ہمیشہ اس کے لیے بہت متردد رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی اسکول کے کسی ٹرپ پر اسے جانے نہیں دیا تھا۔ بلکہ ہر سال اسے کہیں نہ کہیں سیر کروانے چند روز کے لیے ضرور لے جاتے تھے۔ ان کی شادی کے بعد بھی یہ معمول جوں کا توں تھا۔ تب ہی شفا نے کبھی ان سے اجازت کے لیے ضد نہیں کی تھی۔ بلکہ اس نے اس بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس بار اس کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ جائے۔ اس کی سہیلیاں بہت اصرار کر رہی تھیں اور اب بھابھی نے کہا تھا تو اسے یقین تھا' وہ عمیر بھائی سے ضرور اجازت لے دیں گی۔ تب ہی بھابھی سماہر واپس چلی آئیں۔

"شفا! ہدیہ کو آج اپنے ساتھ سلا لو..... عادل اتنا تنگ کرتا ہے۔ اس کی آنکھ کھل جائے تو دونوں مل کر میرا دماغ چاٹ جاتے ہیں۔" انہوں نے ایک ہاتھ میں ہدیہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے میں اس کی باربی تھی۔

"آجاؤ ہدیہ!..... رات کو کارٹون مووی دیکھیں گے۔"

اسے اور کیا چاہیے تھا۔ ہدیہ سے تو خوب دوستی تھی۔ سو گیلے ہاتھوں سے ہی اس کو گود میں اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

ابا کے رویے پر غور کرتے ہوئے اسے جانے کب نیند آگئی۔ آنکھ کھلی تو پتا چلا سیل فون دھیمے سروں میں بج بج کے کب کا خاموش ہو چکا تھا۔ سمیر کا نمبر تھا اور دو تین ایس ایم ایس بھی تھے۔

"بولو؟" تقی نے ہوا کی ہتھیلی پر پیغام لکھ بھیجا۔

"میں کب سے فون کر رہا ہوں۔ کدھر مر گیا تھا؟" چند منٹ بعد جواب آیا۔ سمیر اس کا بے حد قریبی اور بچپن کا دوست تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی رگ رگ تک سے واقف تھے۔

"یار! آنکھ لگ گئی تھی۔" اس نے بے زاری سے لکھا۔ ترنت جواب آیا۔

"کس سے؟"

"جوڈی فوسٹر سے۔"

"خبردار..... جوڈی پر ہمیشہ سے میری نظر رہی ہے۔"

"ہاہاہا..... وکٹری پوائنٹ تک جو پہلے پہنچے' ٹرافی اس کی ہوتی ہے بھائی صاحب!"

"اوئے..... دوست کے حق پر ڈاکا ڈالتے تجھے شرم نہیں آتی؟" سمیر نے جل کر پوچھا۔

"دوست کے حقوق تو جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں میں کب تک محتاط رہوں۔"

"مجھے کچھ نہیں پتا۔ بس بتا دیا میں نے' جوڈی تیری ہونے والی بھابھی ہے۔ اس پر بری نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہونے والی بھابھی..... ہوئی تو نہیں ناں۔" تقی نے مزے سے لکھ بھیجا۔ چند منٹ جواب نہیں آیا۔ سمیر یقیناً "لاجواب" ہوا تھا۔ پھر اس نے لکھا۔

"تو بڑا خبیث ہے تقی!"

"آپ جیسے دوستوں کی صحبت کا اثر ہے جناب! ورنہ بندہ کسی قابل کہاں۔" اس نے انکساری و عاجزی کی حد کر دی۔

"اچھا! بک بک بند کرو۔ فوافٹ کال کرو۔ ایک زبردست خبر سنانی ہے۔"

"موبائل میں اتنا بیلنس نہیں ہے۔ ایس ایم ایس پیکیج زندہ باد۔"

"بھوکے' شُہدے..... کبھی بیلنس رکھا بھی کرو۔" سمیر کو حساب برابر کرنے کا موقع ملا تھا۔ تقی کی جان جل کر خاک ہو گئی۔

"یہ تم نہیں کہو گے تو کون کہے گا؟ اتفاق سے تمہارے ابا ہر مہینے تمہیں پاکٹ منی دیتے ہیں۔ میرے ابا صرف طعنے دیتے ہیں۔"

"آ..... چھ..... آ..... تو مزاج یار اس لیے برہم ہے؟"

"سمیر! تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں۔ ہم بے زار بیٹھے ہیں یار!"

"ہاہاہا..... عادت ہی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی!"

"اچھا! خبر تو سناؤ۔"

"خوب یاد دلایا۔ بڑی اہم خبر ہے۔ گھر آکر سن جاؤ۔"

"تو آجا سمیر!..... خبر بھی سنا جا۔ اپنی کمپنی کی اینول رپورٹ کی سوفٹ کاپی بھی دے جانا۔ میں نہیں آ سکتا۔"

"کیوں..... تیرے پیروں میں مہندی لگی ہے؟"

"نہیں..... ابا کے بالوں میں خضاب لگا ہے اور وہ گیٹ کے عین سامنے کرسی بچھا کر بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے گھر سے نکلوں گا تو گالیاں سنوں گا۔ ویسے بھی انہوں نے نکمے' نالائق' نانہجار دوستوں سے ملنے سے منع کر رکھا ہے۔"

"ابا نے نالائق' نانہجار' نکمے دوستوں سے اینول رپورٹ مانگنے سے منع نہیں کیا؟"

"کیا تھا..... لیکن اب میں اتنا بھی تابعدار نہیں ہوں کہ ان کی ساری باتیں مانوں۔"

"قربان جاؤں تیری اس تابعداری پہ۔"

تقی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ سمیر نے اگلا پیغام لکھا تھا۔

"شام کو چکر لگاؤں گا۔ ڈائجسٹ خریدنے بھی جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے! پھر میں بھی شام کو ہی خبر سناؤں گا۔"

مختصر سی نیند اور سمیر سے تھوڑی سی گپ شپ نے اس کی طبیعت پر چھائی بے زاری کو ختم کر دیا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنی اسٹڈی ٹیبل پر آ بیٹھا۔

✡ ✡ ✡

"تو گویا آج سے میری نیند پر بھی پابندی ہوگی؟"

ساہر نے الماری کھولتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ وہ بدیہ کو شفا کے پاس چھوڑ کر آئی تھی۔ فیڈر اس نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور عادل کا نائٹ سوٹ نکالنے لگی۔

عمیر بہت منہمک ہو کر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ ساہر کی بات پر انہوں نے ایک نظر اسکرین سے ہٹا کر اس پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر ناراضی اور پیشانی پر سلوٹیں دکھائی دیتی تھیں۔

"آپ مجھے ایک ہی بار بتا دیں عمیر! اس گھر میں رہنے کے لیے مجھے کتنی پابندیاں سہنا ہوں گی؟ کس وقت اور کتنا سویا کروں؟ کس وقت جاگ جایا کروں؟ پانی کتنا پیا کروں؟ کھانا کتنی بار کھانے کی اجازت ہے؟ نوالے کتنے ہونے چاہئیں؟"

ساہر نے بیڈ کے دوسری طرف بیٹھ کر عادل کے کپڑے بدلنے شروع کر دیے تھے۔ وہ مسہری پہ لیٹا ہاتھ پیر چلا رہا تھا۔ ماں کی مداخلت پسند نہیں آ رہی تھی۔ تب ہی منہ بسورنے لگا۔ لیکن ساہر اس کے لاڈ اٹھانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"بلاوجہ بات مت بڑھاؤ ساہر! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ تم واویلا کرو۔" ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے عمیر نے سرد مہری سے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

"میری تو عام سی بات بھی آپ کو واویلا ہی لگتی ہے۔ اتفاق سے جو بات آپ نہیں کہتے، وہ آپ کی بہن کہہ دیتی ہے۔" ساہر نے جل کر کہا۔

"اب اس بات کا مقصد؟" عمیر نے سابقہ انداز میں لیکن تیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ دیکھیں! ہاتھ جوڑ کر گزارش کر رہی ہوں آپ سے... مجھے معاف رکھیں اس ذمہ داری سے۔ میں جاگ جاگ کر آپ کی بہن کی پہرہ داری نہیں کر سکتی۔" ایک دم اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"شفا نا سمجھ تو نہیں ہے۔ آپ کئی بار اسے منع کر چکے ہیں کہ ثمر سے نہ ملا کرے۔ کالج جاتی ہے۔ ثمر کے گھر سے ہماری دیوار ملی ہوئی ہے۔ شفا بھی دیکھتی ہے، سارا دن اس سے نت نئے لڑکے ملنے آتے رہتے ہیں۔ خود جب دیکھو بن ٹھن کر کہیں نہ کہیں جا رہی ہوتی ہے۔ یہ شرفا کے رنگ ڈھنگ تو نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود شفا ہر روز دوپہر میں اس کے گھر جاتی ہے۔ میں منع بھی کروں تو نہیں سنتی۔ میری بات کی اہمیت تو یوں بھی اس کے نزدیک صفر ہے۔ آپ بتائیں! پھر میں اپنی نیند کیوں برباد کروں؟" عادل کو گود میں لے کر فیڈر پلاتے ہوئے اس کے آنسو زار، زار بہہ رہے تھے۔

"شفا ہر روز ثمر سے ملنے جاتی ہے؟" عمیر کو اس کی بات سن کر جھٹکا لگا تھا۔ "نہیں سمجھا، وہ آج ہی گئی ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"آپ کو بتاتی تو آپ ڈانٹتے اسے۔ پھر وہ مجھ سے جھگڑتی کہ میں اس کی شکایتیں لگاتی ہوں۔ وہ تو ابھی بھی یہی سمجھ رہی ہے کہ میں نے آپ کو بتایا ہے۔ تازہ تازہ بے عزتی کروا کر آ رہی ہوں اس کے ہاتھوں۔"

"میں پوچھتا ہوں شفا سے۔" عمیر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے ٹی وی آف کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں عمیر... پلیز۔" ساہر نے سرعت سے منت بھرے انداز میں کہا۔

"آپ شفا سے باز پرس کریں گے۔ وہ آپ کے سامنے تو سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلا دے گی، لیکن بعد میں مجھ سے لڑائی کرے گی کہ میں آپ کو اس کے خلاف بھڑکاتی ہوں۔ کتنی چھوٹی ہے وہ مجھ سے رتبے میں بھی میں ہی بڑی ہوں۔ لیکن بعض اوقات اتنی بدتمیزی کر جاتی ہے کہ مجھے خود سے بھی شرمندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔ عمیر! میں نے آپ سے اس لیے تو شادی نہیں کی تھی کہ ذرا، ذرا سی باتوں پر آپ کی چھوٹی بہن میری بے عزتی کرے۔" عادل سو

چکا تھا۔ ساہر نے اسے کاٹ میں لٹاتے ہوئے کہا تھا۔

عمیر کو بے حد شرمساری محسوس ہوئی۔

"شفا ایسی نہیں تھی۔ اتنی بدلحاظ، ایسی بدتمیز... پتا نہیں اُسے کیا ہو گیا ہے۔" جھنجلاہٹ اور تشویش بھرے انداز میں انہوں نے کہا۔

"وہ ایسی ہی تھی عمیر! لیکن آپ کو کبھی میری بات پر یقین نہیں آیا۔" ساہر نے دھیمی آواز میں، لیکن سادگی اور کسی قدر خفگی سے کہا۔

"کم سے کم میری عزت اس نے کبھی نہیں کی۔ اس گھر میں آتے ہی اس نے مجھ سے دشمنی باندھ لی تھی۔ جو آج بھی جوں کی توں قائم ہے۔ میری ہر بات اسے قابل اعتراض لگتی ہے۔ میں جھوٹی اور مکار لگتی ہوں اسے۔ میری ہر اچھی بات کے جواب میں وہ ایسا جواب دیتی ہے کہ میں اور کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہتی۔"

"میں اسے سمجھاؤں گا ساہر! پلیز... تم اس کی باتوں کا برا مت مانا کرو۔" عمیر نے کہا۔

"کوشش تو کرتی ہوں عمیر! لیکن انسان ہوں میں بھی... عزت نفس کو تو نہیں مار سکتی۔ اگنور کرنے کے باوجود اس کی کوئی نہ کوئی بات مجھے ہرٹ کر دیتی ہے۔ میں مانتی ہوں شفا دل کی بری نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ ابھی بچی ہے اور نا سمجھ بھی ہے۔ غلطی اس کی نہیں۔ اس کی سہیلیوں کی زیادہ ہے، جو اس کے کان بھرتی ہیں اور اسے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتی رہتی ہیں۔ خصوصاً "یہ ثمر..."

عمیر خاموش بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے تاثرات ذہنی الجھن کا پتا دیتے تھے۔ ساہر نے کن اکھیوں سے عمیر کو دیکھا۔ پھر اگلا پتا پھینکا۔

"اب ضد کر رہی ہے کہ کالج ٹرپ کے ساتھ مری جائے گی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی۔ اس سے کہو، آرام سے گھر میں بیٹھے۔" عمیر نے تیز لہجے میں کہا۔

"عمیر! پلیز شفا کو جانے دیں۔ ورنہ وہ یہی سمجھے

گی' میں نے آپ سے اسے منع کرنے کے لیے کہا ہے۔" سماہر نے فکر مندی سے کہا۔

"تم بے فکر رہو۔ میں خود اسے سمجھادوں گا۔"

"اچھا! آپ مت کہیئے گا۔ میں خود بتادوں گی۔ کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ بدتمیزی کرے گی مجھ سے۔ لیکن آپ جس انداز میں سمجھائیں گے' وہ ہرٹ ہوجائے گی۔ جیسی بھی ہے' ہے تو ہماری اپنی۔۔۔ بس اس میں تھوڑی عقل کی کمی ہے۔ ابھی کم عمر بھی تو ہے۔ تھوڑی بڑی ہوگی تو عقل بھی آجائے گی۔ اسے میری بات بری لگ جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے ابھی تک میری حیثیت کو قبول ہی نہیں کیا۔ لیکن میں تو اسے اپنی بہنوں کی طرح ہی عزیز سمجھتی ہوں۔"

سماہر محبت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ عمیر نے تعجب و خوش گواری کے ساتھ اسے دیکھا۔

"کیا چیز ہو تم سماہر! ابھی اس سے ناراض تھیں۔ ابھی اس کی طرف داری کررہی ہو۔" انہوں نے متبسم لہجے میں کہا۔

سماہر جھینپ کر ہنس دی۔

"اپنوں سے کتنی دیر ناراض رہا جاسکتا ہے؟"

"پچھلی بار شاپنگ نہ کروانے پر مجھ سے تو چار دن تک ناراض رہی تھیں۔" عمیر نے مزے سے یاد کروایا۔ سماہر پھر ہنس دی۔

"ہر بات میں اپنے مطلب کی بات نہ ڈھونڈ لیا کریں۔"

"بھئی! دور ہی ایسا ہے۔ مطلب کی بات ڈھونڈنا ہی پڑتی ہے۔" انہوں نے سابقہ انداز میں کہا۔

"آپ کو یاد ہے عمیر! شادی کے بعد آپ نے کہا تھا۔ شفا آپ سے بہت چھوٹی ہے' اس لیے آپ اسے بہنوں کی طرح نہیں بیٹی کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ میں شفا کو بیٹی نہیں مان سکتی تھی۔ کیونکہ اتنی بڑی لڑکی کی ماں بننے کے لیے مجھے خود عمر رسیدہ ہونا پڑتا اور آپ کو پتا ہے لڑکیاں کبھی بڑی نہیں ہونا چاہتیں۔ اسی لیے میں نے اسے اپنی بچی والی بہن سمجھ لیا۔ آپ بتائیں۔۔۔ کوئی بڑی بہن چھوٹی بہن سے کب تک ناراض رہ سکتی ہے؟"

عمیر مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے نظروں میں ستائش ہی ستائش تھی۔ انہیں جیسے سماہر کے خیالات سن کر عجیب سی طمانیت اور فخر محسوس ہورہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ اب اس کی نسبت سے مجھے بھائی نہ بنالینا؟" انہوں نے ٹکڑا لگایا۔ سماہر کا موڈ خاصا خوش گوار ہوچکا تھا۔ اطمینان سے بولی۔

"شکر الحمدللہ! بھائیوں کی کمی نہیں ہے مجھے۔ دو میرے ابا کے بیٹے اور تین تایا ابا کے بیٹے۔۔۔ یعنی کل ملا کر ماشاءاللہ پانچ بھائیوں کی بہن ہوں میں۔"

"بھائیوں کی تعداد کا ڈراوا دے رہی ہو؟" وہ محظوظ ہوکر بولے۔

"ڈراوا دینا ہوتا تو اس وقت دیتی' جب یونیورسٹی کے اسٹاپ پر اپنی نسان روک کر لفٹ کی آفر کرتے تھے روز۔۔۔ بلاناغہ۔"

اس نے جتنی بے ساختگی سے کہا تھا۔ اتنا ہی ان دنوں کو یاد کرکے عمیر نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"کبھی کبھی مجھے تم پر حیرانی ہوتی ہے سما۔" عمیر نے کہا۔ وہ موڈ میں ہوتے تو اسے ایسے ہی پکارتے تھے۔

"کس بات پہ؟" سماہر نے استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"میں نے سن رکھا ہے بیویاں' شوہروں کو اپنے بھائیوں کا ڈراوا ضرور دیتی ہیں کہ جی! ہم سے کوئی زیادتی کی۔۔۔ کوئی ظلم کیا تو میرے بھائی آپ سے نمٹ لیں گے۔ لیکن تم نے کبھی نہیں کہا۔" ان کے انداز میں شرارت تھی۔ سماہر اطمینان سے بولی۔

"کیونکہ میں جانتی ہوں' آپ مجھ پر کوئی ظلم نہیں کرسکتے۔ جو انسان اتنی محبت کرتا ہو' وہ ظلم کرہی نہیں سکتا۔ جب مجھے آپ کی محبت پر شک ہی نہیں تو بھائیوں کا نام لے کر ڈرانے کی کوشش کیوں کروں؟"

"ہماری شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟" اچانک عمیر نے پوچھا۔

"ساڑھے پانچ سال' ماشاءاللہ۔" سماہر حیران ہوئی اس سوال پر۔ "کیوں؟"

"ساڑھے پانچ سال میں تمہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ اتنی اچھی بات شوہر سے اتنے فاصلے پر کھڑے ہوکر نہیں کرتے۔"

سماہر جو سنجیدگی سے ان کی بات سن رہی تھی۔ ایک دم ہنس دی۔ ساتھ ہی تکیہ عمیر کو کھینچ مارا۔ جسے عمیر نے ہنستے ہوئے کیچ کرلیا۔

"میں رومانٹک ہونے کی کوشش کررہا ہوں۔ تم مجھ پر تشدد کررہی ہو۔۔۔ بیوی! تمہیں خدا سمجھے۔"

"اب الماری سے کیا ہتھوڑا برآمد کروگی؟" اسے الماری کھولتے دیکھ کر عمیر نے پوچھا۔

"آپ کی بات سے یاد آیا' بہت دن سے گھر والوں کی تصویریں نہیں دیکھیں۔ سب یاد آرہے ہیں۔" وہ البم نکال کر لائی اور بیڈ پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔

"تمہارے تایا جان کا غصہ ابھی تک نہیں اترا۔" عمیر بھی اس کے ساتھ تصویریں دیکھنے لگے۔ تایا جان کی تصویر پر رکتے ہوئے انہوں نے نہ پوچھا' نہ بتایا۔ بس یوں ہی تبصرہ کیا تھا۔ سماہر کے لبوں پر دھیما سا تبسم جھلکا۔

"ان کا غصہ جلدی نہیں اترتا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ میں نے بھی انہیں منانے کی کوشش نہیں کی۔ شادی کے بعد ایک بار ہی ان سے ملنے چلی جاتی تو ان کا سارا غصہ۔۔۔ ساری ناراضی ختم ہوجاتی۔ لیکن میں خود بھی ناراض تھی ان سے۔ کیا تھا جو وہ میری بات مان لیتے۔"

"اگر تم چاہو تو میں تمہیں ان سے ملوانے لے جاسکتا ہوں۔ ان کی ناراضی دور ہوگی تو تم کو خوشی ملے گی۔" عمیر نے کہا۔

"نہیں عمیر۔۔۔ تایا جان زبان کے بہت کڑوے ہیں۔ آپ کو کوئی الٹی سیدھی بات کہہ دی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ اس لیے رہنے دیں۔" اس نے قطعیت سے کہا۔ مگر لہجے سے اداسی چھلکتی تھی۔

"ٹھیک ہے! جیسے تمہاری مرضی۔۔۔ اگر زیادہ اداس ہو تو کچھ دن امی کی طرف رہ آؤ۔۔۔ میں اگلے اتوار کو تمہیں واپس لینے آجاؤں گا۔" عمیر نے احساس کرتے ہوئے کہا۔

"ہیں۔۔۔ سچ۔" وہ پرجوش ہوئی' پھر جاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

"شفا گھر میں اکیلی کیسے رہے گی؟ آپ تو صبح کے گئے شام کو آتے ہیں۔ میں ایسا کروں گی' کسی روز صبح صبح چلی جاؤں گی۔ شام کو آفس سے واپسی پر آپ مجھے پک کرلیجئے گا۔ شفا کو دو' تین گھنٹے ہی اس طرح تنہا گزارنے پڑیں گے یا میں اس سے پوچھ لوں گی۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی چلے' کیوں؟"

"ہوں۔۔۔" عمیر نے متفق ہونے کے باوجود محض اتنا ہی کہا تھا۔ سماہر کو کچھ خیال آیا تو البم ان کی طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔

"آپ البم دیکھیں۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"کدھر۔۔۔"

"شفا کا موڈ اتنا خراب ہوا تھا۔ ذرا اس کو منا کر آتی ہوں۔" سماہر نے کہا۔

"تمہارے اسی لاڈ' پیار نے اسے بگاڑا ہوا ہے سماہر!" عمیر کو سخت اعتراض تھا۔

"اس بے چاری کے سر پر نہ ماں' نہ باپ۔۔۔ سختی کرنے کے لیے آپ جو ہیں۔ اب کوئی تو ہو جو اس کے لاڈ اٹھائے۔" سماہر نے سادگی بھرے انداز میں دھیمی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ عمیر نے غیر دلچسپی سے البم کے دو چار صفحے پلٹے۔ پھر بے زاری سے البم پرے کھسکا کر سر کے نیچے ہاتھوں کا سرہانہ بنا کر لیٹ گئے۔

ان کا ذہن مستقل سماہر اور شفا میں الجھا ہوا تھا۔ وہ محسوس کررہے تھے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماہر جتنی کو آپریٹو اور کمپرومائزنگ ہوتی جارہی تھی' شفا اتنی ہی جھگڑالو اور بدلحاظ بن رہی تھی۔ عمیر اس صورت حال سے بے حد پریشان تھے۔ انہیں اکثر و بیشتر شفا پر غصہ بھی آجاتا۔ تعجب انہیں سماہر پر ہوتا تھا' جو بہت تحمل اور خندہ پیشانی سے اس کی بدتمیزیاں

سہ رہی تھی۔ اگرچہ آج کی طرح کبھی کبھی بے زار بھی ہوجاتی۔ لیکن پھر ساتھ ہی انہیں شفا کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آنے کی تاکید بھی کرتی۔۔۔ اور سچ بات ہے ساہر کی ان ہی باتوں نے عمیر کے دل میں اس کی محبت اور قدر کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ دوسری جانب وہ شفا کے لیے فکر مند رہنے لگے تھے۔

جب امی، ابو کا انتقال ہوا تو وہ خود بھی بہت چھوٹے تھے۔ لیکن شفا کو جو عمر میں ان سے کئی سال چھوٹی تھی اور اس وقت بالکل بچی سی تھی، انہوں نے بہن کے بجائے بیٹی سمجھنا شروع کردیا تھا۔ وہ اس سے اتنی ہی محبت کرتے تھے، جتنا ایک باپ، بیٹی سے کرتا ہے۔ وہ اس کا اتنا ہی خیال رکھتے، اتنی ہی پروا کرتے، جتنا ایک باپ کرسکتا ہے۔ بلکہ ان کی محبت شفا کے لیے باپ سے بھی بڑھ کر تھی۔ شاید اس لیے، کیونکہ ان کی محبت بڑے بھائی اور باپ کی تھی۔ شفا اور ان میں مثالی دوستی بھی تھی۔ لیکن ساہر سے شادی کے بعد جیسے سب کچھ بدلنے لگا تھا۔

ساہر سے انہوں نے پسند سے شادی کی تھی۔ ان دنوں وہ جس آرگنائزیشن سے وابستہ تھے۔ ساہر اپنے ایم بی اے کی انٹرن شپ کے سلسلے میں وہاں آئی تھی۔ چند ہفتے اس نے عمیر کی سپرویژن میں کام کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا اور یہ سرسری ملاقاتیں کب محبت کا سبب بن گئیں۔ عمیر جیسے سنجیدہ اور غیر رومانوی بندے کو پتا تک نہ چل سکا۔

بہرحال شادی ہونے تک شفا گھر میں بھابھی آنے کے خیال سے، بہت پرجوش تھی۔ لیکن شادی کے کچھ روز بعد ہی اس کے ساہر سے جھگڑے شروع ہوگئے تھے۔ غالباً" وہ بھائی کی بٹی ہوئی توجہ برداشت نہیں کرپا رہی تھی اور اس کا سارا غصہ ساہر پر نکلتا تھا۔ ساہر جھنجلا کر عمیر سے شکایت کرتی تو عمیر اسی کو ڈانٹ دیتے کہ بہرحال وہ عمر اور رتبے میں شفا سے بڑی تھی۔

عمیر کا خیال تھا، اسے چڑنے کے بجائے شفا سے محبت سے پیش آنا چاہیے۔ وہ بچی ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔ لیکن ہوا کچھ یوں کہ عمیر کی ڈانٹ اور تلقین سن سن کر ساہر میں تو سمجھ داری اور بڑا پن آگیا۔ لیکن شفا عمر کی منازل بڑھنے کے ساتھ سمجھ داری کی سیڑھیاں اترنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ ساہر سے بدتمیزی سے پیش آتی۔ اس سے زبان چلاتی اور اپنی من مانی کرتی۔ وہ ہر حربہ آزماتی، جس سے ساہر کو زچ کیا جاسکے۔

عمیر کو محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید ان کی جانبداری سے شہہ پاکر شفا خود سر ہوگئی ہے اور اپنے ہر عمل کو درست سمجھنے لگی ہے۔ کسی حد تک ان کی سوچ درست بھی تھی۔ لیکن اب وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شفا کی خودسری پر کس طرح قابو پائیں۔

ثمر سے اس کی ملاقات والی بات نے آج یہ بھی ثابت کردیا تھا کہ اس نے صرف ساہر کی ہی نہیں عمیر کی باتوں پر بھی کان دھرنا بند کردیے ہیں۔ اپنی ملازمت اور سائیڈ بزنس کی وجہ سے وہ اتنا مصروف رہتے تھے کہ کسی اور پریشانی کو ذہن پر سوار کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ لیکن شفا کی بدمزاجی ان کے ذہن پر سوار ہوچکی تھی اور وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ انہیں اس کا کیا علاج کرنا چاہیے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



نعیمہ ناز

"دادو! آپ میری بے حد و بے حساب محبت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔" ان کی بات سن کر وہ سچ مچ اچھل پڑا۔

محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔" دادو رس ملائی کھاتے ہوئے بڑے خوش تھے۔

"دادو! میں اس وقت ساری توجہ اپنی اسٹڈیز کو دینا چاہتا ہوں آپ پلیز ایسی باتیں نہ کریں۔"

"یار! تم تو سن ساٹھ کی دہائی کی کسی ہیروئن کی طرح ری ایکٹ کر رہے ہو، جس سے ہیرو نے اظہار محبت کیا ہو۔" دادو نے اسے چھیڑا۔

"اب بس کریں، کتنا میٹھا کھانے لگے ہیں آپ، طبیعت خراب ہو گی تو مجھے پریشان کریں گے۔" ذیشان نے ان کے سامنے سے رس ملائی کا پیالہ ہٹایا جس میں سے دوبارہ میٹھا لینے کے لیے وہ پر تول رہے تھے۔

"تمہیں ڈاکٹر کس لیے بنایا ہے؟" دادو نے اسے گھورا۔

"جی ہاں اسی لیے بنایا ہے کہ آپ بد پرہیزیاں کر کر کے بیمار ہوں اور میں

مکمل ناول



آپ کا علاج کر کر کے ہلکان ہوتا ہوں۔" پوتے نے جواباً "انہیں گھورا اور رس ملائی کا پیالہ واپس فریج میں پہنچایا۔

"کھانے دے یار۔ مجھے شوگر تھوڑی ہے جو میٹھے سے بھی پرہیز کروں۔" دادو نے پیالہ واپس فریج میں جاتا دیکھ کر دہائی دی۔

"ابھی نہیں ہے نا' مگر اسی رفتار سے کھاتے رہے تو ضرور ہو جائے گی۔"

"بیٹے! میں نے تجھے ڈاکٹر بنایا تھا تو جلاد کیسے بن گیا؟" دادو نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر خالی پیالہ اور چمچہ میز پر رکھ دیا۔

"ہائے ہائے! اس دن کے لیے پالتے ہیں لوگ' اولاد کی اولاد کو کہ بڑے ہو کر دادو کے آگے سے رس ملائی کی ڈش اٹھالیں۔" دادو کی تاسف بھری آواز میں شرارت صاف جھلک رہی تھی۔

"اچھا' بس اب سن ساٹھ کی دہائی کا ہیرو بننے کی ضرورت نہیں ہے جسے اس کی ہیروئن نے اظہار محبت پر تھپڑ مار دیا ہو۔" ذیشان نے فوراً "حساب بے باق کیا۔

"ٹھیک ہے پوتے! جب تیری بیوی گھر آئے گی نا۔ تو ہم دونوں مل کر خوب میٹھی چیزیں کھائیں گے اور تجھے جلائیں گے مگر....." وہ کچھ مایوس سے ہوئے "حمیدہ بانو تو ابھی کھانا پکانے میں اتنی طاق نہیں' سکھانا پڑے گا اسے' خاص طور پر میٹھی ڈشیں۔" انہوں نے فوراً "منصوبہ بنایا۔

"اپنے یہ شان دار منصوبے اور اس سے بھی شان دار پوتی کو سنبھال کر رکھیں' میں ہی ملا ہوں ایک قربانی کا بکرا۔" ذیشان لڑنے کے موڈ میں تھا۔

"یار پوتے' اسے اپنے دادو کی وصیت سمجھ لے' آخری خواہش سمجھ لے۔" وہ یک بیک سنجیدہ ہو گئے

"لو آ گئے اب' اموشنل بلیک میلنگ پر۔" وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

"میں جانتا ہوں بیٹے! تم ہی کیا اس گھر میں موجود ہر فرد اس رشتے کو میرا پاگل پن کہے گا مگر میں مجبور ہوں اپنے دل کے ہاتھوں اور اس محبت کے ہاتھوں جو مجھے تم دونوں سے ہے۔ تم میں سے ایک میرا دل ہے' ایک میری روح۔ میں چاہتا ہوں' میرا دل' میری روح دونوں اکٹھے رہیں۔ بے شک وہ بدگمان ہے۔ بگڑی ہوئی ہے' شاید کسی حد تک قابل بھی نہیں ہے مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تم یہ سب ٹھیک کر سکتے ہو' اس کی خامیوں کو خوبیوں میں بدل سکتے ہو' تم اسے اپنے قابل بنا سکتے ہو شانی!" انہوں نے پر امید نظروں سے ذیشان کو دیکھا۔

ان کے بوڑھے چہرے پہ بیک وقت مایوسی اور اداسی بھی تھی اور التجا اور امید کے رنگ بھی نمایاں تھے۔

"دادو!" ذیشان نے بے بسی سے ان کے جھریوں بھرے بوڑھے ہاتھ تھام لیے۔

"دادو پلیز مجھے اس امتحان میں مت ڈالیں' میں تو خود ابھی اپنا کیریئر اپنی زندگی بنانے کی کوشش کر رہا ہوں' میں کیسے کسی اور کو بدل سکتا ہوں یا کچھ بنا سکتا ہوں؟ دادو میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں' آپ اچھی طرح جانتے ہیں' میں آپ کی خوشی چاہتا ہوں اس سے بڑھ کر دنیا میں میرے لیے اور کچھ بھی نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میرا کیریئر' میری کامیابی آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش' سب سے بڑی خوشی ہے' میں آپ کی اس خواہش کو' اس خوشی کو اسی شان دار طریقے سے پورا کرنا چاہتا ہوں' جیسے آپ چاہتے ہیں' جیسے آپ کی ہمیشہ آرزو رہی ہے' اور اس کے لیے مجھے یکسوئی اور دلی اطمینان چاہیے' میں ایسے کسی بھی رشتے میں بندھ کر اپنی سوچ کو بھٹکانا نہیں چاہتا اور دوسری طرف....." ذیشان نے ایک گہری سانس لی۔

"میں آپ کو انکار کر کے' مایوس کر کے' اپنے دل کا بوجھ نہیں بنا سکتا' بار ندامت اٹھانے کی سکت نہیں ہے مجھ میں' آپ ہی بتائیے دادو' میں کیا کروں۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟" وہ اپنی روشن' اور ذہین آنکھوں سے دادو کی طرف دیکھنے لگا۔

"بچے' تم اتنا پریشان مت ہو' میں نے تم سے اپنی فقط خواہش کا اظہار کیا ہے' کوئی حکم نہیں' زبردستی نہیں' تم اچھی طرح سوچو' پھر جو تمہارا دل کہے مجھے بتا دینا' نادم ہونے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' جو تمہاری خوشی اور مرضی وہ میری خوشی۔" دادو نے اس کی کشادہ پیشانی چوم لی۔

"دو چار سال میں اچھی طرح سوچ کر جواب دے دوں؟" دادو کی وضاحت سن کر وہ ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

"جتنے سال چاہو' سوچ لو' بس اتنا خیال رکھنا کہ یہ چراغ بجھنے سے پہلے جواب دے دینا۔" دادو نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ذیشان نے کچھ کہے بغیر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ یہ اس کی بچپن کی عادت تھی وہ جب بھی کنفیوز ہوتا' پریشان ہوتا یا مایوس' اسی طرح ان کی گود میں سر رکھ دیتا اور دادو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے رہتے' یہ نرم ملائم جادو اثر لمس دھیرے دھیرے اسے یا تو پرسکون کر دیتا یا گہری نیند کی وادی میں لے جاتا اس وقت بھی یہی ہوا' وہ اپنے سارے تفکرات بھلائے دھیرے دھیرے پرسکون ہوتا جا رہا تھا۔



کمرا بہت کشادہ نہیں تھا مگر روشن تھا کہ سورج نکلتا تو دن ڈھلے تک اس کی کرنیں کھڑکیوں اور روشن دانوں کے ذریعے چھلانگ مار کر اندر آجاتیں' روشنی کی ایک ایسی ہی شعاع اس زاویے سے کھڑکی سے اندر آرہی تھی کہ اس میں ناچتے گردوغبار کے ذرات اسے صاف نظر آرہے تھے' حسب عادت دانتوں سے ناخن چباتی ہوئی وہ بڑے غور سے اس رقص کو دیکھ رہی تھی۔

"فضا میں ہر وقت گردوغبار اور جراثیم ہوتے ہیں۔" اسے اسکول کی سائنس کی کتاب کا سبق یاد آیا۔

"ہوتے ہوں گے' مجھے کیا' فضا میں ہر وقت گردوغبار رہے یا ستارے موتی مجھے کیا فرق پڑے گا۔" بے حد کڑواہٹ کے ساتھ وہ سوچ رہی تھی' ناخن کترنے کا شغل اب بھی جاری تھا۔

"بیٹی! یوں ناخن نہیں کترتے' بری بات ہے" دادو اسے بہت دیر سے یوں دیکھ رہے تھے' ٹوکے بغیر نہ رہ سکے۔

"آپ کو کیا تکلیف ہے میرے ناخن کترنے سے؟" حمیدہ بانو نے بدتمیزی کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیے۔

"ناخن میں جراثیم ہوتے ہیں' منہ میں جائیں گے۔" دادو نے تحمل سے اسے سمجھایا۔

"کیسے جراثیم! کینسر کے یا ایڈز کے؟" وہ اسی کڑواہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

"کسی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟" دادو نے غور سے اس کا چہرہ دیکھ کر پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ نہ سکے' سیاہ بھنورا سی آنکھوں میں نمی سی تھی مگر غصے کے ساتھ' تنے ہوئے کتابی چہرے پہ دنیا جہاں کی بے

زاری اور تلخی بجی ہوئی تھی۔
حمیدہ نے جواب دینا گوارا نہ کیا' اپنے شغل میں مصروف رہی۔
"تمہارے کپڑے کتنے میلے ہو رہے ہیں۔ بال بھی سارے الجھے ہوئے' کب سے کنگھا نہیں کیا۔ چلو اٹھ کر نہالو' دوسرے کپڑے پہنو' بالوں میں کنگھا کرو' ایسی میلی کچیلی کیوں پھرتی رہتی ہو؟" دادو نے اس کی بے رخی' بے نیازی اور بدتمیزی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اسے پھر ٹوکا۔
"بچپن سے اسی حلیے میں رہتی آئی ہوں۔ یہاں آکر کون سے سرخاب کے پر لگ گئے مجھ میں" حمیدہ بانو نے پھر ٹکا سا توڑ جواب دیا۔
"اپنے بوڑھے دادا سے کب تک بدلہ لو گی بیٹی! اب تو معاف کر دو۔ عمر کا جھٹپٹا ہے' کون جانے کب سورج غروب ہو جائے۔" وہ ازحد رنجیدہ ہو کر اس سے مخاطب ہوئے تھے۔
"آپ کو میری باتیں سننی پڑیں گی' جب تک میں زندہ ہوں یا جب تک آپ" وہ سنگ دلی اور بے مروتی سے بولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"ہونہہ! اٹھارہ سال تک بڈھے کو خیال نہ آیا' اب بڑی ممتا جاگ رہی ہے' وہ بھی مجھے یہاں لا کر ان کے سروں پہ پٹخ دیا گیا۔ کون سا کبھی پتا لگانے کی کوشش کی کہ میں زندہ بھی ہوں یا مر گئی' کس حال میں ہوں' کیسے زندگی گزار رہی ہوں۔" حمیدہ بانو کے دل و دماغ میں تلخی اور نفرت کوٹ کوٹ کے بھر گئی تھی۔
"اب یہاں بیٹھنا بھی ایک مصیبت' بڑے میاں کے بھاشن ہی ختم نہیں ہوتے' وہاں جاؤ تو ان عورتوں کی ڈانٹ پھٹکار سنو' یا الٹی سیدھی باتیں۔"
وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ٹی وی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی' بلقیس چچی کے پاس ایک خاتون بیٹھی تھیں' بہت گوری اور اتنی ہی فربہ' حمیدہ نے دونوں کو نظر انداز کر کے کچن میں جانا چاہا' ماہم کے پاس جو چولہے کے آگے کھڑی جانے کیا پکا رہی تھی' اتنے سارے لوگوں میں ایک وہی تھی جو ذرا ڈھنگ سے

اس سے بات کر لیتی بغیر کسی طنز اور ڈانٹ ڈپٹ کے' اس کا نرم لہجہ' ہمدردی اور دلجوئی کا انداز حمیدہ بانو کو اچھا لگتا تھا۔ ماہم اسے یوں لگتی جیسے گرم و خشک صحرا میں ایک ہرا بھرا نخلستان۔
"یہ کیا نئی ماسی رکھ لی تم لوگوں نے؟" اجنبی خاتون نے بلقیس چچی سے پوچھا۔
"صداقت کی بیٹی ہے۔ پچھلے مہینے آئی ہے' یہاں مستقل رہے گی۔" بلقیس چچی نے بے زاری سے اسے دیکھتے ہوئے اپنی مہمان کو بتایا۔
"ہائیں.... صداقت کی بیٹی؟" وہ اچھل پڑیں۔ "کریم چچا کی پوتی اور اس حلیے میں' ایسا کیا ہو گیا اور اس کی ماں اور ننھیال؟ وہاں سے کیسے یہاں آ گئی؟" انہوں نے ایک ہی سانس میں سارے سوال پوچھ ڈالے۔
"دو سال پہلے ماں کا انتقال ہو گیا تھا' اب اس کے ماموں اچانک پچھلے مہینے اسے یہاں لے آئے کہ جی آپ کی امانت ہے' آپ کا خون ہے' یہیں رہے تو بہتر ہے' ان کی اپنی چھ بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں' پرائیویٹ نوکری' اب وہ اپنے بچوں کو پالتے یا اسے سنبھالتے' بس کچھ اس طرح کی کہانیاں سنا کر اور باتیں بنا کر چلے گئے۔"
بلقیس چچی نے مختصراً" ساری داستان یوں سنائی کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔
"کریم چچا نے رکھ لیا؟" خاتون کی تسلی نہیں ہوئی تھی ابھی۔ انہوں نے مزید وضاحت چاہی۔
"کیوں نہیں رکھیں گے' وہ تو بس دیکھتے ہی فدا ہو گئے۔ ہمارے سروں پہ بٹھا دیا اس مصیبت کو' ایک مہینہ ہو گیا جھیلتے ہوئے اور نہ جانے کتنا جھیلنا پڑے گا۔" وہ بڑبڑائیں۔
"کچھ عجیب ہی لڑکی ہے یہ تو' نہ سلام نہ دعا اور حلیہ دیکھو۔ بالوں میں لگتا ہے چار دن سے کنگھا نہیں پھیرا' کپڑے دیکھو' کیسے میلے کچیلے ہو رہے ہیں' کوئی کہنے سننے والا نہیں ہے۔" مہمان خاتون حیران ہو ہو کر مزے لے لے کر باتیں بنا رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ سے بدتمیز اور زبان دراز بھی بہت ہیں' ایک بار میں نے ٹوک دیا تھا' وہ جواب دیا کہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی' میں تو اب کچھ نہیں کہتی۔ کون اپنی بے عزتی کروائے۔" بلقیس چچی نے منہ بنایا۔
"بالکل اپنی ماں پہ گئی ہے' اللہ توبہ' مرے ہوئے کی برائی نہیں کرنا چاہیے مگر اس کی ماں بھی تو ایسی ہی لڑاکا اور زبان دراز تھی۔ آئے دن کے فضیحتوں سے تنگ آکر ہی ابا میاں نے الگ کر دیا تھا۔ پھر بھی چین نہیں آیا' لڑائی جھگڑے' تو تکار' بے چارہ صداقت' غرض اپنی جان سے ہی چلا گیا' اور وہ تو جھٹ سے اپنے میکے حیدر آباد میں جا کر یوں آباد ہو گئی جیسے اسی انتظار میں تھی۔" بلقیس چچی نے توبہ تلا کرتے ہوئے ماضی کی راکھ کریدی۔ ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا مگر بس یونہی زبان کا چٹخارا۔
عذرا جہاں جو دادا کی بھتیجی بھی تھیں اور ماضی کے سب قصے کہانیوں سے کسی حد تک واقف بھی' دلچسپی سے انہیں سن رہی تھیں۔
"اللہ بخشے وہ بھی عجیب ہی عورت تھی' شادی ہو گئی مگر دل میکے میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ صداقت بھائی کو حیدر آباد لے جانا چاہتی تھی نا۔ صداقت بھائی راضی نہیں تھے' بے چارے کی تو زندگی تباہ ہو گئی تھی شادی کے بعد۔" عذرا جہاں نے بھی گزرے ہوئے کل کو یاد کیا۔
"اب یہ آئی ہیں دیکھو کیا گل کھلاتی ہیں یہاں.... ارے ماہم! چائے نہیں بنی ابھی تک۔" بلقیس چچی نے بیٹی کو آواز لگائی۔
"آ رہی ہوں امی! بس پانچ منٹ۔" ماہم نے کچن سے ہی جواب دیا اور جلدی جلدی ٹرے سیٹ کرنے لگی۔
عذرا جہاں جنہیں وہ پھپھو کہتی تھی۔ ان کے آنے سے پہلے وہ گاجر کا حلوہ بنا رہی تھی' جو آخری مراحل میں تھا' بس اسی میں ہی تھوڑا وقت لگ گیا۔ اس نے ایک نظر ٹرے پہ ڈالی کہ کسی شے کی کمی تو نہیں' گاجر کا حلوہ' کباب' نمکو اور آلو بخارے کی چٹنی۔

"حمیدہ! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں ابھی آئی۔" اس نے حمیدہ کو ہدایت کی' حالانکہ وہ پہلے سے ہی بیٹھی ہوئی تھی' اس کی ہدایت پہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔
ماہم واپس آئی اور چائے دم کرنے لگی۔
"تم نے دوپہر کو سب کے ساتھ کیوں نہیں کھایا کھانا؟"
"دل نہیں چاہ رہا تھا۔" حمیدہ بانو اداسی سے بولی۔
"کیا دل نہیں چاہ رہا تھا' کھانا کھانے کو' یا ہمارے ساتھ کھانے کو؟" ماہم چائے کے برتن نکالنے لگی۔
"دونوں ہی باتیں نہیں۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔
"ایک بات کہوں؟"
"نہیں"
"کیوں؟"
"مجھے معلوم ہے' آپ کیا کہیں گی۔"
اچھا' کیا کہوں گی بھلا؟" ماہم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
"آپ بھی مجھے یہی تلقین کریں گی کہ اس جانوروں کے حلیے سے نکل کر انسانوں کے حلیے میں آ جاؤ۔" حمیدہ بانو نے کباب کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔
"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔" ماہم نے ایک گہری سانس لی۔ بہت ٹیڑھی کھیر تھی حمیدہ بانو۔ اسے چند دنوں میں ہی اندازہ ہو چلا تھا۔
"مجھے جو لوگ اچھے نہیں لگتے' ان کی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی' پھر اس پر عمل کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" حمیدہ بانو نے وجہ بتائی۔
"چاہے ان کی بات صحیح کیوں نہ ہو؟"
"ہاں!" اس نے قطعیت سے جواب دیا۔
"بہت شدت پسند ہو تم حمیدہ! ایسے کیسے زندگی گزارو گی۔" ماہم نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔
"دوسروں کو پریشان کر کے۔" حمیدہ بہت سکون اور اطمینان سے بیٹ پوجا اور باتیں دونوں کر رہی تھی۔
"دوسروں کو پریشان کرنے والے خود بھی کبھی خوش نہیں رہتے۔" ماہم اسے جتاتے ہوئے چائے نکالنے

گئی۔

"میں نے کب کہا' میں خوش رہنا چاہتی ہوں۔" حمیدہ نے کندھے اچکائے۔

"بہت عجیب و غریب شے ہو تم' ایک منٹ! میں چائے دے کر آئی۔" ماہم تبصرہ کرتے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی۔

"بن ماں باپ کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں شاید' عجیب و غریب۔" ایک طنزیہ مسکراہٹ حمیدہ بانو کے لبوں پہ بکھر گئی۔



گھر میں ایک ہڑبونگ کا سماں تھا۔ بلقیس چچی اور تائی امی بوکھلائی بوکھلائی بار بار کچن کے چکر لگا رہی تھیں' ماہم انہیں کئی بار تسلیاں دے چکی تھی مگر ان کی فکر مندی کسی طرح دور ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"بچہ اتنی دور جا رہا ہے' جانے کتنے عرصے میں واپسی ہو' وہاں پردیس میں کون پکا کر کھلائے گا' آج گھر کا پکا کھائے گا پھر تو سال دو سال بعد یہ موقع ملے گا۔" تھوڑی تھوڑی دیر بعد کبھی تائی امی کبھی بلقیس چچی آہیں بھر رہی تھیں۔

ذیشان آج امریکہ جا رہا تھا۔ ڈاکٹر بن چکا تھا۔ اب مزید تعلیم کے لیے اس نے باہر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ذہین تھا' اکیڈمک ریکارڈ بہترین تھا اور باپ کے پاس ٹھیک ٹھاک پیسہ تھا جو وہ اپنی اکلوتی اولاد کے مستقبل پر انویسٹ کرنے کے لیے بخوشی آمادہ تھے۔

صبح پانچ بجے کی فلائٹ تھی ویسے تو جب سے اس کا جانا یقینی ہوا تھا' اسے روزانہ تینوں ٹائم اس کی پسندیدہ اور اچھی اچھی ڈشیں پکا کر کھلائی جا رہی تھیں اور آج رات کھانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا تھا' بلقیس چچی اور تائی امی کو یہ فکر تھی کہ کہیں کوئی کمی نہ کوئی کسر نہ رہ جائے' حالانکہ ماہم کے ہوتے ہوئے انہیں اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی' وہ بہت اچھی کک ہونے کے ساتھ بہت اچھی منتظم بھی تھی' کھانا محنت اور پھرتی سے پکاتی تھی' اس کی صلاحیتوں اور سلیقے کے سب ہی لوگ معترف تھے گھر میں لڑکیاں اور بھی تھیں۔

ماہم کی اپنی دو بہنیں اور تھیں اور تائی امی کی چار بیٹیاں' جن میں سے تین کی شادی ہو چکی تھی' بس ایک رہ گئی تھی اور اس ایک نے ہی تائی امی کو ناک چنے چبوا دیے تھے۔ کومل اسم بامسمی تھی۔ اس میں حسن بھی تھا' نزاکت بھی اور نخرا بھی کئی رشتے آچکے تھے مگر اس کے معیار پہ ابھی تک کوئی پورا نہ اترا تھا۔

ماہم اور اس کی دونوں بہنوں کا معاملہ جدا تھا۔ ماہم کو الگ سے دیکھا جاتا تو ٹھیک ٹھاک شکل و صورت تھی' رنگ' قد مناسب۔ اس کے سلیقے اور سگھڑاپے اخلاق اور عادات نے اسے اس گھر کی سب لڑکیوں میں ممتاز بنا دیا تھا مگر باہر والوں کو اس کی خوبیاں کا کیا پتا' وہ محض شکل و صورت دیکھتے تھے اور گھر میں؟ گھر میں اس کے جوڑ کے دو لڑکے تھے مگر گھر کی مرغی دال برابر والا حساب تھا۔ مگر خیر فی الحال تو وہ اپنے حال میں بہت مطمئن اور تابع تھی' مستقبل کے لیے اسے اللہ پر بھروسا تھا۔ اس سے چھوٹی عائشہ میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی سنیعہ سیکنڈ ایر میں۔

بلقیس چچی اور تائی امی کا ذیشان کے لیے خصوصی التفات کئی وجوہات کی بنا پر تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ بن ماں کا بچہ تھا' جسے شروع سے ہی سب کی خصوصی توجہ حاصل رہی' شروع سے ہی آثار اس کے بہترین مستقبل کی نشان دہی کر رہے تھے' پھر باپ کی دولت اور کاروبار کا اکلوتا وارث' ہینڈسم بھی تھا' اگر تائی امی اور بلقیس چچی اسے اپنے داماد کے روپ میں دیکھنے کی آرزو کرنے لگی تھیں تو کوئی عجب نہ تھا۔



ذیشان دادو کے کمرے میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔

"سب تیاری ہو گئی بیٹا!" صبح سے کئی بار دادو یہ سوال کر چکے تھے۔

"جی دادو!" کرسی پہ بیٹھا' آگے کی طرف پاؤں

پھیلائے، آنکھیں موندے وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"تھک گئے؟" دادو کچھ بے چین سے نظر آئے۔

"ہوں!" وہ اپنی پیشانی ہاتھ سے مسلنے لگا۔

"گولی کھالو، چائے پی لو، کچھ دیر آرام کرلو، کل سے بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہو۔ تھکن تو ہوگی۔" دادو ایک ساتھ کئی نسخے تجویز کرتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔

"ٹھیک ہوجائے گا دادو! آپ پریشان نہ ہوں۔" انہیں مطمئن کرنے کو ذیشان مسکرایا۔

"ایک منٹ ٹھہو، میں چائے بنواتا ہوں، ارے فواد! کوئی لڑکی ہے ادھر۔" کھلے دروازے سے فواد گزرتا نظر آیا انہیں۔

"حمیدہ بانو نام کی ایک شاہزادی ہیں یہاں، میرے عین سامنے سیڑھیوں پر بیٹھی ہیں۔" اس نے دروازے سے جھانکتے ہوئے دادو کو جواب دیا۔

"حمیدہ بانو سے کہو ایک کپ چائے بنالائے۔"

"کہہ دیتا ہوں۔ اب عمل در آمد کروانا آپ کا کام ہے۔" فواد کندھے اچکاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"مس حمیدہ بانو! دادو نے کہا ہے کہ ایک کپ چائے بنادیں۔" فواد اپنے مخصوص انداز میں سیڑھیوں پر بیٹھی حمیدہ بانو سے مخاطب ہوا۔

"ایک کپ چائے!" حمیدہ بانو نے غائب دماغی سے اس کے فقرے کو دہرایا اور "اچھا" کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہائیں!" فواد نے حیران ہو کر اسے دیکھا "آج سورج کہاں سے نکلا تھا؟" وہ سر کھجاتے ہوئے سوچ رہا تھا اور حمیدہ بانو کچن میں موجود بلقیس چچی کو حیران کررہی تھی۔

"کیا کررہی ہو؟" فریج سے دودھ نکالتے دیکھ کر وہ بے اختیار پوچھ بیٹھیں۔

"چائے بنارہی ہوں؟" خلاف توقع شرافت سے جواب دیا تھا۔

"کس کے لیے؟"

"دادو نے کہا ہے۔"

"وہ تو اس وقت چائے نہیں پیتے۔"

"پتا نہیں۔" حمیدہ بانو ان کی تفتیش سے بے زار ہورہی تھی۔ رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی۔ بلقیس چچی خاموشی سے میوہ کاٹنے لگیں۔

"چائے بن گئی تو دے دیں، ذیشان بھائی منگوا رہے ہیں۔" اسامہ نے اندر آکر کہا جہاں حمیدہ بانو چائے کپ میں نکال رہی تھی۔

"یہ لو!" اس نے فوراً ہی کپ اسامہ کے ہاتھ میں تھمادیا اور خود کچن سے باہر نکل گئی۔

"اوہو! ذیشان کے لیے بن رہی تھی چائے، جب ہی میں کہوں مہارانی آج کیسے کوئی کام کرنے کھڑی ہوگئیں۔" بلقیس چچی کے کان کھڑے ہوئے۔

"گنوں کی پوری ہے، فتنی، چھپی رستم، بڑی آئی جھونپڑی کی رہنے والی، محلوں کے خواب دیکھنے کا شوق ہے۔" وہ کلس کر سوچ رہی تھیں۔ انہیں دادو کی خواہش کے بارے میں بھنک بھی نہیں پڑی تھی ورنہ وہ وہیں گر کر بے ہوش ہوجاتیں۔

☼ ☼ ☼

ذیشان چلا گیا تھا مگر جانے سے پہلے وہ اپنی زندگی کے سب سے اہم معاملے کو فواد سے ڈسکس کرنا نہیں بھولا تھا۔ دونوں کے درمیان کزن کے رشتے سے زیادہ دوستی کا مضبوط رشتہ تھا۔ اپنا ہر معاملہ دونوں ایک دوسرے سے بیان کرنے کے عادی تھے۔

"دادو کو کیا ہوگیا ہے؟" فواد کو اس کی بات سن کر اک دم جیسے شاک لگا تھا۔

"محبت... اپنی پوتی سے۔" ذیشان نے رک رک کر جواب دیا تھا۔

"محبت اپنی جگہ یار! مگر یہ تو کچھ عجیب و غریب جوڑ ہے۔" فواد نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں شہزادے! حمیدہ بانو تیرے جیسے لڑکے کے ساتھ بالکل سوٹ نہیں کرتی، کسی لحاظ سے بھی نہیں۔" فواد نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"یہی بات تو کسی طرح دادو کو سمجھادے۔" ذیشان نے اس سے التجا کی۔

"ٹھیک ہے برادر! دوستی اور دوست کی خاطر اب وکیل بھی بنیں گے، کریں گے تمہاری وکالت، تم عیش کرو باہر جاکر۔" فواد نے اپنے مخصوص انداز میں بولتے ہوئے اسے اطمینان دلایا۔

"میں باہر اسٹڈیز کے لیے جارہا ہوں، عیش کرنے نہیں۔" ذیشان نے اسے جتلاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"اچھا تو وہاں سے آکر کرلینا عیش۔" فواد نے لوفرانہ انداز میں آنکھ دبائی ذیشان بے اختیار ہنس پڑا۔

☼ ☼ ☼

ذیشان کے جانے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد فواد نے دادو سے بات کی تھی، آخر ذیشان کی طرح چہیتا نہ سہی مگر پھر بھی ان کا تھوڑا بہت لاڈلا پوتا تو وہ بھی تھا۔

"بیٹے! میں نے اسے مجبور نہیں کیا، اختیار اسی کے پاس ہے، انکار کا بھی اور اقرار کا بھی۔" دادو اس کی بات سن کر ادا سی سے مسکرائے تھے۔

"یہی تو بات ہے دادو! آپ نے اپنی خواہش یا اپنی مرضی بتا کر گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔ اب وہ تو گلٹی فیل کرے گا نا، آپ کو انکار کرتے ہوئے اور اقرر کرے تو..." فواد نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بیٹے! وہ بچی کئی سال ہم سے دور رہی، کیسے رہی، کس حال میں رہی، اب اندازہ ہورہا ہے۔ اس کی ماں اللہ بخشے اس دنیا سے چلی گئی، وہ ہم سے تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی مگر ہم تو اس سے رابطہ کرسکتے تھے، اس کی وجہ سے نہ سہی، اپنی پوتی کی وجہ سے، مگر میں نے بھی انہیں، ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب اگر وہ بچی مجھ سے یا اس گھر والوں سے ناراض ہے، بدگمان ہے تو شاید ٹھیک ہی ہے، مجھے اپنی کوتاہی پر ندامت ہے، میں اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی آئندہ زندگی کے لیے خوشیوں کا سامان کروں، بس اسی لیے۔" وہ ایک لمحے کو رکے۔

"بس اسی لیے میں ذیشان سے کہہ بیٹھا، مگر وہ..." آگے بات کرنے کے لیے جیسے لفظوں کا انتخاب کرنے لگے۔

"مگر، وہ جو بھی فیصلہ کرے، میں اس سے کبھی بھی نہ تو ناراض ہوسکتا ہوں نہ ہی ناخوش، میں نے تو بس یہ کہا ہے کہ اتنی جلدی ہاں، نہ کا فیصلہ نہ کرے، کچھ وقت لے لے اچھی طرح سوچ بچار کرکے، پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کردے، وہ جو بھی کہے گا بسرو چشم، مجھے قبول ہوگا۔" دادا نے تفصیل سے اسے اپنا موقف سمجھایا۔

"ٹھیک ہے دادو! میں سمجھ گیا اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔" فواد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"آمین...!"

☼ ☼ ☼

ذیشان کو گئے تقریباً دو ماہ ہونے کو تھے، گھر والوں کے روز و شب وہی یکسانیت لیے ہوئے تھے، کالج اور یونیورسٹی جانے والے اپنی پڑھائیوں میں مگن تھے، مرد حضرات اپنے کاروبار میں اور خواتین گھرداری میں، سب کچھ ایک معمول کے تحت چل رہا تھا، بس حمیدہ بانو اور دادو دو ایسے افراد تھے جن کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ تھا، نہ کوئی کام، نہ مشغلہ، نہ مصروفیت، دونوں الگ الگ اپنی دنیاؤں میں مگن تھے، کبھی ایک دوسرے سے بحث ہوجاتی اور پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ حمیدہ بانو کی الزام تراشیاں، شکوے شکایات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور دادو کی وضاحتیں اور اپنی صفائی پیش کرنے کی ان تھک کوشش۔

ماہم بے چاری نیک طبیعت لڑکی تھی، اچھی عادات اطوار بہترین اخلاق کی مالک، اپنے تئیں حمیدہ بانو کو سمجھانے کی بلکہ سدھارنے کی کوشش کرتی اور تھک ہار کر یا مایوس ہو کر چپ سادھ لیتی پھر ایک آدھ دن بعد دوبارہ اپنے مشن میں جت جاتی، ایک روز اچانک اس پرسکون جھیل میں انہونی کا ایک ایسا پتھر

آن کر گرا، جس کا ارتعاش جمیل کے ہر حصے میں پہنچ گیا۔

رات سوتے میں دادو کی حرکت قلب بند ہوگئی، کسی سے کچھ کہے، کچھ سنے بغیر وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ اولاد کو جو صدمہ ہوا وہ ہوا، آخر کو باپ تھے، حمیدہ بانو گم صم ہوگئی تھی۔ کئی دنوں تک نہ اس کو یقین آیا نہ سمجھ کہ آخر یہ یکایک ہوا کیا ہے، گھر میں کون آرہا تھا، جارہا تھا اسے کچھ خبر نہ تھی، دادو کے کمرے میں بیٹھی ان کی ایک ایک شے کو دیکھتی رہتی، پھر جانے کیا سوچ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔

ذیشان اس اچانک پہنچنے والے صدمے کی کیفیت سے باہر نکلا تو اس نے فواد سے رابطہ کیا۔

"فواد یار! میں دادو کی آخری خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ چاہتے تھے کہ میں حمیدہ بانو کو اپنی زندگی میں شامل کرلوں، میں کچھ عرصے بعد پاپا سے بات کرتا ہوں۔" ذیشان کے انداز میں نامعلوم سی یاسیت تھی۔

"ایک بات کہوں؟ مانے گا!" فواد نے کچھ سوچ کر کہا۔

"بول!"

"ابھی بڑے پاپا سے بات مت کر، جب تو آئے گا تب اس معاملے کو چھیڑنا، ابھی کوئی ذکر، تذکرہ کچھ نہیں، چپ لگا جا۔"

"کیوں؟" ذیشان حیران ہوا۔

"دو وجوہات ہیں، ایک تو یہ کہ میری امی اور تائی امی دونوں ہی تجھے اپنا مستقبل کا داماد سوچ کر بیٹھی ہیں اور ہاں عافیہ پھپھو بھی نمرہ کے لیے تیرا انتخاب کیے بیٹھی ہیں، انہوں نے دادو سے کہا بھی تھا کہ وہ بڑے پاپا سے بات کریں مگر دادو نے تیری اسٹڈیز کا بہانہ کر کے ٹال دیا اب اگر اس قطار میں حمیدہ بانو کھڑی ہوئی تو ساری خواتین مل کر اس کے خلاف محاذ بنالیں گی۔ وہ پہلے ہی سب کی نگاہوں میں بہت معتوب ہے۔" فواد نے صاف گوئی سے گھریلو سیاست کا ایک رف سا نقشہ کھینچا۔

"ہوں اور دوسری وجہ؟" ذیشان نے ایک گہری سانس لی۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ میں پرنسز حمیدہ بانو کی تھوڑی جھاڑ پونچھ کر کے پالش کردوں تاکہ وہ کچھ سدھر جائے، نکھر جائے، بڑے پاپا کو یا کسی کو یہ اعتراض نہ ہو کہ یہ لڑکی تیرے قابل نہیں ہے۔" فواد نے دوسری وجہ بھی بتادی۔

"تو اس یار، آپ اس پروجیکٹ پر کام کریں گے۔"

"بالکل، تجھے معلوم ہے ناکہ مجھے مشکل پروجیکٹ پر کام کرنے میں کتنا مزا آتا ہے۔"

"ایک جیتے جاگتے انسان میں اور کسی پروجیکٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔" ذیشان نے اسے جتایا۔

"دونوں ہی چیلنجنگ ہوتے ہیں، بائی داوے اور کچھ؟"

"اور کچھ کیا؟"

"کوئی نصیحت، کوئی مشورہ، کوئی بات؟"

"کچھ نہیں یار! بس خیال رکھنا۔" ذیشان مدھم آواز میں بولا۔

"کس کا؟"

"ہر ایک کا اور ہر بات کا۔"

"جو حکم سرکار کا، ہم تو غلام ہیں آپ کے۔" فواد بڑی دیر بعد اپنے مخصوص رنگ میں آیا تھا۔

"اس عزت افزائی کا شکریہ۔" ذیشان مسکرا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے یار، پھر میں گاہے گاہے تجھے اپنے مشن کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔"

"نہیں، مجھے کچھ نہیں بتانا، میں جب آؤں گا تو خود دیکھوں گا کہ تو نے کیسے زمین کو آسمان اور صحرا کو نخلستان کیا ہے۔" ذیشان بے ساختہ ہی بولا تھا۔

"ہمارے صاحب شاعری بھی فرمانے لگے ہیں؟" فواد نے اسے چھیڑا۔

"آداب عرض ہے۔" ذیشان نے بھی شرارتی انداز اختیار کیا تو فواد ہنس پڑا۔



"تھوڑے عرصے میں وہ حمیدہ بانو کو جتنا جان پایا تھا اس کا لب لباب یہی تھا کہ اس بھاری پتھر کو اس جگہ سے سرکانا یا اس میں جونک لگانا جان جوکھوں کا کام تھا مگر خیر جب عزم کر ہی لیا تو اب گھبرانا کیا! ڈرائی فروٹ منہ میں اچھال اچھال کر کھاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

ایم ایس سی کر کے اس نے کالج میں پڑھانا شروع کر دیا تھا، چار بجے تک وہ گھر آجاتا تھا، آج وہ معمول کے مطابق گھر آیا۔ غسل کے لیے جانے سے پہلے اس نے حمیدہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اس کی توقع کے عین مطابق وہ دادو کے کمرے میں ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی۔

"ہیلو مس حمیدہ بانو!" فواد اکثر اسے اس کے پورے نام سے مخاطب کرتا تھا۔ یا پھر صرف بانو، حمیدہ بانو نے اس کے دوستانہ ہیلو کا کوئی جواب دیے بغیر سوالیہ نظریں اس پر مرکوز کیں۔

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو دو کپ چائے بنا دیں گی؟"

"اچھا!" وہ اٹھ کھڑی ہوئی جب سے دادو کا انتقال ہوا تھا، وہ بہت گم صم سی ہوگئی تھی کوئی مخاطب کرتا تو مختصر سا جواب دے دیتی ورنہ خاموش اس کمرے میں پڑی رہتی، ماہم جانے کیا کیا سمجھاتی، بس ہوں، ہاں کر دیتی نہ اختلاف نہ اتفاق، اس وقت بھی فواد کی درخواست پر وہ اچھا کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوپر لے آؤ گی میرے روم میں....؟"

"ہاں۔" حمیدہ بانو نے اپنے لفظوں کا استعمال بہت محدود کرلیا تھا۔ چند الفاظ تھے ان ہی سے ہی کام چلا لیتی۔

فواد نہا کر نکلا تو تولیے سے بال خشک کر رہا تھا جب حمیدہ بانو ٹرے میں دو کپ چائے رکھے اندر داخل ہوئی۔

چائے اس نے رائٹنگ ٹیبل پر رکھی اور جانے کے لیے مڑی۔

"بات سنو۔" فواد نے جلدی سے اسے پکارا۔

"بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"جی!" وہ کرسی پر ٹک گئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ یہ دوسرا کپ کس کا ہے؟" فواد نے چائے کی طرف اشارہ کیا۔ حمیدہ بانو نے کچھ کہے بغیر یوں شانے اچکائے جیسے کہہ رہی ہو کہ مجھے کیا۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔" فواد نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔

"کیوں؟" اس کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

"یونہی میرا دل چاہا کہ ہم دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پئیں اور کچھ گپ شپ کریں۔" فواد اطمینان سے بولا۔

"ایک ساتھ چائے اور گپ شپ؟" حمیدہ بانو نے اس کی بات دہرائی۔

"اس مہربانی کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" وہ اپنے مخصوص کھلے انداز میں گویا ہوئی۔

"جو مہربانی کسی وجہ سے کی جائے، وہ مہربانی نہیں خود غرضی ہوتی ہے۔" فواد نے ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

"چلیے اس خود غرضی کی وجہ بتا دیجیے۔" حمیدہ بانو نے اپنی جانب بڑھائے گئے کپ اور فواد دونوں کو نظر انداز کیا۔

"ہاہاہا!" فواد کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

"دل میں آئی بات زبان پر لانے میں دیر نہیں لگاتی ہو تم، چاہے کسی کو برا لگے یا بھلا۔" فواد جانے تعریف کر رہا تھا یا تنقید، حمیدہ بانو سمجھ نہ سکی، صرف یہی نہیں اور بھی بہت ساری باتیں اور رویے ایسے تھے جو وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

"اچھا تو تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس خود غرضی کی ایک وجہ ہے ..... حمیدہ بانو۔" فواد ڈرامائی انداز میں رک رک کر بول رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" حمیدہ بانو کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"بی بی! تم میرے چچا کی بیٹی ہو، کزن ہو، میرے دادو کی لاڈلی پوتی ہو، ان سب حوالوں سے تم ہم سب کو

بہت عزیز ہو۔"

"خیر سب کو تو عزیز نہیں ہوں۔" حمیدہ بانو نے منہ بنایا۔

"مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے یہ سن کر ورنہ مجھے تو امید تھی کہ تم کہو گی کہ میں کسی کو بھی عزیز نہیں ہوں۔" فواد مسکرا دیا۔

"احسان فراموش نہیں ہوں' جو میرے ساتھ اچھا ہے' اسے برا نہیں کہہ سکتی۔"

"اور جو برا ہے؟"

"اسے برا کہے بغیر نہیں رہ سکتی' اسی لیے تو میں بری ہوں۔" اس کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا۔

"تم بات بات پہ اتنی تلخ کیوں ہو جاتی ہو؟" فواد نے جان بوجھ کے اسے چھیڑا۔

"انسان کو جو کچھ دوسروں سے ملا ہوتا ہے وہ وہی بانٹتا ہے۔"

"یہ تو خود غرضی ہے۔"

"تو میں نے کب دعوا کیا ہے بے غرضی کا۔" حمیدہ بانو نے کندھے اچکائے۔

"سوری' میں نے خود ہی سمجھ لیا کہ آپ میں یہ خوبی ہو گی۔" فواد نے خندہ پیشانی سے اپنی غلطی تسلیم کی۔

"میں اب جاؤں؟" حمیدہ بانو اپنی چائے پی چکی تھی' کھڑی ہو گئی اور ٹرے میں دونوں خالی کپ رکھے۔

"بات سنو لڑکی! کیا ہمارے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی؟" فواد نے بے ساختہ سوال کیا تھا۔

"تو ہمارے درمیان دشمنی کب ہے؟" اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جواب دیا تھا۔

"ویری ویل!" فواد لاجواب ہو گیا۔

"تم ظاہر نہیں کرتی ہو مگر ٹھیک ٹھاک ذہین لڑکی ہو۔" فواد نے اس کی برجستگی پہ اسے خراج تحسین پیش کیا۔

"زیادہ ذہین لوگوں کو یہ دنیا نہ برداشت کرتی ہے نہ قبول۔" وہ اداسی سے مسکرائی "اور ویسے۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔

"میں اتنی ذہین نہیں ہوں' جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔ بائی دا وے تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" فواد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی بات دوبارہ کہی۔

"کون سی بات؟"

"کیا ہم اچھے دوست نہیں بن سکتے؟"

"کس قسم کے دوست؟" حمیدہ بانو نے الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایسے دوست جو اپنی ہر بات' ہر دکھ سکھ' ہر خوشی غم ایک دوسرے سے شیئر کریں۔" فواد نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"مجھے عادت نہیں ہے کسی سے کچھ بھی شیئر کرنے کی۔" اس کا لہجہ سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔

"ایک تو تمہاری عادتیں بھی تمہاری طرح نرالی ہیں' خیر۔" فواد نے ایک گہری سانس لی۔

"اب میں سیدھی طرح سچ سچ ایک بات بتاؤں!"

"کہیے۔" حمیدہ بانو کی آنکھوں میں الجھن کی جگہ اب بے زاری آئی تھی۔

"بات یہ ہے کہ۔" فواد نے آگے کہنے سے پہلے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دادو کی خواہش تھی کہ تم اور ذیشان ایک دوسرے سے منسوب ہو جاؤ' یہ معاملہ ابھی زیر غور تھا کہ دادو کا انتقال ہو گیا' اب ذیشان ان کی اس خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے' کیونکہ وہ دادو کے بہت قریب تھا اور ان سے بہت محبت کرتا تھا' تو۔۔۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔

"تم جانتی ہو کہ وہ ایک ویل سیٹلڈ اور ویل ایجوکیٹڈ پرسن ہے۔ اسے ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی ہے' مگر وہ محض دادو کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تمہارے حوالے سے کر رہا ہے' تم اندازہ کر سکتی ہو کہ وہ کتنے اچھے دل کا مالک ہے' بہت ہی نرم اور محبت کرنے والا دل۔" فواد مسکرایا۔

"تو اچھی لڑکی! میں چاہتا ہوں کہ حمیدہ بانو جب

میرے پیارے دوست کی زندگی میں شامل ہو تو وہ ایک بالکل بدلی ہوئی لڑکی ہو' بہت اچھے دل اور میٹھی زبان کی مالک' اعلا تعلیم یافتہ اور بہت ساری خوبیوں کی مالک' تاکہ میرا پیارا دوست اپنی لائف میں بہت خوش رہے اور وہ جب بھی دادو کو یاد کرے تو دل ہی دل میں انہیں مخاطب کر کے کہے' دادو آپ کا فیصلہ بہت اچھا تھا۔" فواد نے بہت تفصیل سے اسے سمجھایا۔

فواد کی باتیں حمیدہ بانو کے لیے جہان حیرت کے نئے باب کھول رہی تھیں' وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی اسے سن اور دیکھ رہی تھی۔

"دادو مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے؟" وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور کرسی کی پشت پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے۔ اس کی دھڑکن اتنی تیز ہو چلی تھی جیسے' میلوں کا سفر کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔

"ذیشان کیوں مان گیا؟" اس نے بمشکل سوال کیا۔

"بتایا تو ہے' وہ دادو سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اگر وہ کسی درخت سے بھی اس کی شادی کرنے کو کہتے تو وہ راضی ہو جاتا۔"

"آپ میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے؟" حمیدہ بانو نے یکایک بے اعتبار نظروں سے اسے دیکھا۔

"اف!" فواد کراہا اور ملامتی نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

"اگر مجھے مذاق ہی کرنا ہوتا تو ذیشان کی جگہ اپنا نام لیتا۔" فواد کے لہجے میں شرارت تھی اور وہ اب مسکرا رہا تھا۔

"میں نے اپنے اردگرد خود غرضی ہی دیکھی ہے مجھے اب کسی پہ اعتبار نہیں آتا۔ مگر میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں آپ پہ اعتبار کر سکتی ہوں۔" وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی تھی اس کی شفاف نگاہیں فواد پہ جمی تھیں۔

"بانو! تم بالکل مجھ پہ بھروسہ کر سکتی ہو' میں تمہارے اعتبار کو اور تمہارے پندار کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔" فواد کے لہجے میں سچائی اور چہرے پہ خلوص کے تاثرات رقم تھے۔

"تو پھر آج' اب سے ایک منٹ پہلے ہماری دوستی شروع ہو گئی ہے' ٹھیک؟"

"ایک منٹ پہلے کیسے؟" وہ پھر حیران ہوئی۔

"تم نے اپنی ایک بات مجھ سے شیئر کی ہے نا' اعتبار والی' بس یہی تو دوستی کی ابتدا ہے۔"

"اچھا!" حمیدہ بانو مسکرا دی۔

"اچھا دوست! پھر ملیں گے" وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے دونوں ایک گھر میں رہنے کے بجائے الگ الگ شہروں میں رہتے ہوں۔

حمیدہ بانو مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن تھا' حمیدہ بانو اپنے معمول سے بھی تھوڑی دیر سے اٹھی' نرم نرم کمبل سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا' ہاتھ منہ دھو کر وہ کچن میں داخل ہوئی تو گھڑی کی سوئیاں گیارہ بجانے ہی والی تھیں' اس گھر کے تقریباً" سب ہی افراد سحر خیز تھے کہ علم اور روزی کے حصول کے لیے علی الصبح ہی سب کو نکلنا پڑتا تھا' رہ گئیں خواتین تو صبح نکلنے والوں کے ناشتے کی ذمہ داری ان پر تھی۔ انہیں تو پہلے اٹھنا پڑتا تھا۔ یہ عادت ایسی پختہ ہو چلی تھی کہ چھٹی کے دن بھی بستر پر لیٹے لیٹے کروٹیں بدلنے کے بجائے سب بیدار ہو ہی جاتے تھے۔ حمیدہ بانو کچن میں داخل ہوئی تو ماہم اپنی امی بلقیس چچی کے ساتھ کھانا پکانے کی تیاریاں شروع کرنے والی تھی' ناشتے کے سب برتن دھل دھلا کر صاف ستھرا کچن ان کا منتظر تھا۔

"او حمیدہ! ناشتہ لے لو' کیا کھاؤ گی؟" ماہم اسے دیکھ کر بشاشت سے مخاطب ہوئی۔

"یہ کوئی ناشتے کا ٹائم ہے' دوپہر ہونے کو ہے' اب تو دوپہر کا کھانا ہی کھالینا؟"

بلقیس چچی نے ناگواری سے اسے گھورا' گھر کا ڈسپلن خراب کرنا انہیں سخت ناگوار گزرتا تھا اور خاص طور پہ حمیدہ بانو سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا' اس کی عادتیں' حرکتیں اور سب سے بڑھ کر زبان ہی

ایسی تھی جو انہیں بالکل بھی برداشت نہیں تھیں۔

"دوپہر کے کھانے میں تو ابھی دو' ڈھائی گھنٹے ہیں امی! جب تک تو حمیدہ کا ناشتہ ہضم بھی ہوجائے گا۔" ماہم نے مسکرا کر حمیدہ کو دیکھا۔ وہ امی کی ناگواری پر اپنی خوش اخلاقی کا پردہ ڈال کر اسے چھپانے کی کوشش کررہی تھی' وہ دل کی بہت اچھی تھی اس کی کوشش رہتی تھی کہ نہ صرف اس سے بلکہ اس کے کسی پیارے سے بھی کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

"تو پھر دے دو نواب زادی کی چونچ میں چوگا۔" بلقیس چچی جل کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "ہمیں نہیں پسند ایسے طور طریقے۔" وہ بولتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

"امی کی باتوں کا برا مت ماننا پلیز' وہ دل کی بری نہیں ہیں' دیر سے اٹھنے پر مجھے بھی زبردست ڈانٹ پڑتی ہے۔" ماہم شرمندگی سے بولتے ہوئے صفائی پیش کرنے لگی۔

حمیدہ بانو خلاف توقع خاموش رہی مگر اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضح تھے' اسے اپنے بارے میں کسی کی کوئی بات برداشت نہیں تھی چاہے صحیح ہو یا غلط' دوبدو جواب دے کر وہ حساب چکتا کردیتی' اس وقت اس کی خاموشی کا سبب کچھ تو ماہم تھی' اس کا لحاظ کرکے وہ چپ رہی اور کچھ فواد کا پڑھایا ہوا سبق۔

"دیکھو' میٹھی زبان سے جادو اثر اور کوئی چیز نہیں' دلوں میں جگہ بنانی ہے تو یا تو اچھی بات کرو ورنہ چپ رہو' کسی کو جواب مت دو' خاص طور پر بڑوں کو۔" اس نے پہلا سبق ذہن نشین کرایا تھا۔

"کوشش کروں گی' ویسے مجھے اپنے بارے میں کوئی بھی الٹی سیدھی بات سن کر فوراً" غصہ آجاتا ہے۔" حمیدہ بانو کو پہلا سبق ہی بڑا مشکل لگا۔

"یہ تو انسان کی فطرت ہے' اپنی تعریف تو سب کو اچھی لگتی ہے' تنقید سن کر صبر اور ضبط سے کام لو' دیکھنا زندگی سہل ہوتی چلی جائے گی۔" وہ فواد کے الفاظ یاد کرنے لگی۔

"پراٹھا کھاؤ گی؟" ماہم اس سے کسی چھوٹی بچی کی طرح پیش آتی تھی۔

"سلائس لے لوں گی۔" وہ بے دلی سے فریج کی جانب بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

جب سے ذیشان باہر گیا تھا' فواد کی مصروفیات میں ایک اور مصروفیت کا اضافہ ہوگیا تھا اب وہ دونوں فیس بک اور ٹوئٹر پر ایک دوسرے کے رابطے میں رہتے تھے۔

"ہاں تو تمہارے نئے پروجیکٹ کی کیا خیر خبر ہے؟" ذیشان نے اسے چھیڑا۔

"نیا پروجیکٹ بہت مشکل راستوں اور کٹھنائیوں سے گزر رہا ہے پروجیکٹ مشکل ہی نہیں بہت الجھا ہوا بھی ہے' پر اس نازک بہت الجھے ہوئے ریشم کو بہت آہستگی اور نرمی کے ساتھ سلجھا رہا ہوں۔" فواد نے جواب دیا۔

"پھر.... کامیابی کی کتنی امید ہے؟"

"سو فیصد' آخر میری صلاحیتوں کا اتنا بڑا خزانہ کس دن کام آئے گا۔" فواد اپنے تمام معاملات میں بے حد خود اعتماد تھا' کبھی کبھار یہ خود اعتمادی' خود نمائی میں بدل جاتی مگر بہرحال وہ ایسا ہی تھا۔

"تیری اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں؟"

"فرسٹ کلاس' وہاں جو پڑھائی کی' وہ کی مگر اب یہاں آکر احساس ہوا کہ محنت سے پڑھنا کسے کہتے ہیں اور محنت ضرور رنگ لاتی ہے تو میں بھی اپنی محنت کنٹی نیو رکھتا ہوں اور تم بھی رکھو' ان شاء اللہ صلہ ضرور ملے گا۔"

"میری اور تیری دونوں محنتوں کا صلہ تجھے ہی ملے گا' مجھے کیا ملے گا؟"

"ویری گڈ کونسچن!" ذیشان ہنس پڑا" اس اہم مسئلے کو ہم بعد میں ڈسکس کریں گے اچھی طرح غور و فکر کرکے' فی الحال مجھے اجازت خدا حافظ۔"

"خدا حافظ"

☼ ☼ ☼



گرم بستر شنیل کا نرم لحاف' مونگ پھلی کھاتے ہوئے وہ ٹی وی سے لطف اندوز ہورہی تھی' جب فواد کا بلاوا آیا۔

"کیا مصیبت ہے؟" وہ کلستے ہوئے استاد محترم کی خدمت میں پہنچی۔

"تم نے اپنے ڈاکومنٹس نکالے؟" فواد نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"کل نکال دوں گی۔" حمیدہ بانو نے آج دوسرے دن بھی ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی۔

"کل کبھی نہیں آتی' جو کام کل کرنا ہے' وہ آج کرو جو آج کرنا ہے وہ ابھی' لہٰذا ابھی اسٹور میں جاؤ اور اپنا سامان کھنگالو۔" فواد نے سنجیدہ انداز اپنا کر حکم نامہ جاری کیا۔

"میں اسٹور میں اکیلی کیسے جاؤں وہ بھی اس وقت۔" حمیدہ بانو نے جمائی روکی۔

"ہمارے گھر کے جن بھوت اسٹور میں نہیں کمروں میں بستے ہیں' پھر بھی تمہیں ڈر لگتا ہے تو ماہم کو لے جاؤ۔"

فواد اسے کالج میں ایڈمیشن دلوا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں حمیدہ بانو کے ضروری ڈاکومنٹس اسے درکار تھے۔

"آدھ گھنٹے کے اندر اندر تمام چیزیں اس میز پر ہونی چاہئیں" فواد نے مزید رعب جمایا۔

"ویسے آپ نے صحیح کہا تھا کہ اس گھر کے جن بھوت اسٹور میں نہیں بلکہ کمروں میں بستے ہیں' ایک مثال تو میرے سامنے ہے۔" حمیدہ بانو انتہائی جل کر گویا ہوئی۔

"آنکھیں' کان کھلے اور دماغ چوکنا رکھو' ایسی اور مثالیں آس پاس نظر آئیں گی۔" فواد اس کے تبصرے سے محظوظ ہوا تھا۔

کالج میں ایڈمیشن ہوگیا' کلاس بھی شروع ہوگئیں' حیدر آباد سے وہ آئی تھی تو اس کا انٹر کلیئر تھا۔ فواد نے تھوڑی سی بھاگ دوڑ کرکے بی اے سال اول میں اس کا داخلہ کروایا تھا۔ حمیدہ بانو سمیت گھر کی اور لڑکیوں کو کالج یونیورسٹی پہنچانا فواد کی ذمہ داری تھی' پھر وہ اپنے کالج چلا جاتا' واپسی پر کوئی پوائنٹ کا سہارا لیتا کوئی پبلک ٹرانسپورٹ کا۔

حمیدہ بانو کو وہ سراسر اپنی خصوصی ذمہ داری سمجھ کر پڑھا رہا تھا۔

"سب سے شاندار رزلٹ لانا ہے تمہیں۔" یہ نصیحت یا یاددہانی اسے تقریباً" روز ہی کروائی جاتی۔

کئی کئی گھنٹے نوٹس بنا بنا کر جب اس کا دماغ پلپلا اور ہاتھ اور انگلیاں بری طرح دکھنے لگتے تو وہ بے زار ہوکر قلم کاغذ ایک طرف ڈال دیتی۔

"اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی آرام سے' سکون سے۔ سب کچھ غارت کرکے رکھ دیا۔" وہ بڑبڑانے لگتی۔

ماہم کے روز و شب ہمیشہ کی طرح مصروف تھے' گھر میں ملازمہ بھی لگی ہوئی تھی' صفائی ستھرائی جھاڑو پوچا کرنے کی اور کپڑے دھونے کی۔ مگر وہ سارا کام ان کے سر پر کھڑے ہو کر کرواتی پھر کچن' جو قریب قریب پورا ہی اس کی ذمہ داری تھا' بڑی امی اور اس کی امی' کچن کے کاموں میں کافی مدد کروادیتیں' سبزی بنادی' گوشت قیمہ اکٹھا آتا۔ ان کے پیکٹس بنا کر فریز کردیے' لہسن ادرک چھیل کردے دیا' دو چار برتن سنک میں پڑے نظر آئے' کھڑے کھڑے دھو دیے' اور جانے کتنے چھوٹے موٹے کام دونوں دیورانی جٹھانی مل جل کر کرہی لیتی تھیں۔

"آپی! ایک کپ کافی مل جائے گی پلیز لیکن ذرا جلدی۔" عائشہ تو ہمہ وقت ہوا کے گھوڑے پہ ہی سوار رہتی تھی' کھانا بھی جلدی جلدی یوں کھاتی کہ کھاتی کم اور نگلتی زیادہ تھی۔ میڈیکل کا دوسرا سال تھا' سخت محنت کررہی تھی' خود سے لاپروا' اپنی صحت سے بے نیاز۔ ماہم اور امی ہی ڈانٹ ڈپٹ کرکے اس کا خیال رکھتی تھیں۔ اس وقت بھی ماہم نے کافی بنانے سے پہلے جھٹ پٹ اسے چکن سینڈوچ بنادیا۔

"جب تک میں کافی بنارہی ہوں' یہ کھالو۔" ماہم نے پلیٹ اس کے آگے رکھی۔

"تھینک یو' تھینک یو۔" عائشہ نے بڑا زوردار

شکریہ ادا کیا۔

"کتنے روکھے بال ہو رہے ہیں' روزانہ الٹا سیدھا برش مارا اور چل دیے' اتنے اچھے بال ہیں' سب خراب ہو جائیں گے۔" ماہم نے اس کے گال پر جھولتی لٹ اس کے کان کے پیچھے کی۔ اس کے لہجے میں بڑی بہن کا پیار بھی تھا اور فکر بھی۔

"ڈونٹ وری' امی تیل کی بوتل ہاتھ میں لیے میرا ویٹ کر رہی ہیں۔ پانچ منٹ کا بول کر اٹھی تھی۔" عائشہ مزے سے سینڈوچ کھاتے ہوئے بول رہی تھی۔

"ماہم!" اسی وقت حمیدہ بانو اندر آئی۔

"ارے' یہ لڑکی کون ہے؟" عائشہ نے مصنوعی حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

اندر آتی حمیدہ بانو جھینپ کر مسکرا دی' خوش رنگ چھوٹے چھوٹے پھولوں والے کاٹن کے جوڑے میں ملبوس وہ بہت صاف ستھری اور کھلی کھلی لگ رہی تھی' کمر تک آتے اس کے سیدھے سلکی بال کھلے ہوئے ہلکے گیلے تھے' کچھ دیر پہلے وہ نہائی تھی۔

"سردی لگ رہی ہے۔" وہ چولہے کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"کافی پی لو۔" ماہم کافی پھینٹ رہی تھی۔

"تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے حمیدہ؟" عائشہ نے پوچھا۔

"ٹھیک جا رہی ہے۔" حمیدہ بانو کرسی پر آن بیٹھی۔

"فواد بھائی بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔ سیکنڈ ایئر تک میں نے ان ہی سے پڑھا تھا۔" عائشہ نے اپنے بھائی کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں' یہ تو ہے۔" حمیدہ بانو نے مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔ "فواد سر کا پڑھایا ہوا ایک ایک لفظ جیسے دل میں اتر جاتا ہے۔" دوسرے اسٹوڈنٹس کی دیکھا دیکھی حمیدہ بانو نے بھی اسے فواد سر کہنا شروع کر دیا تھا۔

عین اسی وقت بلقیس کچن میں داخل ہوئیں۔ ماہم کافی کے مگ ٹیبل پر رکھ رہی تھی' انہوں نے کچھ ٹھٹک کر حمیدہ کو دیکھا بھی اور سنا بھی' وہ خود اور اس کا لب و لہجہ دونوں غیر معمولی لگ رہے تھے۔

"تمہاری چھوٹی خالہ آ رہی ہیں شام تک۔" انہوں نے ایک گہری نگاہ حمیدہ پر ڈالتے ہوئے اطلاع دی۔

"گڈ نیوز!" دونوں بہنوں کے چہروں پہ خوشی پھیل گئی۔

"رکیں گی؟" عائشہ نے ماں سے سوال کیا۔

"منع کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا تھا۔" امی فریج کھول کر کچھ نکالنے لگیں۔

"آ تو جائیں' انہیں روکنا ہمارا کام ہے۔" ماہم مسکراتے ہوئے بولی۔

"گوشت نکال لو' کباب بنا لینا' ختم ہو گئے ہیں' چکن بھی تھوڑا ہے۔ لسٹ بنا دو میں بازار جا رہی ہوں لے آؤں گی۔" وہ فریزر کھول کر جائزہ لے رہی تھیں۔

"فش لے آیئے گا' خالہ کو فرائی فش بہت پسند ہے۔" ماہم نے جیسے انہیں یاد دلایا۔

"ہاں۔ وہ تو ہے مگر تم اکیلے کیا کیا کرو گی' ایسا کرتے ہیں' بازار سے منگوا لیں گے' فواد لے آئے گا۔" ان کا موڈ خوشگوار ہو چلا تھا' بہن کی آمد کا سن کر۔

رات کے کھانے کے لیے ماہم نے خصوصی طور پر بہت محنت کی تھی' خالہ سرِ شام ہی آ گئی تھیں' ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی فروا بھی ان کے ہمراہ تھی' بہت پیاری اور خوش اخلاق سی فروا بہت جلد سب سے گھل مل جاتی تھی۔

عائشہ کی کسی بات پر مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں ڈمپل پڑ رہا تھا' بلقیس بے اختیار اسے دیکھے جا رہی تھیں' فواد کے لیے انہیں بارہا فروا کا خیال آتا تھا مگر ماہم کی وجہ سے چپ لگائے ہوئے تھیں۔ ماہم کا رشتہ کسی اچھی جگہ ہو جائے تو فواد کا رشتہ طے کرنے میں وہ ذرا دیر نہ لگائیں' مگر کیا کریں مجبوری تھی' ماہم کے لیے بارہا انہیں ذیشان کا دھیان آیا' ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جائے مگر خالی خولی چاہنے سے کیا ہوتا ہے ان کی جٹھانی بھی کومل کے لیے یہی

خواہش رکھتی تھیں۔

"اللہ جانے کس خوش بخت کا نصیب کھلے گا ذیشان کے ساتھ۔" ان کے خیالات کی رو بھٹکتے بھٹکتے کہاں سے کہاں آن پہنچی تھی۔

فواد بازار جا رہا تھا' فرائی فش لینے۔

"چلو بھئی لڑکیو! کون چل رہا ہے میرے ساتھ؟" اس نے باآواز بلند پیش کش کی۔

"کیوں' آپ کو اکیلے بازار جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔" فروا کھلکھلائی۔

"اللہ اللہ کیا وقت آگیا ہے' چھپکلی اور کاکروچ سے ڈرنے والے ہمارا مذاق بنا رہے ہیں' ہماری بلی' ہم ہی سے میاؤں۔" فواد نے اس کی پونی ٹیل کھینچی۔

"اللہ' فواد بھائی' ہیئر اسٹائل خراب مت کریں بھئی۔" فروا نے منہ بناتے ہوئے بالوں سے پونی نکال لی' خوبصورت تراشیدہ بال شانوں پر بکھر گئے۔

قریب ہی صوفے پہ بیٹھی حمیدہ بانو کو یہ سارا منظر نہ جانے کیوں ناگوار سا لگا۔ بظاہر وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی مگر اس کی ساری توجہ اس طرف تھی۔

"میں چلوں؟" وہ اک دم ہی بولی۔

"وائے ناٹ" فواد نے کندھے اچکائے۔

"ہاں بھئی بلی! چل رہی ہو؟" حمیدہ کو جواب دے کر وہ دوبارہ فروا کی طرف متوجہ ہوا۔

"نہیں بھئی' آپ پتا نہیں کتنی دیر لگائیں' ہم تو یہاں تھوڑی دیر ہیں۔ ڈنر کے بعد چلے جائیں گے' ابھی تو ٹھیک سے گپ شپ بھی نہیں ہوئی سب سے۔" فروا نے تیز تیز بولتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور بالوں کو سمیٹ کر ان پر ربر بینڈ چڑھانے لگی۔

"عائشہ' صفیہ' کومل۔ کہاں ہیں سب کی سب؟" فواد نے زور سے پکارا۔

"عائشہ اور صفیہ' ماہم آپی کے ساتھ کچن میں ہیں اور میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔" فروا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کومل کا تو ڈرامہ آنے والا ہے' وہ اسے کبھی مس نہیں کرتی۔" حمیدہ بانو نے فواد کو بتایا۔

"اگر آپ تیار ہیں تو چلیں۔" چابی ہاتھ میں گھماتا ہوا وہ کھڑا ہو گیا۔ سرمئی پینٹ اور چیک کی ہلکی نیلی شرٹ میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ سلیقے سے جمے ہوئے بال' اپنی طرف فوراً" ہی متوجہ کرنے والی روشن آنکھوں کے ساتھ وہ بہت ہینڈ سم لگ رہا تھا' حمیدہ بانو نے یک ٹک اسے دیکھا اور اس کے متوجہ ہونے پر بے ساختہ نظریں چرالیں۔

"میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔" حمیدہ بانو تیزی سے اندر چلی گئی۔

"امی جان! کچھ اور منگوانا ہے تو بتا دیں۔" بلقیس امی لاؤنج میں آئیں تو وہ ان سے مخاطب ہوا۔

"نہیں اور تو کچھ نہیں منگوانا بس مچھلی ہی لے آؤ۔" امی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی نکلتا ہوں' ذرا حمیدہ بانو آجائیں۔" وہ مطمئن سا صوفے پہ بیٹھا تھا۔

"یہ دم چھلا ساتھ لگانا ضروری ہے؟" انہوں نے جھنجلا کر بیٹے کو دیکھا۔

"اس کی بھی کچھ آؤٹنگ ہو جائے گی امی! سوائے کالج کے کہیں آتی جاتی نہیں ہے نہ کوئی سہیلی نہ اس گھر کے سوا کوئی رشتے دار' ایسے افراد تنہائی اور مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔" بیٹے نے ہمدردی سے بولتے ہوئے ماں کو سمجھایا۔

"اپنی ہمدردیاں فالتو لوگوں پہ ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے' مجھے اچھا نہیں لگتا' تم اور ماہم دونوں اس لڑکی کو غیر ضروری اہمیت دے رہے ہو' ہے تو خود غرض ماں کی اولاد' خود غرض ہی نکلے گی۔" وہ بڑبڑانے لگیں۔

"بھلائی کا صلہ بندوں کے نہیں اللہ کے ہاتھ میں ہے' بن ماں' باپ کی بچی ہے' تھوڑا بہت مارجن دینا چاہیے' آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں بلاوجہ۔" فواد نے نرمی سے بولتے ہوئے ماں کے کندھے دبائے۔

"ریلیکس رہیں' ہر فکر سے آزاد۔" وہ مسکرایا۔

"تم دونوں بہن بھائیوں کی منطق نرالی ہے۔" وہ

بے چارگی سے بول کر چپ ہو گئیں۔

"چلیں۔" حمیدہ بانو اپنی دھن میں تیزی سے آتے ہوئے چہک کر بولی' بلقیس چچی پہ نظر پڑی تو یکدم چپ ہو گئی۔

"چلو!" فواد اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا امی' خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" وہ اپنی سوچوں میں اتنی الجھی ہوئی تھیں کہ حمیدہ بانو کی فٹافٹ ہونے والی تیاری پر غور بھی نہ کر سکیں' جو دس منٹ کے اندر اندر ہاتھ منہ دھو' جوڑا بدل کر آگئی تھی' بالوں میں برش پھیر کر ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک' جو قدرتی تاثر دے رہی تھی۔

"چلو بانو' بیٹھو۔" فواد نے اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"ایک بات کہوں؟" گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے فواد کو اس نے مخاطب کیا۔

"بالکل کہو۔" فواد عموماً" اچھے ہی موڈ میں رہتا تھا۔

"آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔" حمیدہ بانو جھجکتے ہوئے سادگی سے بولی۔

"اچھا!" وہ زور سے ہنسا۔

"تھینکس فور کمپلیمنٹ ویسے یہ بات کہتے ہوئے تم بھی بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ حمیدہ بانو کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

وہ جھینپ گئی۔

"بس یہی بات کہنی تھی؟" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد فواد نے شریر لہجے میں پوچھا۔

"آپ مذاق اڑا رہے ہیں میرا؟" حمیدہ بانو نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"حمیدہ بانو! میں صرف مذاق کر رہا ہوں' تم کہو جو کہنا ہے۔" فواد ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس کے شک و شبہے کو رد کیا۔

"مجھے اپنا نام بالکل بھی اچھا نہیں لگتا' اولڈ فیشن سولہویں صدی کا نام۔" اس نے اپنی ننھی سی ناک سکوڑی۔

"تمہارا نام دادا جان نے رکھا تھا' اپنی پیاری بیگم یعنی ہماری دادی جان کے نام پر۔" فواد نے اسے بتایا۔

"اچھا' تب ہی اس نام کو سنتے ہی کسی دادی کا تصور ہی ذہن میں آتا ہے۔" حمیدہ بانو جیسے زبردستی مسکرائی۔

"دادو نے تمہارے لیے اپنی دو پیاری چیزیں منتخب کیں' ایک اپنی عزیز از جان بیگم کا نام اور دوسرا اپنا سب سے پیارا راج دلارا پوتا' تمہیں بھی یہ دونوں اتنے ہی پیارے ہونے چاہئیں۔" فواد مسکراتے ہوئے اسے نصیحت کر رہا تھا۔

"ہزاروں میل دور کسی شخص کے نہ دل کا کچھ پتا ہوتا ہے نہ لائف اسٹائل کا' اور نہ ہی پسند ناپسند کا' کون جانے کس کے دل میں کیا ہے۔" حمیدہ بانو نے کندھے اچکائے۔

"اپنا دل صاف رکھو' ذیشان بہت سوئٹ نیچر کا ہے وہ تمہیں کبھی لیٹ ڈاؤن نہیں کرے گا۔" فواد سنجیدہ ہو چلا تھا۔

"صرف اس لیے کہ میں اس کے مرحوم دادو کی خواہش یا وصیت ہوں۔" حمیدہ بانو نے ایک گہری نظر فواد پہ ڈالی۔

"تو کیا حرج ہے۔" فواد نے کندھے اچکائے۔ "کبھی انسان اپنے دل کے کہنے پر چلتا ہے اور زندگی کے اہم فیصلے کرتا ہے' کبھی وہ اپنے بڑوں کی مرضی اور خواہش کو مقدم رکھتا ہے' اور تمہیں تو پراؤڈ فیل ہونا چاہیے کہ ایک بہترین انسان تمہاری زندگی میں شامل ہوگا۔" فواد نے اس کی باتوں پر حیران ہو کر اسے سمجھایا۔

"میں نے ذیشان کے بارے میں بہت کچھ اچھا اور مثبت سوچنے کی کوشش کی مگر ہر بار میرے اندر سے جیسے کوئی انکار کرتا ہے کہ یہ سب ٹھیک نہیں' زمین آسمان کبھی ایک نہیں ہو سکتے' ان کے ملاپ کے خواب دیکھنا فقط حماقت ہے۔" حمیدہ بانو شاید سچ بول رہی تھی جو ہمیشہ سفاک ہوتا ہے' تلخ ہوتا ہے' فواد نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔

"کیا ہوا؟"

"ایک منٹ ٹھہرو' میں فش لے کر آتا ہوں۔" فواد گاڑی سے اترتا ہوا بولا' حمیدہ بانو کے خیالات ایک لمبی بحث اور بیٹھک کے متقاضی تھے' لہٰذا وہ اس وقت خاموش ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈرائنگ روم میں اپنی کتابوں کے ہمراہ تھی' مگر وہ کتابوں کے ورق کے بجائے کتاب زندگی کے اوراق فواد کے سامنے الٹ رہی تھی۔

"جب تک امی زندہ رہیں' تب بھی ممانی کا رویہ کوئی خاص اچھا نہیں تھا مگر ان کے انتقال کے بعد تو جیسے سارے ہی حجاب اٹھ گئے' ماموں' ممانی اور ان کے آٹھ انتہائی بدتمیز بچوں کے سارے کام میرے کندھوں پر ان پڑے' صبح سے لے کر رات گئے تک میں گدھوں کی طرح سارے گھر کا کام کرتی بدلے میں روکھی سوکھی' باسی' بچا کھچا' اتنا ملتا جو جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو کافی ہوتا' سب کی طنزیہ باتیں' طعنے اور الٹے سیدھے تبصرے سنتی اور سن کر خون کے گھونٹ پی جاتی' ماموں کمزور تھے' بیوی بچوں کے آگے دبنے والے مرد' ان سے کسی بھی طرح کی مدد کا کوئی آسرا نہ تھا' ننھیال میں اور کوئی تھا نہیں۔ اکثر راتوں کو روتے روتے میں سوچتی کہ میں کتنی بد قسمت ہوں' نہ ماں نہ باپ' نہ کوئی اور بہن بھائی' اور نہ ماں کے خاندان کا مہربان سایہ میرے اوپر نہ ہی باپ کے خاندان سے کوئی شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر۔ پہلے میں خود پر روتی' ترس کھاتی تھی' پھر آہستہ آہستہ مجھے سب سے بے زاری ہونے لگی اور یہ بے زاری نفرت میں بدل گئی' مجھے ہر ایک سے نفرت ہو چکی تھی' خود سے وابستہ ہر فرد اور ہر رشتے سے۔

میں نے گھر میں دب کر رہنے کے بجائے ڈٹ کر مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ کوئی ایک کہتا' میں آگے سے چار سناتی' جس کا ہاتھ مجھ پہ اٹھتا' میں بھی بدلہ لینے میں دریغ نہ کرتی' آہستہ آہستہ میں ڈھیٹ ہوتی چلی گئی بدتمیز اور بد اخلاق بن گئی۔ مجھے کوئی بھی' کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا' سب سے نفرت ہو چکی تھی' ان لوگوں سے بھی جن کے ساتھ میں رہتی تھی اور ان سے بھی' جنہوں نے کبھی پلٹ کر خبر تک نہ لی کہ ان کے بیٹے' بھائی کی اولاد کس حال میں ہے' یہاں آکر بھی اس احساس سے پیچھا نہیں چھوٹا' میں یہ سوچ سوچ کر اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہتی کہ میں بھی اس گھر کی بیٹی اور پوتی تھی مگر پھر یہاں کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں میری اب تک کی زندگی کتنی محرومیوں میں بسر ہوئی' ممانی کے گھر میں بھی تو اس طرح دھتکارا جاتا تھا کہ اپنا آپ نفرت انگیز لگنے لگتا تھا' یہاں آکر بھی کبھی وہی احساس پھر سے جاگ اٹھتا تھا۔"

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولتی جا رہی تھی' فواد بڑی محویت سے اسے سن رہا تھا۔

"میں اتنی نیگیٹو ہو چکی تھی کہ دادو جتنا زیادہ ماضی کے بارے میں معذرت کرتے' اپنی محبت اور شفقت سے اس کی تلافی کی کوشش کرتے' میں اتنا ہی بولتی' ان سے دور بھاگتی' ان کی باتوں کی' کوششوں کی نفی کرتی' ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے کیا کھو دیا؟"

وہ سر جھکائے' فواد کی جانب دیکھے بغیر بول رہی تھی' اس کی بھرائی ہوئی آواز سے اس کی کیفیت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔

"ماضی سے باہر نکل آؤ بانو! جب تک ماضی میں زندہ رہو گی' تکلیف ہو گی' حال دیکھو' مستقبل کے بارے میں سوچو' سب کچھ روشن ہے پھر ماضی کے اندھیروں کی طرف کیوں دیکھتی رہتی ہو۔" فواد اس کا جھکا ہوا سر دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"میں جان بوجھ کے ایسا نہیں کرتی بس خود بخود خیال آجاتا ہے' پھر بس جیسے فلم کی ریل سی چل پڑتی ہے۔ ایک کے بعد ایک منظر ذہن میں آتا رہتا ہے۔" حمیدہ بانو نے جیسے اپنی صفائی پیش کی۔

"خود کو مصروف رکھو گی تو الٹے سیدھے خیالات دماغ میں نہیں آئیں گے۔"

"آپ کی باتوں سے میں بہت ریلیکس ہو جاتی ہوں۔" حمیدہ بانو نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"استاد آخر استاد ہوتا ہے لڑکی!" فواد مسکرایا "ویسے مطلع ابھی تک ابر آلود کیوں ہے؟" فواد نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہوں میں!" وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

"اب ساری باتیں یکسر فراموش کر کے ایگزام کی تیاری کرو' مجھے بہت اچھا رزلٹ چاہیے۔ آؤٹ اسٹینڈنگ رزلٹ۔" فواد بھی اسے نصیحت کرنا نہ بھولا۔

☼ ☼ ☼

"بڑے پاپا آپ کی ٹیبلٹس" وہ آنکھیں موندے پڑے تھے جب ماہم پانی کا گلاس لے آئی اور دراز میں سے ان کی گولیاں نکالیں۔

"ارے بیٹا! میں ابھی کھا لیتا' تم نے ناحق زحمت کی۔" وہ اٹھ بیٹھے اور اس کے ہاتھ سے گولیاں لیں۔

"مجھے پتا ہے کیسے کھاتے ہیں' بھول جاتے ہیں' پابندی سے دوائی کھاتے نہیں' تب ہی تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے بار بار۔" ماہم کے شکوے نما ڈانٹ میں تشویش اور محبت دونوں رنگ نمایاں تھے۔

"یاد ہوتا ہے بیٹا! مگر بس روز روز میڈیسن لینے کو دل نہیں چاہتا' تنگ آگیا ہوں دوائیاں کھا کھا کر۔" انہوں نے گولیاں نگل کر پانی کا گھونٹ بھرا۔

"جیتی رہو۔" گلاس واپس ماہم کو دیتے ہوئے انہوں نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا "بیٹیاں تو واقعی اللہ کی رحمت ہوتی ہیں' کاش ذیشان کے علاوہ میری کوئی بیٹی بھی ہوتی تو شاید اسی طرح میرا خیال رکھتی۔ یہ بچی بے چاری کب تک مجھے دیکھے گی' ایک دن اس گھر سے رخصت ہو جائے گی۔" ماہم کے جانے کے بعد وہ اپنے خیالات میں گم ہو گئے۔

"مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ پیاری سی محبت کرنے والی بیٹی گھر میں ہی ہمارے پاس ہی رہے۔" اچانک ہی ذیشان اور ماہم کے حوالے سے ایک خیال کا کوندا ان کے ذہن میں لپکا۔

"ذیشان سے بات کرتا ہوں' مان تو جائے گا' آخر اتنی اچھی لڑکی کو بھلا کون ناپسند کرے گا۔" پچھلی بار فون پہ بات کرتے ہوئے وہ بتا رہا تھا کہ آج کل اس کا بڑا ٹف شیڈول چل رہا ہے۔" انہیں سوچتے سوچتے یاد آیا۔

"ذرا یہ دن گزر جائیں پھر میں اس کی مرضی معلوم کرتا ہوں' پتا نہیں' انہیں کسی اور کو پسند نہ کر رکھا ہو' یہ عمر ایسی ہی ہوتی ہے' کسی پہ دل آتے کیا وقت لگتا ہے' خیر۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

"اللہ کرے کہ ایسا نہ ہو' شاید بات کچھ بن ہی جائے۔" وہ ذیشان اور ماہم کے حوالے سے خوش رنگ سپنوں کے تار بن رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

حمیدہ بانو کے پیپرز ہو رہے تھے۔ وہ امتحانوں کی تیاری میں یوں لگی ہوئی تھی کہ کھانے پینے کا ہوش تھا نہ کسی اور چیز کا۔ ایک کے بعد ایک' اللہ اللہ کر کے پیپرز ختم ہوئے تو اس کے ساتھ ساتھ فواد نے بھی سکون کا سانس لیا۔

"اب آج تم سب سے پہلے ڈھنگ سے کھانا کھانا۔ خوب سارا کھانا' وہ بھی بہت اطمینان اور سکون کے ساتھ۔" فواد نے کالج سے آتے ہی اسے سب سے پہلی نصیحت کی۔

"اب جب تک رزلٹ نہیں آجاتا' تب تک فکر میں نہیں کھایا جائے گا۔" حمیدہ بانو نے مسمسی سی شکل بنائی۔

"پیپرز اچھے ہوئے ہیں رزلٹ بھی اچھا ہی آئے گا' بے کار میں پریشان مت ہو۔" فواد نے اسے سمجھایا۔ "فریج میں پھل پڑے ہیں' جوس ہے' دودھ ہے' کھاؤ پیو' ذرا اپنی جان بناؤ' پہلے ہی دھان پان سی ہو'

پیپرز کے دوران اور بھی کمزور کرلیا خود کو' آئینے میں خود کو دیکھا کبھی۔ کیسی ہو رہی ہو۔" فواد کی ڈانٹ نہ جانے کیوں اسے اچھی لگ رہی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے آئینہ دیکھنے کی' آپ دیکھتے تو ہیں مجھے اتنی توجہ اور غور سے۔" حمیدہ بانو نے دھیرے سے کہا۔

"مجھے تو توجہ اور غور سے دیکھنا ہی ہے تمہیں' اور تمہاری فکر بھی کرنی ہے میرے دوست کی امانت ہو' میں تمہاری کیئر نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔"

فواد اس کے غیر معمولی لہجے پہ چونکا تو ضرور مگر کمال ہوشیاری سے اپنے تاثرات چھپا کر اس نے بات کو ہلکا پھلکا رنگ دینے کی سعی کی۔

"پھر وہی۔۔۔" حمیدہ بانو کے منہ میں یکایک کڑوا بادام آگیا۔

"اس نام کو بیچ میں لائے بغیر بات نہیں کرسکتے آپ؟" وہ نروٹھے انداز میں گویا ہوئی۔

"یہ نام ہی نہیں بلکہ اس نام کا جیتا جاگتا فرد ہمارے درمیان موجود ہے بے وقوف لڑکی۔"

"بے وقوف میں نہیں' آپ ہیں' آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ۔۔۔" حمیدہ بانو نے روانی سے بولتے بولتے یکدم خود کو بریک لگایا۔

"میری سمجھ میں سب آتا ہے بانو! مگر کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا نہ سمجھنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے' معاملات اور اشیا کو ان کے طے شدہ مقام پر ہی رہنے دیا جائے تو عافیت ہے' ادھر سے ادھر کرنے میں گڑبڑ اور فساد کا اندیشہ ہوتا ہے' کیا سمجھیں؟"

فواد نے سنجیدگی سے بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک بالکل الگ اور انوکھا جذبہ بہت شفاف اور نمایاں طور پر ہلکورے لے رہا تھا۔

"افراد اور اشیا کے مقام کا تعین کون کرتا ہے؟" حمیدہ بانو یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی' کچھ تو تھا خاص اس کی آنکھوں میں جو فواد کو مسمرائز کیے دے رہا تھا۔

"یہ فیصلے ہم نہیں کرتے' یہ ہمارے اختیار سے باہر ہیں۔" فواد نے بے اختیار ہی اس کی بولتی آنکھوں سے نظریں چرائیں۔

"جب فیصلے ہمارے اختیار میں نہیں تو دل کیوں اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔" حمیدہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"بات بہت سیدھی ہے نادان لڑکی! جب دماغ بھٹکتا ہے تو دل بھی بھٹک جاتا ہے' خیالات قابو میں رہیں تو دل کبھی اختیار سے باہر نہیں ہوتا۔"

"اور اب تم اوٹ پٹانگ خیالات کی دنیا سے باہر آؤ' جو کہا ہے اس پر عمل کرو' کھاؤ پیو' جان بناؤ' صحت مند جسم میں ہی صحت مند دماغ ہوتا ہے' اگلے سال کا رزلٹ' اس سال سے زیادہ شاندار ہونا چاہیے۔" فواد نے بولتے ہوئے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"اس سال کا رزلٹ تو آیا نہیں ابھی' پھر کیسے پتا کہ شان دار ہوگا۔" حمیدہ نے یونہی گفتگو کو طول دینے کو کہا' اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ فواد ابھی اس کے پاس سے جائے۔

"پتا نہیں ہے' بلکہ یقین ہے کہ شان دار ہی ہوگا۔"

"کیوں ہے یقین؟"

"اچھی اچھی باتوں پہ یقین رکھنے سے سب کچھ اچھا اچھا ہی ہوتا ہے۔"

"سچ؟"

"سچ۔" فواد مسکرایا اور آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

حمیدہ بانو کا شدت سے دل چاہا کہ وہ ایک بار مڑ کر پیچھے ضرور دیکھے۔

"بات سنیں۔" اس نے بے اختیار ہی فواد کو پکارا۔

"جی سنائیے۔" وہ ٹھہر گیا اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

"جائیں' کچھ نہیں۔"

"حمیدہ بانو! تم خود تو ہو ہی پاگل' مجھے بھی اپنے ساتھ پاگل کرو گی۔" فواد نے اسے گھورتے دیکھا۔

"کاش ایسا ہو جائے۔" وہ دل ہی دل میں گویا ہوئی۔

فواد چلا گیا تھا مگر وہ ہر وقت اسے' اپنے آس پاس محسوس کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم بھائی جان!"

"وعلیکم السلام' کیسی ہو عافیہ؟"

"ٹھیک ہوں' آپ سنائیں کیسے ہیں' اب تو مہینوں ہو جاتے ہیں آپ سے ملے ہوئے' میں ہی آکر مل لوں تو مل لوں' آپ تو یہاں کا رخ کرنا ہی جیسے بھول گئے۔" عافیہ کے لب و لہجہ میں طنز نہیں بلکہ شکوہ تھا' جو سراسر سچ تھا۔

"بس عافیہ! جانتی تو ہو' کچھ بزنس کی مصروفیات' کچھ میری طبیعت۔ بس کتنی بار ارادہ باندھا کہ تمہارے ہاں آؤں گا مگر وہ ارادہ عمل میں نہ ڈھل سکا۔" انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنی کوتاہی تسلیم کی۔

"بس آپ اس سنڈے کو ڈنر ہمارے ساتھ کریں۔"

"اس سنڈے کو۔۔۔" وہ ایک لمحے کو جھجکے۔

"بھائی جان! میں کوئی ایکسکیوز نہیں سنوں گی' بچے بھی آپ کو اتنا یاد کرتے رہتے ہیں' اس بار آپ کو آنا ہی ہے۔" عافیہ چھوٹی بہن والے لاڈ میں بولیں۔

"آ۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میں سنڈے کو آتا ہوں تمہاری طرف۔" کچھ تذبذب کے بعد انہوں نے ہامی بھرلی' کاروبار کے لیے تو دن رات کے چوبیس گھنٹے بھی کم پڑ جاتے ہیں مگر اپنوں سے الگ اور دور کب تک' یہ بھی کوئی زندگی ہے مہینوں ہو جاتے ہیں ایک ہی شہر میں اپنے بہن بھائیوں سے ملے ہوئے' وہ کبھی کبھی سوچ کر پشیمان بھی ہوتے۔

حسب وعدہ وہ اتوار کی شام عافیہ کے گھر تھے دو میاں بیوی' دو بچے مختصر سے نفوس پر مشتمل خوشحال گھرانہ تھا۔ عافیہ کے شوہر سرکاری آفیسر تھے اچھے وقتوں کے بنے ایک دو گھر اور چند دکانیں تھیں جن کا ٹھیک ٹھاک کرایہ آتا تھا یوں اس جان توڑ مہنگائی کے دور میں وہ خاصے چین بلکہ عیش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

پر تکلف ڈنر کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے عافیہ نے بچوں کی شادیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ نمرہ کے رشتوں کے بارے میں بتا رہی تھیں جو آج کل آئے ہوئے تھے یا آتے رہتے تھے۔

"اور بھائی جان! ذیشان کے بارے میں کیا سوچا آپ نے' میرا مطلب ہے اس کی شادی وغیرہ کے بارے میں' اب تو اس کی اسٹڈیز مکمل ہونے والی ہے۔"

"ہاں دیکھو' اس کی اسٹڈیز مکمل ہو جائے' یہاں آجائے پھر دیکھتے ہیں اس کی کیا مرضی ہے' کیا ارادے ہیں۔" وجاہت بیگ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ماہم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار انہوں نے دانستہ نہیں کیا پہلے یہ بات وہ اپنے بیٹے سے کرتے' پھر ہی کسی کے سامنے بیان کرتے۔

"اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں بھائی جان۔" عافیہ نے جھکتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

"بلا جھجک بولو۔" وہ عافیہ کے یوں جھجکنے پر پہلے تو حیران ہوئے پھر مسکرا دیے۔

"بات یہ ہے کہ نمرہ کے بہت اچھی اچھی جگہوں سے رشتے آئے ہوئے ہیں مگر میرا دل کہیں نہیں ٹھکتا' اکلوتی بیٹی ہے چاہتی ہوں اپنوں میں دوں تاکہ دل کو کسی قسم کا دھڑکا نہ رہے میں نے سوچا کہ۔۔۔" وہ ایک لمحے کو جھجکیں' رکیں۔

"میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ نمرہ کو اپنی بیٹی بنالیں' ہمارا رشتہ اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔" بڑے سبھاؤ سے بات کرتے ہوئے انہوں نے پر امید نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

وجاہت بیگ جو بہت توجہ سے بہن کی بات سن رہے تھے آخر میں چونک پڑے۔

"نمرہ؟ اس طرف تو کبھی ان کا دھیان ہی نہیں گیا' اپنے گھر میں بھتیجیاں اور بھی تھیں مگر جو قلبی لگاؤ انہیں ماہم سے محسوس ہوتا تھا۔ اتنا کسی اور سے نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی خدمت گزاری دھیرے دھیرے دل میں گھر کر گئی تھی' صرف ان کا ہی کیا وہ گھر کے سارے افراد کا یونہی خیال رکھتی تھی' حتیٰ کہ گھر میں پلنے والے طوطوں اور چوزوں کا بھی۔

"کیا سوچنے لگے؟" عافیہ غور سے ان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے ایک دھیمی سی مسکان لبوں پہ سجائی۔

"بات یہ ہے کہ میں ذیشان پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتا' نہ ہی کرنا چاہتا ہوں' وہ آجائے پھر بیٹھ کر اس سے بات کرتے ہیں جو اس کی مرضی یا یہ کہہ لو جو نصیب میں ہوگا' وہ ہو جائے گا۔" وجاہت بیگ نے بغیر کسی لگی لپٹی کے اپنی بات کی۔

"ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے۔" عافیہ کے لیے یہی بہت تھا کہ انہوں نے یکسر انکار کر کے کسی اور لڑکی کا نام نہیں لیا' گھر میں بھی بھتیجیوں کی ایک قطار موجود تھی! انہیں خاصا یقین تھا کہ آخر بات ذیشان کی مرضی پہ چھوڑی گئی تو نمرہ کے لیے وہ کبھی انکار نہیں کرے گا' آخر کیا کمی تھی ان کی بیٹی میں۔ خوبصورت تھی' طرح دار تھی' ذہین تھی' میڈیکل کا پہلا سال تھا' پروفیشن بھی ایک' پھر اکلوتی' ان کی ساری جائیداد کی اکیلی وارث بھلا ایسے رشتے کو کون ٹھکرائے گا' وہ بہت مطمئن تھیں۔

وجاہت بیگ گھر آگئے مگر رات گئے تک جاگتے رہے' جانے کیا سوچتے رہے۔ اگر آج عافیہ' نمرہ کے لیے ان سے بات نہ کرتیں تو وہ ذیشان سے ماہم کا ذکر ضرور کرتے مگر اب... وہ ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔

"اب ذیشان آئے گا' تب ہی بات کرنا مناسب ہوگا۔ اس سے پہلے نہیں۔" انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

"اللہ تعالیٰ وہی کرے' جو ہمارے حق میں بہتر ہو۔"

نیند کی آغوش میں جانے سے قبل وہ یہی دعا کرتے رہے۔

☼ ☼ ☼

"کٹ' کٹ' کٹ..." ماہم مخصوص آواز نکالتے ہوئے چوزوں کو اپنے پاس بلا رہی تھی۔ صحن میں ان کے کھانے کے لیے دانہ بکھرا ہوا تھا۔ رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے چوزے ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔

"اس گرین والے کو تو پکڑ کر مجھے دے دو۔" حمیدہ بانو دانت پیس کر ایک ننھے سے چوزے کو گھور رہی تھی۔

"کیا کرو گی؟"

"گردن مروڑوں گی۔" حمیدہ کا منہ اب تک بنا ہوا تھا۔

"ہائے اتنے کیوٹ سے چوزے ہیں' پیارے پیارے معصوم معصوم سے ان سے بھی بھلا کوئی بدلہ لیا جاتا ہے۔"

"ہونہہ پیارے پیارے' معصوم معصوم۔" حمیدہ بانو نے ماہم کی نقل اتاری۔

"کٹ کھنے' چالاک' اتنی زور سے چونچ ماری ہے' کتنا خون نکلا ہے۔" وہ ابھی تک اپنی انگلی کو لے کر بیٹھی تھی جس میں ہرے والے چوزے نے چونچ مار دی تھی بلکہ اس نے ماری کہاں تھی' بس اتفاقاً اس کے لگ گئی تھی' کم از کم ماہم کا اصرار تو یہی تھا۔

"اس کو تو دو دن کے لیے ڈربے میں بند کر دینا چاہیے' نہ دانہ' نہ پانی کچھ مت دو۔" حمیدہ بانو نے کینہ توز نظروں سے پھر اسی چوزے کو گھورا جو مزے سے صحن میں بھاگ رہا تھا۔

"اب چھوڑو بھی۔ اس بے چارے نے کوئی جان بوجھ کے تھوڑی ماری ہے' تم تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔" ماہم نے دانہ چگتے ایک چوزے پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"تمہارے لگتی تو پتا چلتا۔" اس کی مسلسل

نصیحتوں پہ حمیدہ بانو کا منہ اور پھول گیا۔

"تمہارے لگتی تو کیا ہوا' ہم معاف کر دیتے" نظر انداز کر دیتے" اتنی پیاری بے ضرر سی مخلوق پیار کے لائق ہے' نمرا کے نہیں۔" ماہم چوزوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی دھن میں بول رہی تھی۔

"جو کوئی آپ کو چوٹ یا تکلیف پہنچائے' چاہے وہ انسان ہو یا جانور' اسے نہ تو نظر انداز کرنا آسان ہوتا ہے نہ ہی معاف کرنا' ایسے باتیں بنانا آسان ہوتا ہے' جب خود پر بیتتی ہے تو پتا چلتا ہے۔" حمیدہ بانو تن فن کرتی اٹھ کر چل دی۔

"ہائیں! اسے یکایک کیا ہوا۔" ماہم ہکا بکا اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بتا تو دیں۔ کہاں لے جا رہے ہیں۔" حمیدہ بانو پوچھ پوچھ کر تھک گئی مگر فواد ایک مستقل مسکراہٹ لبوں پہ سجائے خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"اب نہیں پوچھوں گی۔" وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"تھوڑی دیر اور صبر کرو۔" فواد نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روکی۔

"ہاں بتاؤ' کیا کھاؤ گی؟" کرسی پر بیٹھتے ہوئے فواد نے اس کے خفا خفا چہرے کو دیکھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے ناراض' پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اسے بہت مزا آرہا تھا۔

"زہر" وہ پھٹ پڑی اس کا موڈ دوپہر سے ہی خراب تھا' تائی امی کی بڑبڑاہٹ کانوں میں پڑ گئی جو خیر سے اسی سے متعلق تھی۔

"مل تو جائے گا مگر اصلی کی گارنٹی نہیں' فائدہ کھانے کا' جب کام بھی تمام نہ ہو۔" فواد نے جلتی پہ تیل ڈالا۔

"مجھے گھر جانا ہے۔" وہ بھنا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ' دو عالم سے خفا لڑکی!"

"رزلٹ آگیا ہے۔" چند لمحوں کا وقفہ دے کر اس نے ڈرامائی انداز میں اعلان کیا۔

"کیا..." حمیدہ بانو کا ردعمل بے ساختہ اور بھرپور تھا۔ "میرا کیا ہوا؟"

"فرسٹ ڈویژن ہے اور سب سے پہلی مبارک باد میری طرف سے۔" فواد کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی خوشی جھلک رہی تھی۔

"سچ!" حمیدہ بانو کے چہرے پر پل بھر میں خوشی کے اتنے اور ایسے رنگ بکھرے کہ فواد بے اختیار اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

"بالکل سچ' اچھا اب جلدی سے بتاؤ گفٹ کیا لو گی؟"

"جو مانگوں گی' دیں گے؟"

"اگر میری پہنچ وہاں تک ہوئی تو ضرور۔"

"آپ کی پہنچ وہاں تک ہے' بلکہ آپ کی ہی پہنچ وہاں تک ہے۔" حمیدہ بانو کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"او کے' چلو بتاؤ۔" وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

"مجھے فواد بیگ چاہیے' اس کا ساتھ اور اس کی... اس کی محبت۔" وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

☼ ☼ ☼

جاتی سردیوں کی تھوڑی ٹھنڈی تھوڑی میٹھی سی ہوا تھی' سوئٹر' شال سے بے نیاز وہ فقط دوپٹا اوڑھے چھت پر موجود تھی۔

"ماہم! تمہیں چاند اچھا لگتا ہے۔" آسمان پہ چمکتے چاند کو دیکھ کر وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"تم چاند کی بات کرتی ہو' مجھے تو کوئلہ بھی بہت اچھا لگتا ہے۔" ماہم اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"کیا مطلب؟" حمیدہ بانو کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"بھئی اللہ کی بنائی ہوئی ہر شے بہت خوب ہے چاہے وہ پھول ہوں یا کانٹے' چاند ہو یا کوئلہ۔"

"تم کبھی کبھی بالکل فواد سر کی طرح باتیں کرتی ہو' ایک دن وہ بھی کچھ اسی قسم کی بات کررہے تھے کہ جو دل کے اچھے ہوتے ہیں انہیں نہ چیزوں میں کوئی خامی نظر آتی ہے نہ انسانوں میں کوئی برائی' اللہ کی ہر تخلیق اپنی جگہ خوبصورت ہے۔" حمیدہ بانو غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"بھئی۔ جب بہن بھائیوں کی شکلیں آپس میں مل سکتی ہیں تو خیالات بھی ایک جیسے ہوسکتے ہیں۔" ماہم نے بے نیازی سے کاندھے اچکائے۔

"اچھا۔ میں نے ایک سوال پوچھا تھا' تم بات کو کہاں سے کہاں لے گئیں۔" ماہم کو اپنا سوال یاد آیا۔

"جواب یہ ہے کہ مجھے چاند بہت پسند ہے۔" ماہم نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم یہ بتاؤ تمہیں یہ چاند یکایک کیوں اچھا لگنے لگا؟" ماہم نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

"پتا نہیں۔"

"پتا ہے' چاند کب اچھا لگنے لگتا ہے؟"

"اونہوں!" حمیدہ بانو نے نفی میں سر ہلایا۔

"جب انسان کا دل اس کے اپنے پاس نہیں رہتا' اپنے بس میں نہیں رہتا' پھر اسے چاند میں وہ تصویر دکھائی دینے لگتی ہے' جس کی وجہ سے دل انوکھے انداز میں دھڑکنے لگتا ہے اور جب انسان کسی اور سے کچھ کہہ نہیں سکتا تو پھر وہ چاند کو اپنا ہمراز اپنا دم ساز بنالیتا ہے' چاند اسے اچھا لگتا ہے کہ وہ خاموشی سے اس کی ساری باتیں سنتا رہتا ہے' مسکراتا رہتا ہے' اور۔۔۔" ماہم ایک جذب کے عالم میں بولتے بولتے یک دم خاموش ہوگئی' جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"ماہم!" حمیدہ بانو نے دھیرے سے اسے مخاطب کیا۔ "تم۔۔۔ You are in love" وہ بے دھڑک بولی تھی۔

ماہم چپ رہی' اس کا چہرہ اس وقت ایک ایسا آئینہ بن چکا تھا جس میں حمیدہ بانو کو اس کے ساتھ ساتھ اپنی بھی تصویر نظر آرہی تھی۔



"کیا بات ہے یار' جیسے جیسے میرے آنے کے دن قریب آرہے ہیں' تو اتنا ہی کم کم بات کرنے لگا ہے' بہت مصروف رہنے لگا ہے۔ مجھ سے بھی زیادہ۔"

"بس یار۔ مصروفیت کچھ ایسی ہوگئی ہے' کالج کے علاوہ کوچنگ بھی جوائن کرلی ہے۔ فرصت ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی' فراغت ایک خواب ہوگئی ہے۔" ذیشان کے شکوے پر وہ کچھ چور سا بن گیا۔

"تو سنا' پروجیکٹ کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ٹھاک' تو آئے گا تو بات کریں گے۔" حمیدہ بانو کے ذکر پر اب فواد اسے یونہی ٹال دیتا تھا۔ ذیشان نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

"ریسٹ کر یار' پھر بعد میں بات کرتے ہیں' ٹھیک ہے؟ اللہ حافظ۔"

"خدا حافظ!" فواد کتنی دیر خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اب اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ ذیشان سے کیسے بات کرے' کیا بات کرے' بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی' دلوں میں بھی' زندگیوں میں بھی۔

وہ کھڑا ہوا اور کھڑکی کا پردہ کھینچ دیا۔

کچھ عرصہ پہلے حمیدہ بانو کی جرات نے اسے بے پناہ حیران اور پھر پریشان کردیا تھا۔

"اتنی چھوٹی لڑکی' اور اتنی بڑی بات؟" وہ ششدر رہ گیا تھا' حمیدہ بانو کے انداز و اطوار کچھ بدلے بدلے تو تھے' باتیں معنی خیز ضرور ہوگئی تھیں مگر کیا یہ ضروری تھا کہ اس کے شکوک و شبہات سچ ہی ثابت ہوتے' سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ اس نے حمیدہ بانو کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی' یہ سچ تھا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ اس کا دماغ حمیدہ بانو کو سمجھانے کے لیے جو بھی تاویل پیش کرتا تھا' دل اس سے متفق نہ ہوتا تھا۔ اسے علم ہی نہیں ہوسکا کہ کب اس کے دل میں نقب لگی' احساس تک نہ ہوا اور اب جو دل کو ٹٹولا تو ایک خفیہ گوشے میں حمیدہ بانو بڑی شان سے براجمان مسکرا رہی تھی۔ یہ نہیں ہوسکتا' یہ امانت میں خیانت ہے' فواد نے جانے خود کو سمجھایا تھا یا اسے مگر وہ بپھر گئی تھی۔

"کیا سمجھتے ہیں آپ مجھے' کوئی بے جان شے' جو آپ کے پاس رکھی ہوئی ہے کسی کی امانت' اور جب امانت لوٹانے کا وقت آئے گا تو آپ مجھے اٹھا کر کسی کے حوالے کردیں گے۔ فواد صاحب! میں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں' گوشت پوست کی بنی ہوئی۔" وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوئی۔

وہ چپ ہوگئی مگر چند لمحوں بعد بولی تو اس کا لہجہ التجائیہ اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں ایک عام سی لڑکی ہوں' بہت اونچے اونچے خواب نہیں ہیں میرے' مجھے کوئی سپر قسم کی پرسنالٹی اور ہائی فائی لائف نہیں چاہیے۔ مجھے بس ایسا دل چاہیے جسے میری پروا ہو' اور وہ دل صرف اور صرف آپ کا ہوسکتا ہے اور کسی کا نہیں' میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں۔"

"ایسی بات نہیں ہے بانو! ذیشان کا دل بھی ایسا ہی ہے' وہ تمہاری کیئر کرے گا' بہت پروا کرے گا' شاید مجھ سے بھی زیادہ۔" یہ بات فواد اس سے کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا' وہ ذیشان کی وکالت نہ کرسکا حمیدہ بانو کے سامنے۔ اس پر اچانک ہی انکشاف ہوا تھا کہ اس کا اپنا دل ہی باغی ہورہا تھا۔

"کیا محبت اتنا طاقتور جذبہ ہے یا میں ایک کمزور انسان' جو اتنی جلدی ہار مان گیا۔" وہ ایک کمزور پتے کی طرح اس کے سامنے بکھر رہا تھا۔

"بانو! ایسا مت کہو' میں ذیشان کو کیا جواب دوں گا' کیا کہوں گا اس سے کیا سوچے گا' جب اسے علم ہوگا کہ۔۔۔" فواد جیسے اس کے آگے گڑگڑایا۔

"کچھ نہیں ہوگا' نہ وہ کچھ سوچے گا' میرے اور ذیشان کے درمیان کوئی **کمٹمنٹ** نہیں رہی تھی' کوئی عہد و پیماں نہیں تھے ہمارے درمیان' اور یہ ذیشان کی نہیں' دادو کی خواہش تھی اسی خواہش کا مان رکھنے کے لیے اس نے میرے لیے ہامی بھرلی۔ میرے دل میں اور زندگی میں نہ ذیشان کی گنجائش ہے نہ کسی اور کی۔" بانو وہاں نہیں رکی' وہ چلی گئی مگر فواد کہاں جاتا' حقیقت سے انکار ممکن نہ تھا اور حقیقت یہی تھی کہ جو کچھ حمیدہ بانو نے کہا' فواد کا دل بھی اس کا ہم نوا تھا۔

"اف' بیٹھے بٹھائے کیسی مصیبت میں ڈال دیا اس دل نے۔" وہ سوچتے ہوئے کراہا تھا۔



"امی جان! آپ کے سر میں ڈینڈرف تقریباً" ختم ہی ہوچکی ہے ایک دوبار مالش کے بعد دیکھیے گا بالکل ہی ختم ہوجائے گی۔" ماہم نے نیم گرم زیتون کے تیل سے ماں کے سر میں مالش کرتے ہوئے بڑی مسرت سے اطلاع دی۔

"اچھا!" وہ مسکرادیں۔

"چلو' تمہاری محنت وصول ہوگئی' ہر ہفتے کی مالش رنگ لے آئی' ورنہ میں تو سر کی اس خشکی سے بہت عاجز آگئی تھی' خاص طور پر سردیوں میں تو یہ وبال جان بن جاتی ہے۔" امی نے مالش کے دوران سکون محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کیں۔

"امی جی! آپ کل کچھ کہہ رہی تھیں' فواد بھائی کی شادی کے بارے میں۔" ماہم نے ذکر چھیڑا۔

"ہاں' سوچتی ہوں' اس کا رشتہ کردوں' خیر سے تمہارا ابھی کہیں ہوجائے تو دونوں کی شادی ساتھ کردوں گی۔" امی نے اپنا ارادہ اس کے سامنے ظاہر کیا۔

"فواد بھائی کے لیے کسے سوچا ہے آپ نے؟" ماہم نے تیل کی بوتل ہتھیلی پہ ٹیڑھی کی۔

"میں نے تو فواد کے لیے فروا کو سوچ رکھا ہے' ویسے خوبصورت تو کومل بھی بہت ہے مگر ہے بہت نخریلی میرا بچہ ہے سیدھا سادا' اس کے ساتھ کوئی اسی جیسی ہونی چاہیے' کیوں؟" انہوں نے بھانجی کو فوقیت دیتے ہوئے جیٹھانی کی بیٹی پر بلاوجہ ہی تبصرہ کر ڈالا۔

"آپ نے فواد بھائی کی مرضی معلوم کی؟" فروا کا نام سن کر ماہم کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اسے صورت حال کا پوری طرح ادراک نہیں تھا مگر اس نے دیکھا تھا کہ فواد کے ذکر پر ہی حمیدہ بانو کی آنکھیں کیسے چمکنے لگتی تھیں اور خود فواد بھائی کا رویہ خاصا بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ اس سے بھی پوچھیں گے' آخر اس کی زندگی کی بات ہے مگر وہ کون سا ہماری مرضی کو رد کرے گا' یوں آنکھ بند کر کے ہاں کر دے گا۔" ہر ماں کی طرح انہیں بھی اپنی اولاد کے بارے میں خاصی خوش فہمی تھی۔

"اللہ کرے آپ کا یہ گمان درست ثابت ہو۔" ماہم نے دل سے دعا کی اس کے ہاتھ مسلسل بڑی مشاقی کے ساتھ مالش میں مصروف تھے۔

"اللہ تعالیٰ تمہارا بیڑا پار لگا دے تو میری ساری فکر دور ہو جائے۔"

ماہم نے ان کی بات ٹھیک سے سنی ہی نہیں وہ اپنی ہی الجھنوں میں گرفتار تھی۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی' سیدھی سادی' مگن انداز میں کہ دل کو ذیشان اچھا لگنے لگا' دل کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

"کوئی تک ہے۔ بھلا اس کا تمہارا کیا جوڑ' چھوڑو بھئی' اپنی حدود میں رہو" اس نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"کیا خبر' کوئی معجزہ ہو جائے۔" دل خوش فہم نے تاویل پیش کی۔

"اور جو کوئی معجزہ نہ ہوا' کسی تلخ حقیقت کا سامنا کرنا پڑا پھر؟" اس نے دل خوش فہم سے سوال کیا۔

"دیکھا جائے گا۔" خوش فہمی کے ساتھ ساتھ لاپروائی کی بھی حد تھی۔ مگر ماہم پریشان تھی۔ وہ خوف زدہ تھی' خواب دیکھنے سے ڈرتی تھی مگر دیکھنے لگی تھی' محبت کرنے سے ڈرتی تھی مگر کرنے لگی تھی۔

ذیشان سے اس کا لگاؤ کوئی آج کا نہیں تھا۔ یہ بہت پہلے کی بات تھی' نوعمری کے زمانے کی جب پہلی بار اس کی آنکھوں میں سپنے آئے تو اس نے ذیشان کو سوچا' دوستانہ مزاج کا حامل اس کا بہت ہی اچھا کزن' خاموشی سے آکر اس کے دل میں براجمان ہو گیا تھا۔ ماہم نے کسی سے بھی کچھ نہیں کہا۔ اپنے خوابوں کی دنیا میں وہ اکیلی ہی گھوم رہی تھی۔ جانے کیوں' حمیدہ بانو کے سامنے وہ تھوڑی سی بے اختیار ہو گئی تھی مگر راز دل پھر بھی کہا نہیں۔

جانے اس کشتی کے مقدر میں کیا ہے طوفان یا ساحل' آنکھیں موندتے ہوئے اس نے سوچا۔

☼ ☼ ☼

عافیہ پھپھو آئی ہوئی تھیں' گھر میں گہما گہمی کا سا سماں تھا۔ ایک تو چھٹی کا دن۔ سب ہی افراد گھر پر ہی تھے۔ بڑے بابا' چھوٹے ابو اور تائی امی مل کر ذیشان کے کمرے کی کلر اسکیم سیٹ کر رہے تھے۔ اس کے آنے میں چند ماہ تھے۔ ابھی سے اس کے کمرے کی تزئین و آرائش کی تیاریاں جا رہی تھیں۔

عافیہ پھپھو بڑے غور سے حمیدہ بانو کا جائزہ لے رہی تھیں' باپ کے انتقال کے بعد سے ان کا آنا کافی کم ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ ان کی وجہ سے جلدی جلدی آجاتی تھیں' حالانکہ میکے میں بھائی' بھاوجیں سب اچھے مزاج کے تھے' مگر بس ان کا اپنا دل ہی جیسے اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ درمیان میں ایک' دو بار آئیں بھی تو حمیدہ بانو سے ان کا سامنا نہیں ہوا' اب جو عرصے بعد اسے دیکھا تو حیران رہ گئیں' ان کے تصور میں تو وہی حمیدہ بانو تھی' میلی کچیلی سی' اول جلول حلیے میں لڑاکا اور بدتمیز' مگر یہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی' اس کے ریشمی خوبصورت بال کمر تک آتے تھے' اس کے رنگ روپ میں کشش تھی' ملاحت تھی جو دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی' اس کے لب و لہجے میں شائستگی اور اٹھنے بیٹھنے میں وہ طریقہ اور سلیقہ چھلکتا تھا جو اس گھرانے کی خواتین کا طرۂ امتیاز تھا۔

"حمیدہ بانو کتنی بدل گئی ہے' میں تو دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں' میرا کوئی بیٹا ہوتا تو چھوٹے بھائی صاحب کی نشانی میں اپنے گھر لے جاتی۔" عافیہ کو حمیدہ بانو دیکھ کر اپنے بھائی کی یاد آگئی۔

"اپنی ماں کا رتو ہے۔" بلقیس چچی کوئی بھی بات دل میں رکھنے کا تکلف نہیں کرتی تھیں بڑی تائی فقط مسکرا کر رہ گئیں۔ اب کماؤ پوت تو اس گھر میں ان کا بھی تھا مگر اس کا رشتہ وہ اپنی بھتیجی سے طے کر چکی تھیں۔

ماہم لاؤنج میں آئی تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"کیا ہوا' منہ پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" نمرہ نے اسے دیکھ کر استفسار کیا۔

"گرین والا چوزہ بے چارہ مر گیا۔" ماہم کی شکل دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو اب آئے کہ تب آئے۔

"بہت اچھا ہوا' اسی نے میری انگلی میں اتنی زور سے چونچ ماری تھی' خون نکل آیا تھا۔" حمیدہ بانو اپنی چوٹ بھولی نہیں تھی۔

"بہت بے رحم ہو' بے چارہ اتنا معصوم سا چوزہ تھا۔" ماہم نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"بھلے سے جتنا ہی معصوم ہو' مجھے تو تکلیف پہنچائی نا!" حمیدہ بانو نے کندھے اچکائے۔

نمرہ حیرانی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کوئی ہمیں بھی بتائے گا کہ کیا ماجرا ہو گیا ہے۔" کومل نے مداخلت کی۔

"ماہم آپی کا چوزہ مر گیا۔" نمرہ نے بریکنگ نیوز نشر کی۔

"اوہ ویری سیڈ' پھر سوئم کا مینیو کیا ہوگا؟" کومل نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"شرم کرو تم لوگ' ایک جان دنیا سے چلی گئی' تمہیں کھانے کی پڑی ہوئی ہے۔ بس سادا سا کھانا ہوگا

سوئم کا' بریانی' کباب اور ٹرائفل' کولڈ ڈرنک بھی ہوجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔" عفان جانے کہاں سے آن ٹپکا تھا اور اب وہ بھی باقیوں کی طرح مزے لے رہا تھا۔

"بہت برے ہو تم سب۔" ماہم سب سے خفا ہوگئی۔

"افوہ' ماہم آپی! خفا تو مت ہوں' ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔" نمرہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھالیا۔

"سوائے میرے۔" حمیدہ بانو نے پھر لقمہ دیا۔

"کتنی سنگ دلی دکھا رہی ہو بانو! بے چارے نے چوچنچ ہی تو ماری تھی' کوئی جان تو نہیں لی تمہاری۔"

"میں تو ایسی ہی ہوں' کوئی مجھے اتنی سی بھی چوٹ پہنچائے' نہ میں برداشت کرسکتی ہوں' نہ بھول سکتی ہوں۔" حمیدہ بانو نے بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنے مزاج کا وہ پہلو آشکار کیا جو شاید اب تک سب کی نظروں سے اوجھل تھا۔ سب نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

فواد بڑی روانی سے غالب کی غزل کی تشریح بیان کررہا تھا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جماہیاں روک رہی تھی۔

"سمجھ میں آئی؟" آخری شعر کی تشریح بیان کرکے فواد نے اسے پوچھا۔

"سچ بتاؤں؟"

"ہوں"

"سب کچھ سر پر سے گزر گیا۔"

"بڑی بڑی مشکل چیزیں آرام سے سمجھ لیتی ہو اور اتنی آسان سی شاعری سر پر سے گزر گئی۔" فواد نے اس کی عدم دلچسپی پہ اسے لتاڑا۔

"مجھے شاعری واعری میں انٹرسٹ نہیں ہے' زیادہ دلچسپی لینے کی کوشش کرتی ہوں تو نیند آنے لگتی ہے۔" حمیدہ بانو بے چارگی سے گویا ہوئی۔

"ویسے حیرت کی بات ہے! سنا ہے محبت کرنے والے دلوں پہ شاعری زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔" فواد اسے دیکھتے ہوئے شریر ہوا۔

"اپنے اپنے مزاج کی بات ہے' مجھے شاعری اچھی نہیں لگتی تو کیا کروں؟" حمیدہ بانو زچ ہوگئی۔

"پھر حمیدہ بانو کو کیا اچھا لگتا ہے؟" فواد کا لہجہ گمبھیر ہوگیا۔

"مجھے..... مجھے چمکتا چاند اچھا لگتا ہے بارش اچھی لگتی ہے' اور تتلیاں پھول' جگنو' ستارے' سب اچھے لگتے ہیں۔" حمیدہ بانو سوچ سوچ کر بتانے لگی۔

"ہوں' تو پھر آج رات آئس کریم کھانے چلتے ہیں کہیں' لڑکیاں کئی دنوں سے فرمائش کررہی ہیں' ان کی فرمائش بھی پوری ہوجائے گی۔" فواد نے جھٹ پٹ پروگرام بنایا "آج فل مون ہے نا' جی بھر کے چاند دیکھتی رہنا اور آئس کریم کھاتی رہنا' آئس کریم بھی تو تمہاری فیورٹ ہے نا۔"

"آپ کی امی کو اعتراض ہوگا۔" حمیدہ بانو کچھ سوچ کر بولی۔

"میری امی اتنی خوفناک نہیں ہیں یار! تم ان سے اتنا کیوں ڈرتی ہو؟"

"ان سے نہیں ان کی زبان سے ڈرتی ہوں۔" حمیدہ بانو نے سوچا مگر کہا نہیں۔

"ان کے قریب ہونے کی کوشش کرو' ان کا دل جیتنے کی کوشش کرو' امی سے اتنی خائف کیوں ہو؟"

"آپ کو علم ہے' پھر بھی پوچھ رہے ہیں؟" حمیدہ بانو کی سوالیہ نگاہیں فواد کی جانب اٹھیں۔

"اچھا چلو چھوڑو' آؤ محبت کی بات کریں۔"

فواد کے شریر لہجے پر اس کا چہرہ گلنار ہوگیا۔

"وقت آنے پر یہ باتیں بھی ہوجائیں گی۔" اپنی کتابیں سمیٹتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

بلقیس چچی نے اپنی بھانجی کے لیے فواد کی رضامندی چاہی تھی' اس نے کسی لیت و لعل سے کام

نہ لیتے ہوئے حمیدہ بانو کا نام لیا تو ان کا پارہ ہائی ہوگیا۔

"جادو چل گیا اس چڑیل کا تم پہ' مجھے پہلے ہی معلوم تھا' یہ لڑکی کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی یہاں' مگر تم سے یہ امید نہیں تھی تم تو پڑھے لکھے ہو' سینکڑوں' ہزاروں لوگوں سے تمہارا واسطہ پڑتا ہے' تمہیں ابھی تک انسانوں کی پرکھ کرنا نہیں آئی' یہ لڑکی کسی طرح بھی نہ تمہارے قابل ہے نہ ہمارے گھر کے لیے موزوں۔"

"آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ وہ چھوٹے چچا کی بیٹی ہے' اس گھر کی پوتی' ہمارا اپنا خون۔ میری سمجھ میں نہیں آتا نہ آپ اسے اتنا ڈی گریڈ کیوں کرتی ہیں' امی اس بے چاری نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔" فواد جھنجلا گیا تھا۔

"تم نہیں جانتے' اس کی ماں....." ان کی بات ان کے منہ میں ہی رہ گئی' فواد نے بہت تیزی اور غصے کے ساتھ ان کی بات کاٹی تھی۔

"فار گاڈ سیک امی! نہ تو آپ زندوں کو بخشتی ہیں نہ مرے ہوؤں کو' حد کردی آپ نے۔"

وہ غصہ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

بلقیس ہکا بکا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں' وہ تو بہت شگفتہ مزاج اور ہنس مکھ قسم کا لڑکا تھا' وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ فواد کبھی ان سے اس طرح بھی بات کرسکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ذیشان آگیا تھا اور وہ کیا آیا' گھر میں رشتے داروں اور ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سب ہی اس کے لیے دعاؤں کے تحفے اور تہنیتی پیغامات لارہے تھے' گھر کی خواتین مہمان داریاں اور خاطریں کرکر کے تھک رہی تھیں مگر بے زار کوئی نہ تھا۔ خوشی کا مقام تھا' کامیابی کا موقع تھا' بڑوں نے پروگرام بنایا تھا کہ کچھ دن بعد ایک شاندار سی دعوت کی جائے سب خاندان والوں کی۔

ذیشان سو کر اٹھا' فریش ہو کر سیدھا کچن میں آگیا۔ وہاں حسب معمول ماہم موجود تھی' ماسی جمیلہ برتن دھو رہی تھی' ماہم فریزر میں منہ گھسائے جانے کیا دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" ذیشان نے ہشاش بشاش آواز میں کہا۔

"وعلیکم السلام۔" ماہم چونک کر پیچھے مڑی۔

"صبح بخیر کہہ سکتا ہوں۔" ذیشان نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے گیارہ بج رہے تھے۔

"جو دل چاہے کہیں' وقت ہمارا اپنا ہے' صبح ہو یا دوپہر۔" ماہم کچھ فلسفیانہ قسم کے موڈ میں تھی۔

"ہوں!" وہ مسکرادیا۔

"ناشتے میں کیا لوگے؟"

"صرف ایک گلاس فریش جوس۔"

"کچھ اور بھی کھالو۔" ماہم نے آفر کی۔

"نہیں یار پھر لنچ ٹھیک سے نہیں کیا جائے گا۔" وہ پاؤں پھیلا کر آرام سے بیٹھا تھا۔

"تم ہمیشہ سے کھانے کے چور ہو' یاد ہے' دادو سے اسی بات پر کتنی ڈانٹ کھاتے تھے اور پھر زبردستی ان کے ہاتھ سے کھانا۔" ماہم پرانی یادوں میں کھونے لگی۔

"کھانے کے علاوہ اور بھی کئی باتوں پہ ڈانٹ پڑتی تھی دادو سے۔" ذیشان کے لبوں پہ ایک ایسی مسکراہٹ آئی جس میں سنہری یادوں کی سرخوشی کی جھلک بھی تھی اور جدائی کے کرب کا رنگ بھی تھا۔

"ہاں' جب تم سردیوں میں جیکٹ یا سوئٹر کے بغیر باہر نکل جاتے تھے' یا دودھ پینے میں نخرے دکھاتے تھے اور جب آدھی آدھی رات کو نائٹ بلب کی روشنی میں عمران سیریز' کرنل فریدی اور حمید کو پڑھا کرتے تھے' وہ ڈانٹتے تھے نظر کمزور ہوجائے گی۔"

"تمہیں اتنی پرانی باتیں یاد ہیں؟" ذیشان نے کچھ کچھ حیرانی اور کچھ مسرت سے سیب چھیلتی ماہم کو دیکھا۔

"اتنی زیادہ پرانی بھی نہیں' چند سال پہلے کی تو باتیں ہیں' کیا تمہیں یاد نہیں تھیں؟"

"ہاں' مجھ کو یاد ہیں اور رہیں گی' آخر میری باتیں ہیں نا۔"

"مجھے بھی اسی لیے یاد ہیں کہ وہ تمہاری باتیں ہیں۔" ماہم نے مسکرا کر اسے دیکھا مگر کہا نہیں۔

"ماہم! مجھے ایک بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔"

"کس بات کا؟" وہ چونکی۔

"تم اتنی ٹیلنٹڈ اور بریلینٹ اسٹوڈنٹ تھیں مگر بی ایس سی آنرز کی ڈگری ہاتھ میں لیے کچن میں آگئیں' گھر تو ملازم بھی سنبھال لیتے' تم اپنی اسٹڈی مکمل کر لیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"ملازم تو صرف کام کر سکتے ہیں' گھر اور گھر کے افراد کی دیکھ بھال تو گھر کا فرد ہی کر سکتا ہے۔ شازیہ آپی اور نادیہ آپی کی شادیوں کے بعد گھر کو دیکھنے والا کون تھا' تائی امی اور ہماری امی دونوں ہی اپنی صحت کی وجہ سے لاچار ہیں' تھوڑا بہت کر لیا تو کر لیا' میں بھی پڑھائی میں لگ جاتی تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا۔" ماہم دھیرے دھیرے بولی۔

"آخر قربانیاں' بے چاری خواتین کے حصے میں ہی کیوں آتی ہیں؟" ذیشان نے سوال اٹھایا۔

"نہیں' نہیں یہ قربانی نہیں' میں اسے فرض سمجھتی ہوں اپنا' جب ہم اپنی ضروریات کے لیے اپنے بڑوں کے محتاج تھے تو اس گھر اور گھر کے بڑوں نے ہمیں محبت' شفقت' توجہ اور تحفظ دیا۔ ہماری ضروریات اور خواہشات پوری کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی' ہم چھوٹے سے بڑے ہو گئے' اب اس گھر کو اور لوگوں کو ہماری ضرورت پڑی تو لبیک کہنا۔ آگے بڑھنا ہمارا فرض ہے۔ کوئی قربانی یا احسان تھوڑی۔" ماہم سیب کے ٹکڑے کرنے لگی۔

"سب کچھ ٹھیک کہا تم نے' اور شاید ٹھیک کیا مگر کبھی تو سوچتی ہو گی' مجھے یاد ہے جب ہم سب اپنی اپنی اسٹڈیز اور فیوچر کے بارے میں پلان کرتے تھے تو تم ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ اپلائیڈ فزکس میں ماسٹرز کرنا تمہارا خواب ہے اور پھر پڑھانا تمہارا شوق۔" ذیشان بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

"تمہارا خواب پورا نہیں ہوا نا۔" تھوڑی دیر بعد وہ دھیرے سے بولا۔

"ہوں۔" ماہم مسکرائی۔ "پتا ہے کیا' کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمارے خواب ہم خود پورے نہیں کر پاتے مگر ہمارا کوئی پیارا' کوئی عزیز اپنے خوابوں کی تعبیر پا لیتا ہے تو دل کو ویسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسی اپنے لیے ہوتی' اپنی کامیابی کے لیے ہوتی' تم ڈاکٹر بنے' باہر گئے پڑھائی کے لیے' سنیعہ ڈاکٹر بن رہی ہے' فواد بھائی پڑھا رہے ہیں' ایم فل کی تیاری بھی کر رہے ہیں' عفان اور عائشہ کے آثار بھی اچھے نظر آتے ہیں' اتنے سارے خوابوں کو اپنے تعبیر ملی ہے' ایک خواب رہ گیا تو کیا ہوا۔" ماہم نے جوس کا گلاس اس کے آگے رکھا۔

"اتنی اچھی باتیں کہاں سے سیکھیں؟"

"جن کے دل اچھے ہوتے ہیں' ان کی باتیں بھی اچھی ہوتی ہیں' پہیلی بوجھو۔"

"دادو کو کوٹ کیا ہے تم نے' ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک پہچانا' کیا انعام لو گے؟"

"سوچ کر بتاؤں گا' آخر اتنی بڑی اور اہم شخصیت کی آفر ہے' کچھ خاص ہی مانگنا چاہیے۔" ذیشان نے اس کے شرارتی سوال کا جواب بھی شرارت سے دیا۔

"اٹھ گئے بیٹا!" بلقیس چچی کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

"جی چھوٹی امی' السلام علیکم!" وہ جوس ختم کر کے کھڑا ہو گیا۔

"جیتے رہو۔" وہ نہال ہو گئیں۔ صبح اٹھنے کے بعد سب کو سلام کرنے کی بچپن کی عادت اس نے ترک نہیں کی تھی۔

"ناشتہ کر لیا تم نے؟"

"جی میں نے جوس پی لیا ہے۔"

"بس جوس؟" انہوں نے حیرت کا اظہار کیا "بیٹے! ناشتہ تو ٹھیک سے کرتے۔ باہر سے کچھ منگوانا تھا تو جمال دین (ملازم) سے منگوا لیتے یا گھر کا بنا ہوا کچھ چاہیے تھا تو ماہم سے بنوا لیتے۔" وہ فکرمندی سے بول رہی تھیں۔

"ماہم نے تو آفر کی تھی' میں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ اب لنچ ہم ڈٹ کے کریں گے۔"

"اچھا اچھا!" انہوں نے جیسے بات سمجھ کر گردن ہلائی۔

"اچھا لیڈی' تھینکس فار جوس' مجھے اجازت اب لنچ پہ ملاقات ہو گی۔" ذیشان نے ماہم کے آگے گردن خم کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل گیا۔

"کیا پیارا لڑکا ہے' کاش ماہم کا نصیب اس کے ساتھ کھل جائے۔" بلقیس چچی نے اسے حسرت سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

ماہم دوبارہ فریزر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی' اور گوشت کے مختلف پیکٹس نکال کر رکھ رہی تھی۔



ذیشان کتنے عرصے بعد اس کمرے میں آیا تھا۔ داہنی جانب بیڈ کی پوزیشن وہی تھی جیسی دادو کی زندگی میں تھی بلکہ بیڈ ہی کیا' کمرے کی ہر شے وہی تھی اور اسی جگہ پر تھی' ان کی الماری' کتابوں کا ریک' آرام کرسی' فرش پہ بچھا غالیچہ' میز پہ رکھا گلدان' حتیٰ کہ اس کے کمائی پھول' ہر شے صاف ستھری' اس کمرے سے اسے دادو کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گیا۔

حمیدہ بانو اندر آئی تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی' وہ جب سے آیا تھا' اس سے بات چیت ہوئی تھی مگر دادو کے کمرے میں وہ پہلی بار آیا تھا' جو اب حمیدہ بانو کے تصرف میں تھا۔

"مجھے یہاں آ کر دادو کی قربت کا احساس ہوتا ہے۔ اس لیے یہیں بیٹھ گیا۔" ذیشان معذرت خواہ لہجے میں بول کر اٹھنے لگا۔

"مجھ سے زیادہ اس کمرے پہ آپ کا حق ہے۔" حمیدہ بانو کرسی پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے۔

"دادو آپ کی باتیں بہت کرتے تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ آپ کی ہی باتیں کرتے تھے' آپ کی پسند ناپسند' شوق' مزاج عادات' آپ کی اتنی باتیں کرتے تھے کہ مجھے بھی عادت سی پڑ گئی تھی روزانہ سننے کی۔"

"پھر تو' تم مجھ سے بہت اچھی طرح واقف ہو گی۔" ذیشان بے ساختہ ہی بولا تھا۔

"شاید۔" وہ مبہم سا مسکرائی۔ "ویسے فواد سر بھی آپ کا کافی تذکرہ کرتے تھے۔"

"مثلاً؟" ذیشان نے بغور اسے دیکھا۔

"آپ کی دوستی' قربت' لگاؤ' بس یہی سب۔"

"اور کچھ نہیں بتایا اس نے میرے بارے میں؟"

"بتایا تھا' دادو کی خواہش اور آپ کی مرضی' دونوں کے بارے میں بتایا تھا۔" حمیدہ بانو نے صاف گوئی کا بلکہ کسی قدر جرات کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کا کانفیڈنس اچھا لگا مجھے۔" ذیشان دھیرے سے مسکرایا۔

"مجھے بلاوجہ کا جھجکنا یا اوٹ پٹانگ قسم کا شرمانا نہیں آتا' اچھی بات ہے یا بری بات مگر میں ایسی ہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' انسان جیسا ہو' اسے ویسے ہی نظر آنا چاہیے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔" ذیشان نے حوصلہ افزائی کے انداز میں کہا۔

"بعض لوگ اسے بے باکی سمجھتے ہیں۔" حمیدہ بانو نے گود میں رکھے اپنے ہاتھوں پہ نظریں جمائیں۔

"ہر ایک کا اپنا اپنا پوائنٹ آف ویو ہوتا ہے' دوسروں کی باتوں کو زیادہ دل پر نہیں لینا چاہیے' اینی وے' تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"بہت اچھی۔" حمیدہ بانو مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئی' پھر کچھ دیر بعد کہنے لگی۔

"میرا بہت دل چاہتا ہے کسی سے دادو کی باتیں کروں میں۔ میں بہت گلٹی فیل کرتی ہوں' میرا رویہ بہت خراب تھا ان کے ساتھ۔" حمیدہ بانو کی آواز بھیگنے لگی تھی۔

"تم اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔" ذیشان نے بہت نرمی سے اسے دیکھا تھا۔



فواد کی مصروفیت اچانک اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ حقیقتاً "اسے سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی تھی'

اس نے ایم فل میں ایڈمیشن لے لیا تھا' پڑھانے اور پھر پڑھنے میں ہی روز و شب گزر رہے تھے' مگر اپنی ساری مصروفیات میں ایک پل کو بھی حمیدہ بانو اس کے دل و دماغ سے محو نہ ہوئی تھی۔ اس روز ماں سے حمیدہ بانو کے متعلق بات کرنے کے بعد وہ اپنے سخت لب و لہجے کا احساس کر کے پشیمان ضرور ہوا تھا مگر امی کی رائے جو وہ حمیدہ بانو کے لیے رکھتی تھیں' اس سے متفق نہیں تھا۔ امی کی رائے اور تبصروں کو وہ سسرالی چپقلش اور زنانہ فطرت کا حصہ سمجھ کر نظر انداز کر رہا تھا' مگر اب اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ماں کے ساتھ سنجیدہ اور فیصلہ کن بات کرے گا۔

"بانو! جلدی سے میری زندگی میں آجاؤ۔" وہ آنکھیں بند کر کے مسکرایا۔

وہ مصروف تھا تو ذیشان کی مصروفیت بھی کچھ کم نہ تھی' اس کے دوست احباب کا وسیع حلقہ تھا ابھی تک اس کی ملاقاتیں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ رشتہ داروں سے ملنا جلنا الگ تھا۔ فواد سے بات روزانہ ہوتی تھی مگر مختصر' سرسری سی۔

آج اتفاق سے فواد ذرا جلدی گھر آگیا تھا' سیڑھیاں چڑھتے ہوئے حمیدہ بانو سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"آپ اس وقت؟" وہ ٹھٹک گئی۔

"ہاں یار' آج جلدی آگیا' سر میں بہت درد ہو رہا ہے' پلیز ایک کپ چائے تو لے آنا تم۔" فواد تھکے تھکے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

"اچھا!" حمیدہ بانو نے ایک نظر اس پر ڈالی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

لباس تبدیل کر کے وہ آنکھیں موندے لیٹا تھا جب ماہم چائے لے کر اندر آئی۔

"بھائی! چائے۔" اس نے فواد کو آواز دی۔

"حمیدہ...! کہاں ہے؟" فواد نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"نیچے ہی ہے سب کے ساتھ لاؤنج میں' مجھے کہا تھا کہ آپ کے سر میں درد ہے تو چائے بنا دوں۔ کیا زیادہ درد ہے' ٹیبلٹ دوں؟" ماہم نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"نہیں' ٹیبلٹ کی کوئی ضرورت نہیں ہے' تم ذرا حمیدہ کو بھیج دینا۔" فواد نے چائے کا کپ اٹھایا۔

"اچھا!"

اسے چائے پیتے ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی جب حمیدہ بانو آئی۔

"آپ نے بلایا تھا؟"

"ہاں' بیٹھو۔"

"جی!" وہ کرسی پر ٹک گئی۔

"اتنا دور دور کیوں رہنے لگی ہو بانو؟"

"کیا مطلب؟" حمیدہ بانو نے بھنویں اچکائیں۔

"چائے لے کر تم کیوں نہیں آئیں؟"

"یونہی' نیچے سب کے ساتھ لاؤنج میں تھی' پھر یہاں تو میری ایک ایک بات کو نوٹ کیا جاتا ہے۔"

"ناراض ہو؟" اس نے تلخ لہجے پہ فواد دھیرے سے مسکرایا۔

"مجھے بھی احساس ہے اپنی مصروفیت کا' دن یونہی گزر جاتا ہے' تم سے بات تک نہیں ہو پاتی' دیکھو یہ جو اتنی محنت کر رہا ہوں تو تمہارے اور اپنے اچھے فیوچر کے لیے کر رہا ہوں' کچھ عرصے کی بات ہے۔ بس' پھر میرا سارا وقت تمہارے لیے ہو گا۔"

"میں آپ سے ناراض نہیں ہوں' نہ ہی کسی بات کی شکایت ہے' آپ بلاوجہ پریشان مت ہوں۔" حمیدہ بانو نے اپنا سر جھٹکا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر ہے میرے لیے۔"

"میں اب جاؤں۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

"اتنی بدلی بدلی کیوں لگ رہی ہو۔"

"آپ کا وہم ہے' میں تو جیسی تھی ویسی ہی ہوں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بے رخی سے گویا ہوئی۔

"خدا کرے کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔" اس کی آنکھوں اور رویے سے جھلکتی اجنبیت محسوس کر کے وہ دھیرے سے بولا تھا۔

وہ چلی گئی مگر اس رات فواد کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔

اور نیند تو ماہم کی آنکھوں سے بھی غائب تھی' دل وہ الو کھا لاڈلا جو کھیلن کو چاند مانگے اور عقل اسے ہوش مندی کے اسباق پڑھانے میں مصروف۔

"کیا بور کہانی ہے ماہم بیگ؟" رات کی تنہائی میں وہ اپنے آپ سے محو گفتگو تھی۔

"ایک عام سی لڑکی' ایک بہت خاص لڑکا' محبت یک طرفہ۔ بیل منڈھے چڑھے تو کیسے زمین آسمان کا ملاپ ناممکن ہے مگر معجزوں پہ یقین رکھنے والا دل' محبت کے خوش رنگ پھول اپنے ارد گرد مہکائے' انتظار کی دنیا بسائے بیٹھا ہے' آنکھیں ہیں کہ خواب دیکھنے سے باز ہی نہیں آتیں جیسے کہ یہ خواب سچ مچ پورے ہو ہی جائیں گے۔

اور یہ خواب پورے نہ بھی ہوں تو کیا ہے' بہت سے لوگ محبت کرتے ہیں' کوئی کامیاب ہو جاتا ہے' کوئی ناکام' پھر بھی ناکامی کے خوف سے کوئی آنکھ خواب دیکھنا نہیں چھوڑتی' کوئی دل محبت کرنے سے باز نہیں آتا جو یوں ہے تو یوں ہی سہی' دیکھتے ہیں ماہم بیگ' تمہارے حصے میں کیا آتا ہے' منزل یا محض سفر کی صعوبت اور تھکن؟

متضاد الجھے الجھے خیالات میں گھری وہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

ذیشان کی کامیابی اور وطن واپسی کی خوشی میں جو پارٹی رکھی گئی تھی' وہ ہوتے ہوتے ایک ٹھیک ٹھاک قسم کی تقریب میں بدل گئی۔ مدعوئین کی فہرست طویل سے طویل ہوتی چلی گئی' تقریب کا اہتمام قریبی لان میں کیا گیا تھا۔ نک سک سے تیار' آراستہ پیراستہ دمکتے چہروں کے ساتھ سب ہی افراد خانہ اچھے لگ رہے تھے۔ اچھے میزبانوں کی طرح تقریباً" سب ہی لوگ مہمانوں کی آمد سے پہلے لان میں آ گئے تھے۔

رائل بلیو ڈنر سوٹ میں ذیشان بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ قابلیت اور کامیابی نے بھی اس کی شخصیت میں ایک انوکھی جاذبیت پیدا کر دی تھی۔ وہ آج کی تقریب کا مہمان خصوصی تھا۔ سب کی نظریں اس پر تھیں مگر اس کی نظریں کسی اور کو ڈھونڈ رہی تھیں اور کچھ دیر بعد وہ نظر آ ہی گئی۔

اس کے لباس میں سفید اور گلابی رنگ تھے اور یہی رنگ اس کے چہرے سے بھی جھلک رہے تھے' اس کی آرائش اور زیبائش دیکھنے کے قابل تھی' سیدھے سلکی بال سمیٹ کر دائیں کاندھے پہ ڈالے ہوئے تھے۔

"بات سن یار!" اس نے قریب سے گزرے فواد کو روکا۔

وہ ٹھہر گیا۔

"پرنسز بانو واقعی اتنی حسین ہے یا آج مجھے ہی لگ رہی ہے۔" اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں وہ فواد سے گویا ہوا۔

"دونوں ہی باتیں ہیں شاید۔" فواد کو اس کی بات سے نہ جانے کیوں دھچکا سا لگا تھا۔

"سب تیرا کمال ہے یار' تو نے اس ہیرے کی تراش خراش کی ہے' یہ تو کوہ نور بن گئی ہے۔ ہے نا۔"

"ہاں!" فواد نے ایک بے بس سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

ذیشان اس کا جگری دوست' پیارا کزن اور بھائی تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی ایک موڑ ایسا بھی آئے گا کہ وہ اور ذیشان ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوں گے اور وہ موڑ اب بہت قریب ہی تھا۔

"مجھے چاہیے تھا کہ ذیشان کے پاکستان آنے سے پہلے ہی اسے ساری بات بتا دیتا۔ سیدھی سی بات ہے حمیدہ بانو اس رشتے پہ راضی نہیں ہے' وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے' یہ بات ذیشان کے علم میں آتی تو وہ خود ہی پیچھے ہٹ جاتا اور ویسے بھی اس کی کون سی جذباتی وابستگی تھی بانو سے' وہ تو فقط دادو کی محبت میں یہ رشتہ جوڑنے پر راضی ہوا تھا' ورنہ اس جیسے لڑکے کے لیے رشتوں کی کیا کمی' اور سب سے اہم بات یہ کہ مردہ افراد

کی خواہش پوری کرنے سے زیادہ زندہ افراد کی خواہشات کا پاس رکھنا ضروری ہے' فواد نے پشیمانی محسوس کرتے اپنے ضمیر کو تاویل پیش کی۔

"دادو وازدی گریٹ' انہوں نے بالکل ٹھیک لڑکی کا انتخاب کیا میرے لیے' پھر ہم دونوں میں ایک چیز ہے جو کامن ہے' پتا ہے کیا؟"

"کیا؟" فواد نے غائب دماغی کے عالم میں پوچھا۔

"دادو کی محبت' ہم دونوں ہی ان سے بے پناہ لگاؤ اور محبت رکھتے ہیں اس کی ساری باتیں دادو سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہوتی ہیں۔" ذیشان بہت پر جوش ہو کر اسے بتا رہا تھا۔

"میں پاپا سے بات کرنے والا ہوں حمیدہ بانو کے متعلق۔" ذیشان اتنی اچانک بولا کہ فواد چند لمحے تو فقط اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔

"تم پہلے ایک بار حمیدہ سے بات کر لیتے۔" تھوک نگلتے ہوئے ذیشان سے مخاطب ہوا۔

"کر چکا ہوں یار!"

"پھر؟" سرسراتی ہوئی آواز فواد کے منہ سے نکلی۔

"پھر کیا' اسے تو کوئی اعتراض نہیں ہے' اور پھر ویسے بھی بقول اس کے' تو نے اسے پہلے ہی یہ سب بتا رکھا تھا۔" فواد نے حیرانی سے دیکھا۔

"فواد میرے دوست! تو نے میرے لیے جو کچھ کیا وہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔" ذیشان نے اس کے شانے تھام کر جذباتی انداز میں کہا۔ "وہ صرف دادو کی خواہش نہیں میری مرضی بن کر میری لائف میں آ رہی ہے۔"

ذیشان ہمیشہ کا جذباتی انسان تھا مگر اس وقت تو وہ جیسے شہنشاہ جذبات بنا ہوا تھا۔

اس کی باتیں سن کر فواد کے سر میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر آواز ہی نہیں نکلی۔

"ایک منٹ ابھی آیا۔" ذیشان نے کسی کی پکار کا جواب دیا۔

اور آگے بڑھ گیا' فواد وہیں کرسی پر جیسے ڈھے سا گیا۔

"یہ ذیشان ابھی ابھی کیا بول گیا ہے۔" اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔

"حمیدہ راضی ہے؟ مگر کیوں؟ کیسے؟"

"وہ تو مجھ سے محبت کرتی ہے فواد سرے' پھر اس نے خود کہا تھا کہ وہ ذیشان جیسے ایکسٹرا آرڈینری فرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔

حمیدہ بانو تو اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے' جس سے وہ محبت کرتی ہے اور اس کی محبت میں ہوں' صرف میں۔"

پوری تقریب کے دوران فواد الجھا ہوا' پریشان ہی رہا۔

رات سب لوگ بہت دیر سے سوئے' فواد کو اس رات بالکل نیند نہیں آئی' وہ حمیدہ بانو سے بات کرنا چاہ رہا تھا' مگر فی الحال اسے اس کا موقع نہیں ملا۔

☼ ☼ ☼

ذیشان کو پاپا نے اپنے کمرے میں بلایا تھا' وہ اس وقت ان کے کمرے میں موجود تھا' وہ ذیشان کی شادی کی بات کر رہے تھے۔

"ہمایوں صاحب کی بیٹی کیسی لگی تمہیں' حال ہی میں کینیڈا سے پڑھ کر لوٹی ہے' اچھی فیملی ہے' تعلیم یافتہ اور کسی حد تک ماڈرن بھی' اگر تمہیں ہائی کلاس میں موو کرنے کے لیے لائف پارٹنر چاہیے تو منال اچھی لڑکی ہے۔" وہ اپنے بیٹے کو ٹٹول رہے تھے' اس کے خیالات جاننا چاہتے تھے۔

انہیں یوں ہی خیال آیا تھا کہ کیا پتا ذیشان کی پسند اعلا تعلیم یافتہ ہائی فائی قسم کی لڑکی ہو' اس لیے انہوں نے پہلے منال کا پروپوزل اس کے سامنے رکھا۔

"پاپا! مجھے ایسی لڑکی چاہیے جو آپ کو' مجھے اور ہماری فیملی کو ٹائم دے سکے' کوئی سادہ طبیعت' گھریلو سی لڑکی' خیال رکھنے والی' ہم سے پیار کرنے والی۔" وہ بول رہا تھا اور باپ کا دل خوشی سے جھوم گیا۔

باہر کھڑی ماہم کا ہاتھ دروازے پہ دستک دیتے ٹھہر گیا' وہ تایا کو میڈیسن دینے آئی تھی' ذیشان کی بات سن کر رک گئی تھی تو غیر اخلاقی حرکت' مگر اس کے دل اور زندگی کا معاملہ تھا' وہ سننا چاہتی تھی' اس لڑکی کا نام جسے ذیشان یا پاپا سلیکٹ کریں گے' اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

"سچ بتاؤں ہمیں بھی یہی چاہتا تھا کہ گھر کی بچی ہی میرے بیٹے کا گھر بسائے' کوئی سلجھی ہوئی' سمجھ دار سی بچی' ان کی نظروں کے سامنے ماہم کی شبیہہ لہرا گئی' پل بھر میں انہیں جیسے ڈھیروں ڈھیر خوشیاں مل گئیں۔ نہیں اپنے لائق خالق اور فرماں بردار بیٹے پر بہت فخر ہو رہا تھا۔

"پاپا' دادو نے حمیدہ بانو کو میرے لیے پسند کیا تھا اور میری بھی یہی خواہش ہے۔" اپنی دھن میں مگن ذیشان ان سے مخاطب ہوا۔

باہر کھڑی ماہم کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا' اسے لگا' وہ کچھ دیر اور کھڑی رہی تو شاید گر پڑے' اس کی ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر رہی تھیں' خود کو گھسیٹتی ہوئی وہ چپ چاپ پلٹ گئی۔

ادھر وجاہت بیگ حیرانی سے بیٹے کی شکل دیکھ رہے تھے۔

"اما کی پسند؟ انہوں نے کب کہا' کس سے کہا؟" وہ اک دم پریشان بھی ہو گئے تھے۔

"انہوں نے مجھ سے کہا تھا پاپا!" ذیشان دھیرے دھیرے انہیں ساری بات بتانے لگا۔ بہت دیر بعد جب وہ سب کچھ بتا کر خاموش ہوا تو وجاہت بیگ بھی چپ ہو گئے' ان کے پاس کہنے کے لیے اب کچھ تھا ہی نہیں۔

"ٹھیک ہے' حمیدہ بانو بھی ہماری ہی بچی ہے' ماہم نہ سہی حمیدہ سہی۔" وہ بے خیالی میں بول گئے۔

"ماہم؟" اب چونکنے کی باری ذیشان کی تھی۔

"میں نے ماہم کو سوچا تھا تمہارے لیے' مگر خیر کوئی بات نہیں' جس کا جو نصیب' اللہ تم سب کو ڈھیروں خوشیاں دکھائے' آمین۔" ان کے لہجے میں تھوڑی سی مایوسی تھی۔

ذیشان کچھ احساس جرم کر رہا تھا' پاپا کے لیے یا ماہم کے لیے' وہ سمجھ نہیں سکا۔

"ماہم بہت اچھی لڑکی ہے' خدا کرے اسے بہت ہی اچھا ہم سفر اور بہت ساری خوشیاں ملیں۔" اس کے دل نے بے ساختہ چپکے سے دعا کی۔

اگلے روز ناشتے کے بعد وجاہت بیگ نے اپنے بھائی' بھاوج سے بات کی' انہوں نے دادو کی مرضی کا ذکر کرتے ہوئے مختصر لفظوں میں ذیشان اور حمیدہ بانو کے رشتے کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"اس گھر میں حمیدہ کے بڑے ہم اور آپ ہیں' ننھیال میں ایک ماموں ہیں' میں انہیں فون کر کے بلا لیتا ہوں' ان کے سامنے باقاعدہ رسم کر دیں گے' ٹھیک ہے؟" انہوں نے فوراً" ہی پروگرام بنالیا۔

بلقیس بیگم نے ناگواری سے پہلو بدلا' ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں جھٹ پٹ سارے فیصلے ہو جائیں گے۔

چلتر' مکار لڑکی' میں پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ کوئی نہ کوئی گل کھلائے گی' وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں' پھر انہوں نے اسی وقت ایک فیصلہ کیا' کوئی اور حالات ہوتے تو وہ ایسا سوچتیں بھی نہیں' مگر اس وقت ان کی عزیز از جان بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا اور پھر فواد بھی حمیدہ بانو کے معاملے کی وجہ سے ان سے موڈ خراب کیے بیٹھا تھا' وہ جو سوچ رہی تھیں' اگر وہ ہو جاتا تو کم از کم ماہم کا مستقبل محفوظ ہو جاتا اور بیٹا بھی ہاتھوں سے نہ نکلتا۔ انہوں نے ٹھان لی کہ وہ آج ہی فواد سے بات کریں گی۔

وہ تھوڑی دیر بعد وہاں سے اٹھ گئیں۔

انہوں نے فواد کو اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔

"جی!" وہ تھوڑی دیر میں ہی آگیا' ستا ہوا چہرہ' تھکا تھکا سا وجود انہیں اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر ایک لمحے کو افسوس بھی ہوا۔

"کوئی کام تھا امی؟" وہ جو سوچ رہی تھیں کہ بات کہاں سے شروع کریں' فواد نے ان سے سوال کر ڈالا۔

"ہاں۔۔۔ میں کہہ رہی تھی کہ اگر تمہاری مرضی حمیدہ بانو کے لیے ہے تو یوں ہی سہی' میں تمہارے ابو سے بات کرتی ہوں' ویسے تو انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا' تم ایک بار اور حمیدہ کی مرضی معلوم کر لو' کہیں ایسا نہ ہو ہم رشتے کی بات کریں اور وہ انکار کر دے۔" بغیر کسی تمہید کے انہوں نے نپے تلے لفظوں میں بات کی۔

حمیدہ سے بات تو فواد کو کرنی ہی تھی' مگر امی کا یوں اچانک مہربان ہونا' اس کی سمجھ میں نہیں آیا' کہاں تو وہ اس کا نام سننے کو تیار نہ تھیں اور کہاں یوں اچانک جھٹ پٹ رشتہ کرنے پہ راضی ہو گئیں۔

"کوئی خاص بات ہے کیا؟ میرا مطلب ہے' آپ یکایک کیسے راضی ہو گئیں؟"

"فواد! تم میرے بیٹے ہو' جیسے مجھے تم پیارے ہو' ایسے ہی ماہم بھی پیاری ہے' دراصل ایک' دو روز پہلے وجاہت نے تمہارے ابو سے باتیں کرتے ہوئے اشاروں' کنائیوں میں ماہم کے لیے کہا تھا کہ وہ ذیشان کی مرضی معلوم کریں گے' اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوا تو وہ ماہم کو ہی اپنی بہو بنائیں گے' انہوں نے یہ بھی کہا' ابھی یہ بات کسی سے نہ کہیں' کیونکہ وہ ذیشان کی مرضی جانے بغیر اس معاملے کو نہیں اٹھانا چاہتے تھے' آج صبح انہوں نے بتایا کہ ذیشان نے حمیدہ بانو کا نام لیا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکیں۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم حمیدہ سے بات کر لو' ذیشان کے لیے وہ خود انکار کرے گی تو مناسب ہو گا' تم نے ہی کہا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو' تم اس سے بات کر لو' تو تمہارا رشتہ اس سے طے کر دیں گے' ذیشان کے لیے وجاہت بھائی ماہم کو مانگ لیں گے۔" انہوں نے فوراً" اپنی پلاننگ اس کے سامنے رکھی۔

فواد کچھ دیر سوچتا رہا' پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے ہامی بھرلی۔

"ٹھیک ہے' میں بانو سے بات کرتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

ذیشان اپنے کمرے میں تھا' رات وہ بہت دیر سے سویا تھا' پارٹی دیر میں ختم ہوئی' پھر پاپا سے کافی دیر تک باتیں کرتا رہا' پھر سونے لیٹا تو حمیدہ بانو کو کال کر لی' اب وہ کبھی کبھی رات میں سونے سے پہلے اسے کال کر لیتا تھا۔

"ایک گڈ نیوز ہے تمہارے لیے' پاپا جھٹ پٹ مان گئے' بغیر کسی اعتراض کے۔" وہ چہکا۔

"رئیلی' مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ اتنی آسانی سے مان گئے۔" حمیدہ کی آواز حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"کیوں؟"

"یوں ہی' کہاں آپ ہائی فائی قسم کے' کہاں میں ایک عام سی لڑکی' ڈر لگ رہا تھا کہ پتا نہیں کیا ہو گا۔"

"اسٹوپڈ قسم کی باتیں مت کرو' میں بھی ایک عام سا ہی انسان ہوں' مجھے سادہ سی اور اچھی سی نیچر اپیل کرتی ہے' جیسی تمہاری ہے' ویسے تم خوش تو ہو نا۔"

"بہت' بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے' مجھے تو رشک آرہا ہے خود پر۔" حمیدہ کی آواز میں کھنک تھی۔

"ایک بات پوچھوں؟" چند لمحے چپ رہنے کے بعد وہ بولی۔

"بولو۔۔۔"

"آپ نے اپنی کیریر پلاننگ کہاں کے لیے کی ہے' میرا مطلب ہے کہ یہیں پاکستان میں ہی رہیں گے یا کہیں اور۔" حمیدہ نے جھجکتے ہوئے دریافت کیا۔

"ابھی میں صرف سوچ ہی رہا ہوں' فائنل ڈیسیجن کوئی نہیں لیا' مگر کیوں' تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" وہ محتاط ہوا۔

"یوں ہی' پورے ملک کے اور خصوصاً" کراچی کے حالات اتنے خراب ہیں کہ یہاں رہ کر زندگی گزارنا' ایک ڈراؤنا خواب لگتا ہے۔" حمیدہ بانو اپنی ازلی صاف گوئی سے کہہ رہی تھی۔

"اپنے گھر میں خدانخواستہ آگ لگ جائے تو اسے بجھانے کی کوشش کرتے ہیں' گھر کو جلتا چھوڑ کر بھاگ تھوڑی جاتے ہیں' یہ بزدلی بھی ہے' خود غرضی اور بے حسی بھی' تو فی الحال تو میرا ارادہ یہیں سیٹل ہونے کا

ہے، آگے اللہ مالک ہے، کبھی نہ کبھی تو یہاں آگ اور خون کی ہولی ختم ہو ہی جائے گی، پھول بھی کھل جائیں گے، امن بھی ہو جائے گا۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔" "میں تو بس یوں ہی پوچھ رہی تھی۔" حمیدہ بانو شاید اس کے تقریری لفظوں سے اکتا کر بولی تھی۔

"تم بتاؤ، ابھی تک سوئی کیوں نہیں تھیں؟"

"انتظار کر رہی تھی آپ کی کال کا۔" وہ ہنسی۔

"تمہاری ہنسی بہت اچھی ہے۔ جیسے۔ جیسے۔" وہ کوئی تشبیہ ڈھونڈ رہا تھا۔

"ہاں، ہاں جیسے؟" حمیدہ بانو کو مزا آ رہا تھا۔

"جیسے کوئی خوبصورت سی دھن، جو کانوں کو بھلی لگے۔"

"میں سمجھی آپ کہیں گے، جیسے کوئی جھرنا یا جلترنگ وغیرہ وغیرہ۔"

"بھئی ایسی شاعرانہ تشبیہات تو مجھے نہیں آتیں۔" ذیشان نے اعتراف کیا۔

"اوہ پھر؟ اس کے بغیر بھلا کیسے گزارہ ہو گا؟" حمیدہ بانو شرارت پر آمادہ تھی۔

"دیکھو، کرتے ہیں کچھ نہ کچھ، ہمارے ایک دوست ہیں نا فواد بیگ، ان سے کہتے ہیں، تھوڑی سی شاعری وغیرہ ہمیں بھی پڑھا دیں۔" ذیشان نے اس کے مذاق کا جواب مذاق سے ہی دیا۔

فواد کا نام سن کر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

"کیا ہوا، چپ کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ بہت تھک گئی ہوں، نیند آ رہی ہے اب۔"

"اوکے، تم آرام سے سوؤ اور اچھے اچھے خواب دیکھنا۔" ذیشان نے تاکید کرتے ہوئے خدا حافظ کہا۔

"ٹھیک ہے، اللہ حافظ"

☼ ☼ ☼

گزشتہ رات کی پارٹی اگرچہ گھر پہ نہیں تھی، پھر بھی گھر میں ٹھیک ٹھاک پھیلاوا ہو گیا تھا۔ ماہم، ماسی سے اپنی نگرانی میں صفائی کروا رہی تھی، فواد اس کے سر پر جا پہنچا۔

"ماہم! کچھ معلوم ہے حمیدہ کہاں ہے؟ اپنے کمرے میں تو نہیں ہے، گھر میں کہیں نظر نہیں آ رہی۔"

"پتا نہیں بھائی! مجھے ابھی تک نظر نہیں آئی وہ۔" ماہم نے لاعلمی کا اظہار کیا، مگر فواد اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں، کیوں، کیا ہوا؟" ماہم نے لاپروائی دکھانے کی کوشش کی۔

"ایسا لگ رہا ہے، پوری رات سوئی نہیں، آنکھیں دیکھو، کتنی ریڈ ہو رہی ہیں۔"

"ہاں، نیند پوری نہیں ہوئی، بہت دیر سے سوئی، پھر جلدی اٹھ گئی تو اس لیے۔"

"تو تم ریسٹ کرو، اور بھی لوگ ہیں گھر میں، وہ دیکھ لیں گے کام۔"

"ٹھیک ہے، میں ریسٹ کر لوں گی، آپ پریشان نہ ہوں۔" ماہم نے نرمی سے بولتے ہوئے رخ موڑ لیا، آنکھوں میں پانی جمع ہونے کو تھا اس نے بے دردی سے آنکھیں مسلیں، پوری رات آنکھوں میں نیند نہیں، آنسو تھے، خود کو سمجھایا تو بہت اس نے مگر پھر بھی نئی نئی چوٹ تھی، تکلیف بہت تھی، رونا کیسے نہ آتا۔

"اے خدا، مجھے صبر دے دے۔" وہ دعا کر رہی تھی۔

"رشیدہ! تم ذرا یہ کونا اچھی طرح صاف کرو، میں ابھی آتی ہوں۔" ماہم نے ذیشان کو آتے ہوئے دیکھا تو وہاں سے چلی گئی، وہ ذیشان کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد حمیدہ مل ہی گئی، سب سے اوپر چھت پر وہ ایک کونے میں کھڑی نہ جانے باہر کیا جھانک رہی تھی۔

"بانو، تم یہاں ہو، میں کب سے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔" فواد کی آواز پر وہ کرنٹ کھا کر پیچھے مڑی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس کے یوں رد عمل پر فواد حیران ہوا تھا۔

"اف، آپ نے تو اک دم ڈرا ہی دیا۔"

"ڈرا تو تم نے دیا ہے بانو!" دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"کیا مطلب؟" حمیدہ بانو نے اپنے مخصوص انداز میں بھنویں چڑھائیں۔

"مطلب! مطلب تو بہت ساری باتوں کا میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"مثلاً"! وہ جان بوجھ کے انجان بن رہی تھی۔

"مثلاً" تمہارے اور ذیشان کے رشتے کی بات ہو رہی ہے بڑوں کے درمیان اور ذیشان کا دعوا ہے کہ اس میں تمہاری مرضی بھی شامل ہے۔" فواد کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

"جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے دیں، آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

فواد کا پورا وجود شعلوں کی زد میں تھا۔ وہ بے حد تکلیف میں عالم میں اس سے مخاطب ہوا۔

"کیا اس میں تمہاری مرضی بھی شامل ہے؟"

"ہاں!" اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے جواب دیا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم میری تو سمجھ سے باہر ہے، کل تک تمہاری مرضی، تمہاری چاہت کچھ اور تھی، آج کچھ اور ہے۔" فواد کے لہجے کی بے بسی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

"آپ میری بات چھوڑیں، اپنی بات کریں، آپ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

فواد چند لمحے چپ چاپ کھڑا اس کی شکل دیکھتا رہا۔

"امی ایگری ہو گئی ہیں ہمارے رشتے کے لیے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"اچھا، مگر اب میں ایگری نہیں ہوں ویسے بھی وہ صرف اور صرف اپنی بیٹی کے لیے کڑوا گھونٹ نگلنے کو تیار ہوئی ہیں۔"

"بانو! کھل کر بات کرو، آخر معاملہ کیا ہے، تم ذیشان کے لیے ایگری نہیں تھیں، اس وقت تمہیں میں اچھا لگ رہا تھا، تمہاری پسند تمہاری محبت فواد بیگ کے لیے تھی، اور اب جب تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تو تم خود ایک دیوار بن کر درمیان میں کھڑی ہو گئی ہو۔ یہ کیا مذاق ہے۔" آخر میں آ کر فواد جھنجلا گیا تھا۔

"انسان کی پسند، ناپسند بدل بھی سکتی ہے، مجھے اب آپ میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے، برائے مہربانی میرا پیچھا چھوڑ دیں۔" حمیدہ بانو کی باتوں میں بے رخی ہی نہیں ترشی تلخی بھی تھی، فواد کو یوں لگا جیسے اس کے آس پاس کہیں کچھ نہیں۔ بس ایک خلا ہے۔ جس میں وہ بے سمت ادھر ادھر بھٹک رہا ہے۔

"بانو، تم۔ تم میری تخلیق ہو، میں نے تمہیں کیا سے کیا بنا دیا اور تم مجھے یوں انڈر اسٹیمیٹ کر رہی ہو۔" فواد بمشکل خود کو کمپوز کر سکا تھا۔

"تخلیق؟" حمیدہ نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"تخلیق کرنا خالق کا کام ہے، بندوں کا نہیں، آپ کو یہ خوش فہمی کیونکر ہو گئی کہ آپ یہ کام بھی کر سکتے ہیں، آپ نے صرف میرا ظاہر بدلنے کی کوشش کی تھی اور شاید اس میں کامیاب بھی ہو گئے مگر مجھے اندر سے کوئی نہیں بدل سکا، میرا دل، میرا نیچر، میرا مزاج، سب کچھ وہی ہے، جو تھا، پہلے جیسا۔ اس گھر میں آنے سے پہلے جیسا، آپ کی ماں کے لیے جو نفرت اور انتقام میرے دل میں تھا، اسے آپ نہیں نکال سکے نہ ہی نکال سکتے ہیں، انہوں نے جو کچھ میری ماں کے ساتھ کیا، وہ میں مرتے دم تک نہیں بھلاؤں گی۔ ان کو بھی ایسے ہی تڑپنا چاہیے جیسے انہوں نے میری ماں کو تڑپایا تھا۔"

حمیدہ بانو کسی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی اور فواد اسے یوں زہر اگلتا دیکھ کر ششدر تھا، اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنا زہر لے کر بیٹھی ہے۔

"میری ماں سے کیا قصور سرزد ہو گیا، جو تم اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی ہو۔" فواد کے دونوں ہاتھ اس کے پہلوؤں میں گر گئے، اسے لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے حمیدہ بانو نہیں بلکہ کوئی اجنبی لڑکی کھڑی ہے۔ بالکل انجان، جسے وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا، پہلی بار سن رہا تھا۔

"تمہاری ماں نے میری امی کے خلاف اس گھر میں محاذ بنایا ہوا تھا، ان کے خلاف وہ سب کے کان بھرتی

رہتی تھیں۔ ابو کے انتقال کے بعد انہیں گھر سے نکلوانے میں سب سے بڑا ہاتھ تو تمہاری ماں کا تھا' انہیں بے یارو مددگار' کسی غریب کی بیوہ کی طرح سڑک پر رُلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ کتنے سارے غموں کو اندر ہی اندر پال کر وہ ایسی بیمار پڑیں کہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں۔ وہ طبعی موت نہیں مریں تم' انہیں قتل کیا گیا ہے اور ان کی قاتل تمہاری ماں ہے۔ اگر تم....."

"اسٹاپ دس نان سینس۔" فواد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے' تمہاری اس فضول بکواس پہ میں آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا' حقیقت جاننا چاہتی ہو تو کسی اور سے بھی کچھ معلوم کر لو.... ضروری نہیں کہ تمہیں جو کچھ بتایا گیا ہو' وہ سب سچ ہو' مجھے یقین نہیں آرہا کہ مجھ جیسا شخص تم جیسی لڑکی کے ہاتھوں کھلونا بن گیا' شرم آرہی ہے اس وقت مجھے اپنے آپ پر۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

حمیدہ بانو نے اسے جاتے دیکھا اور سر جھٹک کر استہزائیہ انداز میں مسکرا دی۔

"اب پتا چل رہا ہو گا اس کی ماں کو' ذہنی اذیت کیا ہوتی ہے۔ بڑی آئی اولاد کے سنہرے مستقبل کے سپنے دیکھنے والی۔"

حمیدہ بانو اپنی زہریلی سوچوں میں مگن یہ فراموش کر گئی کہ وہ اس سارے معاملے میں اس لڑکی کو بھی کتنی تکلیف دے رہی ہے۔ جس نے اسے سگی بہن سے بھی بڑھ کر پیار' محبت اور شفقت دی۔ کسی چھوٹے بچے کی طرح اس کا خیال رکھا' مگر حمیدہ بانو کو اس بات کا نہ کوئی احساس تھا نہ کوئی پروا جو بغض اور کینہ وہ اپنے دل میں لے کر اس گھر میں آئی تھی' اس کے بعد دل میں کہیں کسی اچھے جذبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

فواد غم و غصے کی آگ میں جھلستا ہوا سیدھا اپنے کمرے میں گیا تھا' اس وقت اسے صرف اور صرف تنہائی درکار تھی۔ ایک گہری سانس لے کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور شروع سے لے کر اب تک کی ساری باتیں اور معاملات سوچنے لگا۔

"تو وہ میری ماں سے انتقام لینا چاہتی ہے' شاید اسی لیے مجھ سے محبت کا ناٹک کیا' تاکہ میں اس کے لیے اپنی امی کے مقابل آجاؤں ان سے جھگڑا کروں' وہ جانتی تھی کہ امی اسے پسند نہیں کرتیں' وہ لازمی مخالفت کریں گی اور میں اس کی حمایت' اس نے ٹھیک سوچا تھا۔ اتنے مہینے امی میری ٹینشن میں رہیں اور اب جب کہ ذیشان آگیا' حمیدہ ماہم کے معاملے میں امی کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔" فواد جیسے جیسے سوچ رہا تھا اس پر خیالات کے نئے نئے در وا ہو رہے تھے۔

"تمہیں کیا کہوں حمیدہ بانو! خود ہی حسد اور غصے کی آگ میں جلتی رہیں اور اس حد تک پہنچ گئیں کہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی جلا ڈالا' امی ٹھیک ہی کہتی تھیں تم بالکل اپنی ماں کا پرتو ہو' خود غرض' کینہ پرور اور انتقام پسند فطرت۔ جانے کیوں میں ہی نہیں پہچان سکا' ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے پل بھر کو اس کے لبوں کو چھوا پھر اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"اب امی سے کیا کہوں' انہیں کیا بتاؤں اور ذیشان؟" فواد سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا۔



حمیدہ بانو سبج سبج سیڑھیاں اتر کر سب سے نچلے پورشن میں آگئی' جہاں سب سے پہلے اس کا سامنا ماہم سے ہوا۔

"فواد بھائی ڈھونڈ رہے تھے تمہیں۔"

"ہاں۔ مل گئے تھے مجھے۔" حمیدہ نے جلدی سے اس سے جان چھڑائی۔

"اچھا!" ماہم نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کے خوب صورت چہرے پہ بہت انوکھی سی چمک تھی' جیسے کوئی بہت بڑی جیت' بہت شان دار فتح اس کے ہاتھ لگی ہو۔

ماہم کچھ سوچ رہی تھی۔ بارہا اسے فواد بھائی اور حمیدہ بانو کے درمیان کسی ان دیکھے تعلق انجانے

رشتے کا احساس ہوا تھا۔ فواد بھائی کے رویے میں کچھ خاص محسوس ہوا تھا اسے حمیدہ بانو کے لیے۔

"شاید وہ میرا او ہم ہو۔" ماہم نے بڑی حسرت سے حمیدہ بانو کو دیکھا۔

رات ذیشان کے منہ سے اس کا نام سنا تھا' اسے دھچکا لگا تھا مگر اپنے لیے' تکلیف ہوئی تھی مگر اپنا دل ٹوٹنے کی' حمیدہ بانو سے اسے کسی قسم کا حسد یا جلن نہیں ہوئی ہاں اس پر رشک ضرور آیا تھا۔

شام ہوتے ہوتے گھر کے ہر فرد کو خبر ہو چکی تھی کہ ذیشان اور حمیدہ بانو کا رشتہ طے ہو رہا ہے۔

بڑی تائی نے اپنی کومل کو ایک نظر دیکھا اور آہ بھر کر خاموش ہو گئیں بھلا کیا کہتیں اور کس سے۔

بلقیس چچی نے فواد سے پوچھا۔

"اس نے منع کر دیا ہے۔" فواد نے سیدھا اور صاف جواب ماں کو دیا۔

"تو تم یوں ہی اتاولے ہو رہے تھے اس کے پیچھے' جب اس کی مرضی نہیں تھی تو یا پھر تم سے بہتر مستقبل نظر آ رہا ہے اسے تو تمہیں منع کر دیا۔" انہوں نے اپنی بے بسی' غصے کی صورت میں اپنے بیٹے پر ہی نکالی۔

فواد کوئی جواب دیے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ کیا کہتا ابھی تک تو وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔

ذیشان دو تین بار اس سے پوچھ چکا تھا کہ آخر اس کے منہ پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ اس نے تھکن کا بہانہ کر کے اسے ٹالا تھا' مگر کب تک' حمیدہ بانو کا یہ جو نیا روپ اس کے سامنے آیا تھا' اس نے فواد کو حیران پریشان ہی نہیں بلکہ بے اعتبار بھی کر دیا تھا۔

"اب بھلا زندگی میں کبھی کسی پر بھی اعتبار آئے گا؟" اذیت ناک خیالات ــــ نے اسے اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

بابا نے سب بڑوں سے باہم مشاورت کر کے حمیدہ بانو کے ماموں کو فون کر کے بلوایا تھا' وہ سب لوگ رشتوں کی اہمیت اور نزاکت کو سمجھنے والے اور انہیں فوقیت دینے والے لوگ تھے' مگر حمیدہ بانو کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ حواس باختہ سی ہو گئی۔

"کیا ضرورت تھی انہیں فون کرنے کی' میرا جو بھی رشتہ ہے' وہ آپ لوگوں سے ہے اور کسی کو نہ میں جانتی ہوں نہ کسی سے میرا کوئی رشتہ ہے۔" وہ ذیشان سے احتجاج کر رہی تھی۔

"کیوں غصہ کر رہی ہو بے کار میں' وہ تمہارے سگے ماموں ممانی ہیں۔ تم مانو یا نہ مانو' ان کا تمہارا رشتہ حقیقت ہے۔ آنے دو ان بے چاروں کو' تمہیں ان سے کیا پرابلم ہے ویسے بھی ہم اپنے غموں میں کسی کو شریک کریں نہ کریں مگر خوشیوں میں سب کو شریک کرنا چاہیے۔"

ذیشان نے اس کے برہم ہونے پر ایک چھوٹا سا لیکچر جھاڑ دیا مگر وہ سخت بدمزا ہو رہی تھی۔

"اب کیا کہوں میں' آپ سب لوگ بھی بس۔" وہ ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر اگلے ہی روز اس کی پریشانی کی وجہ بھی سب کے سامنے آ گئی۔

آج ماموں کو آنا تھا۔ وہ تو بعد میں آئے مگر ان سے پہلے ان کے محلے کا ایک لڑکا آیا تھا۔

لمبا قد' صاف رنگ' گھنی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا یہ شخص شکل سے ہی کافی شاطر اور چالاک لگ رہا تھا۔

"میرا نام حیدر ہے۔ میں حمیدہ کا منگیتر ہوں جی' تین سال پہلے ہماری پسند سے منگنی ہوئی تھی' میں دبئی چلا گیا تھا نوکری کے سلسلے میں۔ پچھلے ہفتے ہی آیا ہوں۔" وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا وجاہت بیگ کو بتا رہا تھا ذیشان فواد اور بڑی تائی دم بخود بیٹھے اسے دیکھ اور سن رہے تھے۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ ہے؟" ذیشان نے تیزی سے سوال کیا تھا فواد چپ تھا جس حمیدہ بانو سے وہ کل ہی واقف ہوا تھا اس کے متعلق یہ سب بلکہ اس سے بھی زیادہ سچ ہو سکتا تھا۔

"آپ حمیدہ کو بلائیں' وہ خود بتا دے گی۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ ہماری پسند سے یہ رشتہ طے ہوا تھا۔ میرے دبئی جانے کے کچھ دن بعد اس نے فون پہ مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر جا رہی ہے' اپنے دادا سے جائیداد میں اپنا حصہ لینے' بشیر ماموں کو بھی یہ سارا قصہ معلوم ہے۔ یہاں آنے کے بعد دو چار بار اس کی میری بات ہوئی پھر اس نے مجھے منع کر دیا تھا کہ میں یہاں فون نہ کروں' بس آنے سے ایک مہینہ پہلے اسے بتا دوں۔ میں یہ سوچ کر چپ کر گیا کہ دوسرے کے گھر میں ہے' چلو یہ فون کا رابطہ چھوڑو' اگلے لوگ کیا سوچیں گے اس کے بارے میں' اب آنے سے پہلے کئی بار اس کا نمبر ٹرائی کیا' نمبر بند تھا' یہاں آنے کے بعد بشیر ماموں سے روز کہہ رہا ہوں کہ حمیدہ سے بات کروا دیں مگر ان کے پاس بھی حمیدہ کا نیا نمبر نہیں تھا نہ گھر کے کسی اور فرد کا۔ کل انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ لوگ زبردستی اس کی شادی کہیں اور کر رہے ہیں تو ان سے ایڈریس لے کر بھاگا بھاگا کراچی آیا ہوں' گھر ڈھونڈنے میں بھی تین گھنٹے لگ گئے۔"

اپنی رام کہانی سناتے سناتے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ میز پہ رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر غٹاغٹ پیا۔ کمرے میں وہ سناٹا تھا کہ سوئی بھی گرے تو آواز آ جائے۔

"تو حمیدہ بانو! کتنے رنگ ہیں تمہارے اور کتنے بہروپ۔" بے اختیار دکھتے دل سے فواد نے سوچا۔

اسی وقت حمیدہ بانو اندر داخل ہوئی۔ نو وارد کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"تم ــــ تم تو اگلے سال آنے والے تھے؟" اس نے اٹکتے ہوئے بے ساختہ سوال کیا۔

"ہاں۔ آنے والا تو تھا مگر میرے دل نے سگنل دیا کہ تیرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے' اس لیے فوراً" چلا آیا' تیرا میرا تو دل کا رشتہ ہے نا' تجھے کوئی تکلیف ہو اور مجھے پتا نہ چلے' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ وہاں سے اٹھ کر حمیدہ کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ' یہ جھوٹا ہے' فراڈیا' مکار' اس نے زبردستی مجھ سے منگنی کی تھی' میں' میری مرضی شامل نہیں تھی اس میں۔" وہ تیزی سے وجاہت بیگ اور ذیشان کے پاس آ گئی' اس کے لہجے سے خوف و ہراس ٹپک رہا تھا۔

"او ــــ او چلتر باز! میرے ساتھ یہ ڈرامے بازی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دو منٹ میں سیدھا کر دوں گا تجھے' ساری تصویریں' مووی سب کچھ ہے میرے پاس' زبردستی کی منگنی میں کوئی اتنا خوش نہیں دکھائی دیتا' سارا محلہ جانتا ہے' تیرے میرے پیار اور پھر منگنی کے بارے میں' سارے ثبوت اکٹھے کر کے لا کر دکھا دوں گا۔" اس نے خوں خوار نظروں سے حمیدہ کو دیکھا۔

"اور تو نے تو کہا تھا کہ بڈھے سے اپنا حصہ وصول کر کے واپس ماموں کے پاس آ جائے گی' تو اتنے عرصہ سے یہاں کیا ڈرامے کرنے ٹھہری ہوئی ہے' ہیں؟ بول!"

"مجھے بچا لیں پاپا! اس شخص سے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں' یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ مجھے برباد کرنا چاہتا ہے' تباہ کرنا چاہتا ہے۔" حمیدہ بانو وجاہت بیگ کے بازو سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"بیٹے! تمہارے ماموں کو بلا کر بات کرتے ہیں' کیا مسئلہ ہے' یہ صاحب اتنے اعتماد سے بات کر رہے ہیں' کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے۔ اب کیا کہوں۔" وجاہت بیگ دائیں ہاتھ سے پیشانی مسلتے ہوئے بولے بڑی تائی حق دق سب کے چہرے دیکھ رہی تھیں' بلقیس چچی بھی اندر آ پہنچیں۔

"کیا مسئلہ ہے' کوئی مجھے بھی تو بتائے۔" انہوں نے باری باری سب کے چہرے دیکھے۔

کسی نے بھی ان کی بات کا جواب نہ دیا' سب چپ چاپ بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میں پہلے ہی کہہ رہی تھی یہ لڑکی بہت چلتر' بہت

مکار ہے' مگر سب کو میری باتیں بری لگتی تھیں۔ یتیم ہے ایسے نہ کہو' ویسے نہ کہو' اب دیکھا بیٹے! بڑوں کا بھی کوئی تجربہ ہوتا ہے' ضروری نہیں کہ ہم کسی برے کو برا کہیں تو خرابی ہمارے مزاج کی ہو' ہم تو اپنے بچوں کو آگاہ کرتے ہیں تاکہ وہ برے کے شر سے' اس کی برائی سے بچیں۔" بلقیس چچی بیٹھی فواد سے کہہ رہی تھیں۔

"چھوڑیں امی! اب ختم کریں یہ قصہ۔ جو برائی کرتا ہے' درحقیقت اپنے لیے کرتا ہے اللہ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔"

فواد کا دل دکھی تھا۔ چھٹانک بھر کی لڑکی نے سب کو ہی خوب بے وقوف بنایا تھا۔ فواد کو اپنے جذبوں کی پامالی سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ اچھی خاصی ذہین لڑکی تھی۔ اس کی کزن تھی' پیارے چچا کی بیٹی' اس گھر کی ایک فرد' اگر اس کی نیت میں کھوٹ اور دل میں لالچ نہ ہوتا تو فواد یا ذیشان کسی کے بھی نصیب کا تارہ بن سکتی تھی اور بالفرض یہ نہ بھی ہوتا' وہ کسی اور کے مقدر میں ہی ہوتی مگر پھر بھی عزت اور محبت کے ساتھ سب کے دلوں میں تو رہتی' ایک گھر اور بہت سارے رشتے ہوتے جو زندگی کے ہر مرحلے پر اس کے ساتھ اور اس کے پاس ہوتے' مگر اب۔۔۔ اب اس نے خود ہی اپنے پیروں پہ کلہاڑی مار لی تھی۔

حیدر نے حمیدہ بانو کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا' وہ اگلے ہی روز حمیدہ کے ماموں کے ساتھ آگیا تھا۔ وہ ان کمزور اور کم ہمت لوگوں میں سے تھے جو لالچ میں آکر کسی برائی یا غلط کام کا حصہ تو بن جاتے ہیں مگر خود پر ذرا سی آنچ آتی دیکھ کر فوراً" پیچھے بھی ہٹ جاتے ہیں۔ حیدر کی دھمکیوں سے ڈر کر انہوں نے سب گھر والوں کے سامنے سب کچھ سچ سچ اگل دیا۔

حمیدہ بانو ان کی بھانجی تھی مگر نہ وہ اتنی مظلوم تھی اور نہ ہی ان کی بیوی اتنی ظالم' جتنا کہ حمیدہ بانو نے ظاہر کیا تھا۔ سارا مسئلہ تھا بس خوابوں کی اونچی اڑان کا' اسے آسمان چھونے کی خواہش تھی۔ اسی خواہش نے حیدر کو اپنا شکار بنایا جو محلے کے سب سے کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا اور اس کے پیچھے پاگل بھی۔

منگنی کے بعد حیدر دبئی چلا گیا' حمیدہ بانو اپنے دادا کے گھر آگئی' ماموں کو اس نے یہی لالچ دیا تھا کہ باپ کی جائیداد میں سے جو حصہ ملے گا' اس میں سے انہیں بھی کچھ نہ کچھ دے گی' شومئی قسمت یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد دادو کا انتقال ہو گیا اور پھر حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ اس نے پہلے تو فواد کو اپنی سیڑھی بنانے کا فیصلہ کیا' بلقیس چچی کو زچ کرنے بلکہ عار دلانے کا اس سے اچھا موقع اور کہاں ملتا اور پھر اس نے حیدر اور فواد کا موازنہ کیا تو ہر لحاظ سے فواد کا پلڑا ہی بھاری تھا۔

حیدر کون سا ابھی پاکستان آرہا تھا۔ آ بھی جاتا تو حیدر آباد سے کراچی آکر اسے ڈھونڈنا آسان نہ تھا ایک بار وہ فواد کی ہو جاتی تو کچھ بھی جھوٹی سچی رام کہانی سنا کر حیدر کا معاملہ بھی نپٹا ہی دیتی' مگر پھر ذیشان کی واپسی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں اپنے لیے نرمی اور انوکھے رنگ دیکھے' وہ تو اپنے دادو کی خواہش کا پاس رکھتے ہوئے ان کی محبت میں حمیدہ کی طرف بڑھا تھا' حمیدہ نے اس سے منہ موڑنا کفران نعمت جانا اور اس کی پذیرائی کر ڈالی' مگر عین وقت پر پوری بازی الٹ گئی۔ ساری چالیں الٹی ہو گئیں۔

اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کے ماموں کو فون کر کے بلایا جائے گا اور اس کے رشتے کے معاملے میں انہیں بھی کوئی حیثیت اور اہمیت دی جائے گی' پھر حیدر کی پاکستان آمد۔

اس مردود کو بھی ابھی آنا تھا' رو رو کر حمیدہ بانو کی آنکھیں سوج گئی تھیں' اپنی صفائیاں پیش کر کر کے اس کی آواز بیٹھ گئی مگر وہ اپنا اعتبار کھو بیٹھی تھی۔

فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اسے ماموں کے ہمراہ واپس بھیج دیا جائے' حیدر شادی کے ارادے اور تیاریوں سے مستقل پاکستان آگیا تھا' اسے شادی کرنی تھی اور حمیدہ سے ہی کرنی تھی۔

"بیٹی! میں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔" ان لوگوں کے روانہ ہوتے وقت وجاہت بیگ حمیدہ سے

مخاطب ہوئے۔

"ہمارے والد اور ہم سب بھائی ملازمت پیشہ لوگ تھے' شجاعت (حمیدہ کے والد) کے انتقال کے وقت ہمارا ایک آبائی گھر تھا' یہی کل جائیداد تھی ہماری۔ ہم نے اس وقت بھی آپ کی والدہ کے حق سے زیادہ انہیں دے دیا تھا۔ ہم تو آپ دونوں کی مستقل کفالت کے لیے بھی راضی تھے مگر آپ کی والدہ ہم لوگوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھیں' نہ انہوں نے کبھی ہم سے رابطہ رکھا اور نہ ہی ہمیں رکھنے دیا' ناچار ہم خاموش ہو گئے' شجاعت کے انتقال کے بعد میں نے اور بڑے بھائی صاحب نے مل کر کاروبار شروع کیا' اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت اور ترقی دی۔ والد صاحب کی زندگی میں ہی ہم ماشاء اللہ مالی طور پر کافی مستحکم ہو چکے تھے' اصولاً" یہاں کی کسی قسم کی بھی پراپرٹی میں آپ کا کوئی حصہ نہیں مگر ہم نے آپ کو اپنی بیٹی کہا ہی نہیں مانا بھی ہے' آپ کے نام جو اکاؤنٹ میں نے کھلوایا تھا اس میں ایک خطیر رقم جمع کروادی ہے' آپ اسے جیسے چاہیں استعمال میں لا سکتی ہیں اور کبھی زندگی میں جب بھی ہماری ضرورت پڑے' اس گھر کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں' خوش رہیں۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

حمیدہ کا دل چاہا' دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اس میں تو اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ ان اعلا ظرف لوگوں سے معافی ہی مانگ سکتی۔

"اور دادو نے تو اپنی سب سے قیمتی دولت تمہارے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تھا' افسوس تم اس جوہر نایاب کے قابل ہی نہ ہوئیں۔" فواد نے دل گرفتی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔



ذیشان کچھ دن اپ سیٹ رہا' گم صم تو فواد بھی تھا' وہ ذیشان کو ساری حقیقت بتانے کا حوصلہ نہ کر سکا' بتا دیتا تو اس سے ساری زندگی نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ کیسے بتاتا کہ جس حمیدہ بانو پر دادو نے شان کے نام کی مہر لگانے کی خواہش کی تھی' اس کے لیے اس کا اپنا دل بے ایمان ہو گیا تھا' وہ شاید محبت نہیں بلکہ اس کی غلطی تھی اور جس غلطی پر اللہ پردہ ڈال رہا تھا اس کے بارے میں فواد نے بھی چپ سادھ لی' ایک عمر کتابیں پڑھ کر وہ کچھ نہیں سیکھا تھا جو پچھلے کچھ عرصے میں انسانوں اور زندگی نے سکھا دیا تھا اپنی صلاحیتوں اور علم دانی پر دل کے کسی کونے کھدرے میں جو نا محسوس سا تکبر چھپا بیٹھا تھا اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ کیسی صلاحیت' کیسا علم' کیسی تخلیق۔ سب پر جیسے پانی پھر گیا تھا۔

زندگی کب رکتی ہے' ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔ فواد کا رشتہ اس کی خالہ کے ہاں فروا سے طے کر دیا گیا ذیشان کے لیے حسب توقع ماہم کا نام تجویز ہوا۔

"میں پہلے ماہم سے بات کروں گا۔" ذیشان نے پاپا سے درخواست کی۔

"ٹھیک ہے' تم اپنی تشفی کر لو۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

ماہم وہیں تھی' اپنے گوشہ عافیت میں' جسے سب کچن کہتے تھے۔

وہ آج ماہم سے پہلی بار تو بات نہیں کر رہا تھا مگر پھر بھی جھجک گیا۔ کچھ ماہم کا رویہ بھی سنجیدہ تھا۔

"زندگی کتنی عجیب و غریب ہوتی ہے نا!" کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ بولا تھا۔

"جو کچھ ہم سوچتے ہیں یا چاہتے ہیں' وہ نہیں ہوپاتا تو زندگی ہمیں عجیب و غریب یا بری لگنے لگتی ہے' مگر زندگی تو بس ایسی ہی ہوتی ہے' کچھ کھٹی میٹھی سی کبھی تلخ تو کبھی خوشگوار۔"

ماہم کا فلسفہ ذیشان نے غور سے سنا اور مسکرا دیا۔

"تم اس رشتے پہ خوش تو ہو نا؟" ذیشان نے اچانک ہی پوچھا تھا مگر وہ نہیں چونکی جیسے اسے معلوم تھا کہ یہ سوال ضرور ہو گا۔

"ہاں' میرا خیال ہے۔ میں خوش ہی ہوں۔"

"خیال؟ یقین نہیں ہے؟"

"جب خیال آگیا تو یقین بھی آ ہی جائے گا۔"

"ماہم پلیز' اپنی فیلنگز مجھ سے شیئر کرو' جو کچھ تمہارے دل میں ہے کہہ ڈالو۔"

"کہہ دوں؟ برا تو نہیں مانو گے؟" ماہم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اگر مانوں بھی تو کیا ہوا' تم برداشت کرنا' یہ تمہارا حق ہے۔"

"اچھا!" وہ پہلی بار مسکرائی تھی۔

"تھینک گاڈ! تم مسکرائیں تو تمہاری سیریس قسم کی شکل دیکھ کر میں تو ڈر رہا تھا۔" ذیشان بے ساختہ ہی بولا۔

"پتا ہے کیا؟" وہ یک بیک پھر سنجیدہ ہو گئی۔

"میرے دل میں بار بار ایک ہی خیال آرہا ہے کہ" وہ ایک لمحے کو رکی "کہ میں تمہاری سیکنڈ چوائس ہوں' بچپن سے تم مجھے جانتے ہو' سمجھتے ہو' میری پوری زندگی کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔ پھر کیا بات تھی کہ تم نے میرے مقابلے میں ایک ایسی لڑکی کو ترجیح دی جسے تم ٹھیک سے جانتے بھی نہیں تھے یا پھر تم بھی عام لڑکوں کی طرح محض شکل صورت پہ فدا ہو گئے تھے۔"

ماہم اپنے دل کی بھڑاس نکال کر اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"بس یہی وجہ تھی جس نے تمہارے ایکسپریشن اتنے خطرناک بنا دیے تھے۔" ذیشان مسکرایا۔

"بات یہ ہے ماہم کہ حمیدہ بانو دادو کی خواہش اور پسند تھی' وہ اپنی غلطیوں کا ازالہ اور اس کی پچھلی زندگی کی تلافی کرنا چاہتے تھے' انہوں نے مجھے حکم نہیں دیا تھا نہ ہی پابند کیا تھا بس درخواست کی تھی' تم جانتی ہو نا کہ دادو کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔ ان کی اچانک ڈیتھ کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ان کی خواہش کا مان رکھوں گا باقی کمال تمہارے بھائی کا تھا میں فرشتہ نہیں ہوں' واپس آنے کے بعد بے شک میں اس کی خوب صورتی سے بھی متاثر ہوا تھا مگر سب سے پہلی اور اہم وجہ اسے ترجیح دینے کی وہی تھی جو میں بتا چکا ہوں۔ اگر وہ دادو کی خواہش نہ ہوتی تو میری پہلی ترجیح کبھی نہ بنتی۔"

ذیشان نے بہت نرمی سے اچھی طرح بات کی وضاحت کر دی تھی' ماہم کے چہرے پہ اطمینان کے رنگ بھی تھے اور خجالت کے بھی۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہا تھا۔" ماہم شرمندگی سے بولی۔

"میں بالکل بھی ہرٹ نہیں ہوا' تم بتاؤ' اب تم مطمئن ہو؟"

"ہاں!" اس نے سر ہلایا۔

"خوش ہو؟"

"ہاں!"

"محبت کرتی ہو؟"

"ہاں!" وہ اسی ٹون اور روانی میں بولی تھی اور ذیشان کی بے ساختہ مسکراہٹ پر فوراً" ہی اس کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا۔

"اب تم جاؤ۔" ماہم نے رخ موڑ لیا۔

"ٹھیک ہے' میں جا رہا ہوں اور اب سہرا باندھ کر ہی تمہارے پاس آؤں گا۔" وہ جیسے دھمکی دیتے ہوئے گیا تھا۔

ماہم بے اختیار ہنس پڑی' اس کی خدمت بے لوث اور محبت بے غرض تھی۔ کیسے نہ صلہ ملتا اچھے لوگوں کے لیے بہار وقت سے پہلے بھی آجاتی ہے۔



نگہت عبداللہ



توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ، جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایازاد، اجلال رازی سے ہوچکی ہے، جو اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوجاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

وہ اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خودسر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے مگر وہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔



تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کرلیتا ہے اور تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروا دیتا ہے۔

اریبہ 'یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے 'مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کردیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی 'اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی 'توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اریبہ 'ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی 'اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔ تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔

توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے 'مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہوجاتی ہے۔

یاسمین 'اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑجاتی ہے۔ مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کردیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال 'اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہوجاتا ہے۔ اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں کمیر [illegible] اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے [illegible] اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کرلیتا ہے۔

اریبہ کے اغوا ہوجانے پر سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ اجلال 'ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

شمشیر علی کو اریبہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اریبہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے رابطہ کرلے۔ اریبہ اجلال کو فون کرتی ہے 'مگر وہ سرد مہری سے بات کرتا ہے تو اریبہ کچھ بتائے بغیر فون بند کردیتی ہے۔ شمشیر علی نے

ابراہیم نامی بچے سے اسکیچنگ سیکھ کر تاجور کی تصویر بنائی تو اریبہ اسے دیکھ کر فوراً" پہچان گئی۔ اس نے شمشیر کو بتایا کہ اریبہ اس کے گھر میں حفاظت سے ہے۔ شمشیر اب اریبہ کو واپس پہنچانا چاہتا تھا 'لیکن اریبہ نہیں چاہتی ہے کوئی شمشیر علی کو مجرم سمجھے۔ وہ ایک منصوبہ بناتی ہے۔ جس کے تحت شمشیر علی اسے اسپتال میں داخل کرا کے توصیف احمد کو اطلاع کردیتا ہے۔ توصیف احمد اس کے ساتھ اسپتال جاتے ہیں اور اریبہ کو گھر لے آتے ہیں۔

اریبہ کو دیکھ کر اجلال کو محسوس ہوا کہ وہ اس کی محبت سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا مگر پھر ساجدہ بیگم سے سارہ سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کردیتا ہے۔ وہ ناراض ہوجاتی ہیں۔ ثنا 'سمیر کو فون پہ بتا دیتی ہے۔ وہ سارہ سے پوچھتا ہے 'پھر جواب نہ پا کر اریبہ کو بتا دیتا ہے۔ اریبہ 'سارہ سے ناراض ہوجاتی ہے۔ اریبہ اپنے والد کے دفتر میں اجلال سے اشاروں کنایوں میں اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ اجلال کے چہرے کے تاثرات سے اسے جواب مل جاتا ہے۔ سارہ حالات سے خوف زدہ ہو کر خودکشی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اٹھارویں قسط

"بیٹا! تم خود کو سنبھالو۔ آؤ۔ یہاں بیٹھو۔" بی بی نے اریبہ کو صوفے پر بٹھایا پھر اس کے لیے پانی لے آئیں اور گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ لیکن ایک گھونٹ ہی اس کے حلق میں اٹک گیا تھا۔ وہ گلاس دھکیل کر بی بی کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت کے ساتھ بے شمار سوال تھے۔

"پتا نہیں بیٹا! کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں کھانے کا پوچھنے سارہ کے کمرے میں گئی تو وہ......"

"زیادہ خون بہا ہے بی بی؟" اسے اپنے جسم سے روح کھنچتی محسوس ہورہی تھی۔

"ہاں! میں صاف کرتی ہوں۔" بی بی اٹھنے لگیں کہ اس نے ان کی کلائی تھام لی۔ اس کی اپنی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ وہ جا کر دیکھے اور وہ کچھ سوچ بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ ذہن بالکل ماؤف ہوچکا تھا۔

"بیٹا! اللہ خیر کرے گا۔ تم حوصلہ پکڑو۔" بی بی کو اس کی فکر لاحق ہوگئی۔ کبھی اس کی پیٹھ سہلاتیں 'کبھی کندھے دباتیں۔ پھر گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"لو! پانی پیو۔ شاباش! ہمت کرو۔"

"یہ سب کیا ہورہا ہے بی بی؟" وہ یکلخت ٹوٹ گئی۔ بی بی کے کندھے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔

بی بی نے اسے رونے دیا۔ کبھی کبھی رونا زندگی کے لیے کتنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ٹھنڈے وجود میں دھیرے دھیرے حرارت دوڑنے لگی تھی۔ پھر وہ اچانک متحرک ہوگئی۔

"کہاں لے گئی ہیں مما اسے؟ میرا سیل فون۔" اس نے ادھر ادھر ہاتھ مارا اور یاد آنے پر بھاگ کر گاڑی میں سے اپنا بیگ اٹھا لائی۔ پھر سیل فون نکال کر یاسمین کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ وہ پریشان ہوگئی۔

"مما فون نہیں اٹھا رہیں۔" اس نے روہانسی ہو کر بی بی کو دیکھا۔

"پتا نہیں بیٹا! یاسمین فون لے کر گئی ہے کہ نہیں۔ اتنی پریشانی میں گئی ہے۔" بی بی نے کہا تو اس نے یاسمین کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

یاسمین کا سیل فون سامنے ہی رکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ توصیف احمد کو فون کرنے کا خیال آیا لیکن پھر اس نے سوچا 'پہلے سارہ کا کمرا صاف کردے۔ کیونکہ یاسمین کا پتا نہیں تھا کہ وہ کون سے اسپتال گئی

ہے اور توصیف احمد اس کی کال پر یقیناً "یہیں آتے۔ اب اس کا ذہن جس تیزی سے سوچنے لگا تھا اسی تیزی سے وہ سارہ کے کمرے میں آتے ہی پتھر بن ہو گئی تھی۔ فرش پر خون کا بڑا سا گول دائرہ بن گیا تھا۔ بیڈ کی چادر بھی رنگین ہو گئی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا سارہ؟" اس کا دل اب دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ بے جان قدموں کو گھسیٹتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور بیڈ سے چادر کھینچ کر فرش پر ــــ خون پر ڈال دی اور خود پیچھے صوفے پر ڈھے گئی۔ عجیب بے بسی تھی اور بے انتہا خاموشی۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ تب اچانک اس کے سیل فون نے محشر بپا کر دیا۔ اسے یہی لگا تھا وہ اپنی جگہ سے اچھلی تھی۔ پھر جھپٹنے کے انداز میں سیل فون اٹھایا۔

"ہیلو...!"

"اریبہ بیٹا! میں..." یاسمین کی آواز نے ہی اس کے اندر بجلی بھر دی تھی۔

"مما! مما! کہاں ہیں آپ؟ سارہ کیسی ہے؟ مما سارہ ٹھیک ہے نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں؟" وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی۔

"بیٹا! بیٹا، ریلیکس۔ سارہ ٹھیک ہے۔" یاسمین نے اسے تسلی دی۔

"مما! سارہ نے ایسا کیوں کیا؟"

"پتا نہیں بیٹا! تم کچھ مت سوچو۔ میں نے تمہارے ڈیڈی کو فون کر دیا ہے۔ وہ آتے ہوں گے۔ تم بس اپنا خیال رکھو۔" یاسمین اس کے رونے سے پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ کون سے اسپتال میں ہیں مما! میں بھی آرہی ہوں۔"

"نہیں بیٹا! تم ابھی مت آؤ۔ مجھے تمہاری حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ خود کو سنبھالو بیٹا۔ سارہ کے پاس میں ہوں نا اور دیکھو! حماد کو ابھی کچھ مت بتانا۔ ٹھیک ہے؟ میں پھر فون کروں گی۔"

یاسمین نے اپنی بات کہہ کر فون بند کر دیا۔ تو وہ جو چلا کر کہنا چاہتی تھی کہ میں بس ابھی آؤں گی اس کی آواز حلق میں ہی دب گئی۔



یاسمین انتہائی پریشانی کے عالم میں اسپتال کی لابی میں ٹہل رہی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹرز نے ابھی تک کوئی امید نہیں دلائی تھی۔ اریبہ کو جھوٹی تسلی دے کر وہ اور مضطرب ہو گئی تھی۔ پھر جب توصیف احمد کو آتے دیکھا تو وہ بنچ پر ڈھے گئی۔ حقیقتاً "اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

توصیف احمد تیز قدموں سے آرہے تھے۔ لیکن جب یاسمین کے ساتھ بیٹھے تو انہیں لگا کہ جیسے اب وہ اس عورت سے کوئی سوال نہیں کر سکتے، نہ اسے الزام دے سکتے ہیں۔ اریبہ کی گمشدگی کے بعد سے یاسمین میں جو تبدیلی آئی تھی، اس سے وہ خاصی سنجیدہ لگنے لگی تھی کہ توصیف احمد کو بات کرنے سے پہلے سوچنا پڑ رہا تھا۔ پھر شام میں ہی ان کی اریبہ کے ساتھ سارہ سے متعلق بات ہوئی تھی۔ اریبہ نے کہا تھا کہ سارہ سوچتی زیادہ ہے اور گھر بیٹھ بیٹھ کر خبطی ہو گئی ہے۔ اس لیے کتنی ہی دیر وہ یاسمین کو بس دیکھتے رہے۔ جس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے ذرا بھی چھیڑا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی اور واقعی ایسا ہی تھا۔ یاسمین کے حلق میں گولا سا اٹکا تھا۔ جبکہ زبان خشک ہو گئی تھی۔

"سارہ کیسی ہے؟" توصیف احمد کی آواز بوجھل تھی۔

یاسمین نے بہت ہلکے سر کو یوں جنبش دی جیسے پتا نہیں۔ ساتھ ہی ایمرجنسی روم کی طرف اشارہ کیا۔ توصیف احمد اس طرف دیکھنے لگے۔

"کتنے دنوں سے سارہ ڈسٹرب لگ رہی تھی۔ پوچھنے پر کچھ بتاتی ہی نہیں تھی۔" کتنی دیر بعد یاسمین اپنی ساری توانائیاں یکجا کر کے گویا ہوئی۔ "یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا توصیف! میری بچیاں فالتو نہیں ہیں کہ جب جس کا جو دل چاہے کہہ دے۔"

"ہم بھی کس نے کیا کہا ہے؟" توصیف احمد نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔ لیکن ساجدہ بھابھی کے گھر سے کوئی بات ہوئی ضرور ہے، جو اریبہ اور سارہ تک بھی پہنچی ہے اور دونوں ہرٹ ہوئی ہیں۔ پچھلے کئی دنوں سے اریبہ اور سارہ کی بات چیت بند ہے۔" یاسمین ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ "کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی۔ آپ خود سوچیں، کسی معمولی بات پر سارہ اپنی جان پر کھیل سکتی ہے کیا؟"

توصیف احمد کچھ بول نہیں سکے تو یاسمین کا ہاتھ تھپک کر اسے حوصلہ دینے لگے۔ تب ہی ایمرجنسی روم کا دروازہ کھلنے پر یاسمین ایک دم اٹھنے لگی۔ لیکن توصیف احمد نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر ڈاکٹر کے پاس چل پڑے۔

یاسمین کا دل ڈوبنے لگا۔ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر جتنی دعائیں یاد تھیں اس کی زبان پر جاری ہو گئیں۔ وہ بہت زور زور سے ہل رہی تھی۔ کتنی دیر بعد اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے اس نے ایک دم سر اونچا کیا۔

توصیف احمد اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔

"ٹھیک ہے نا میری بچی؟ ٹھیک ہو جائے گی نا؟" یاسمین کے آنسو روانی سے چھلک رہے تھے۔

"ان شاء اللہ!" توصیف احمد اپنی جیب سے رومال نکال کر یاسمین کو دیتے ہوئے بولے۔ "خطرہ ٹل گیا ہے۔"

"شکر ہے۔ میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟"

"نہیں! ابھی ڈاکٹر منع کر رہے ہیں۔ تم بیٹھو اور خود کو سنبھالو۔ میں بلڈ کا انتظام کرتا ہوں۔" توصیف احمد نے کہا تو یاسمین پھر پریشان ہو گئی۔

"بلڈ...؟"

"ہاں! کافی خون بہہ گیا ہے۔ اسپتال میں ضرورت کے مطابق نہیں ہے۔ کہیں اور سے انتظام کرنا پڑے گا۔"

"میں... میرا بلڈ چیک کرائیں۔ میں اپنا سارا خون دے دوں گی۔" یاسمین بے چین ہو گئی۔

"تمہاری اپنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ تم بیٹھو آرام سے اور فکر مت کرو۔ انتظام ہو جائے گا۔ ریلیکس ... ریلیکس۔" توصیف احمد نے اسے کندھوں سے تھام کر بٹھایا، پھر اسے جوس منگوا کر دیا۔

جوس پینے سے یاسمین قدرے پرسکون ہو گئی۔ تب اسے اریبہ کا خیال آیا۔ وہ بہت رو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا توصیف احمد آئیں گے تو وہ انہیں گھر بھیج دے گی۔



اریبہ کو اک پل چین نہیں تھا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ تمام اسپتالوں کے ایمرجنسیز میں فون کر کے معلوم کرے کہ سارہ کہاں ہے اور پھر اس کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن رات زیادہ ہو گئی تھی۔ پھر شہر کے حالات بھی ایسے نہیں تھے کہ وہ اکیلی نکل جاتی۔ گو کہ اس کا دل یہ ہی چاہ رہا تھا اور وہ ہمت کر بھی لیتی۔ لیکن پھر یاسمین اور توصیف احمد کی ناراضی کا خیال کر کے وہ خود کو روکے ہوئی تھی... گیارہ بجے تک تو بی بی اس کے ساتھ رہیں۔ پھر اس نے خود

ہی انہیں سونے بھیج دیا اور حماد کو اس نے یہ کہہ کر اطمینان دلا دیا تھا کہ کمزوری کے باعث مما سارہ کو ڈرپ لگوانے گئی ہیں۔ کاش! ایسا ہی ہوتا۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ پھر کوئی پاس بھی نہیں تھا کہ کچھ دیر کو دھیان ادھر ادھر ہوتا۔ اتنے بڑے گھر میں وہ اس وقت اکیلی پھر رہی تھی۔ حماد اور بی بی کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ دونوں سو چکے تھے اور اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ذہن اس بری طرح چیخ رہا تھا کہ لگتا تھا' پھٹ جائے گا۔ یاسمین کا دوبارہ فون بھی نہیں آیا تھا۔ وہ بار بار اپنا سیل فون اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اسے لگا کہ اگر اس نے کسی سے بات نہیں کی تو سچ مچ اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔

پھر اس نے کچھ سوچ کر ہی شمشیر علی کا نمبر ملایا تھا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی پھر شمشیر علی کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔

"ہیلو...!"

"کتنے آرام سے سو رہے ہو تم۔ تمہیں نیند کیسے آجاتی ہے؟ میرے سامنے تو بہت بنتے ہو کہ میں بہت گلٹی فیل کر رہا ہوں۔ مجھے کسی پل چین نہیں ہے۔ جھوٹ بولتے ہو نا تم۔ ڈراما کرتے ہو میرے سامنے۔" وہ چھوٹتے ہی بلاتوقف شروع ہو گئی تھی۔ کہیں کا غصہ کہیں نکل رہا تھا۔

شمشیر علی پہلے بوکھلایا۔ پھر پریشان ہو گیا۔ نیند بھک سے اڑ گئی۔

"اریبہ! کیا ہوا ہے؟ سب خیریت ہے نا؟"

"اب تم اپنی خیر مناؤ شمشیر علی! خدا کی قسم' اگر میری بہن کو کچھ ہوا تو میں تمہارا وہ حشر کروں گی کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔" اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔ وہ چلا کر بات کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے! جان سے مار دینا مجھے۔ لیکن خدا کے لیے یہ تو بتاؤ! ہوا کیا ہے؟ تمہاری بہن کہاں ہے؟" وہ بھی چلایا تھا۔

"مر رہی ہے میری بہن اور مجھے نہیں پتا کہاں ہے۔" وہ رو پڑی۔

"اریبہ...!" شمشیر علی عاجز ہو گیا۔ "اریبہ! تم اصل بات بتاؤ گی تو میں کچھ کر سکوں گا۔ تم پلیز! رو مت۔ مجھے بتاؤ' کہاں ہے سارہ...؟"

"مجھے نہیں پتا۔ سارہ نے اپنی کلائی کی نس کاٹ لی تھی۔ مما اسے اسپتال لے گئی تھیں۔ مجھے نہیں پتا' وہ کس حال میں ہے۔" وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔

"اچھا! میں پتا کرتا ہوں۔ میں پتا کرتا ہوں اریبہ! تم رو مت۔ سن رہی ہو نا۔ میں تمہیں تھوڑی دیر میں فون کرتا ہوں۔" شمشیر علی نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ اب ہچکیوں سے رو رہی تھی۔



شمشیر علی کے ذہن میں کئی سوال اٹھ رہے تھے کہ سارہ نے ایسا کیوں کیا اور اریبہ اس کا ذمہ دار اسے کیوں ٹھہرا رہی ہے۔ لیکن یہ وقت ان باتوں کو سوچنے اور الجھنے کا نہیں تھا۔ اسے پہلے سارہ کی خیریت معلوم کرنی تھی اور اسے بھی پہلا خیال یہی آیا کہ وہ اسپتالوں کی ایمرجنسیز میں فون کر کے سارہ کے بارے میں معلوم کرے۔ لیکن اس خیال پر وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔ کیونکہ اس طرح وہ سارہ تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔ پہنچ بھی جاتا تو جواز کیا پیش کرتا کیونکہ توصیف احمد کی وہاں موجودگی یقینی تھی۔ توصیف احمد کا خیال آنے پر ہی اس کا ذہن تیزی سے سوچنے

لگا تھا اور پھر اس نے توصیف احمد کو ہی فون کر ڈالا۔

"لیس۔۔۔!" توصیف احمد کی بے دھیانی سے ظاہر تھا کہ وہ پریشان ہونے کے ساتھ کہیں مصروف بھی ہیں۔

"سر! میں شمشیر علی بات کر رہا ہوں۔" وہ بہت سنبھل کر بولا۔

"ہاں کہو۔۔۔" اب توصیف احمد کا انداز عجلت لیے ہوئے تھا۔

"ایکسکیوز می سر! میں نے کچھ دیر پہلے آپ کی گاڑی دیکھی تھی۔ سوچا، معلوم کرلوں کہ آپ۔۔۔؟" وہ اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے خائف ہو گیا تھا۔

"ہاں! میں ہی تھا۔ آئی مین میری گاڑی چوری نہیں ہوئی۔" توصیف احمد نے کہا تو وہ فوراً" بولا۔

"سر! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ میں آجاتا ہوں آپ کے پاس۔۔۔"

توصیف احمد نے فوراً" جواب نہیں دیا تھا۔ غالباً" سوچ میں پڑ گئے تھے۔ جبکہ شمشیر علی کا سارا دھیان ان کی طرف تھا۔

"ہاں شمشیر۔۔۔!" چند لمحوں بعد توصیف احمد کی آواز آئی تھی۔ "آسکو تو آجاؤ۔ میں یہاں اسپتال میں ہوں۔"

"کون سے اسپتال میں سر؟" وہ الرٹ ہو گیا اور ان کی بات سن کر بولا۔

"اوکے سر! بس ابھی آرہا ہوں۔" اس نے سیل فون رکھ کر جلدی سے کپڑے بدلے پھر تاجور کو اٹھا کر اس سے کہنے لگا۔

"تاج! میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ تم اکیلے ڈرنا مت۔۔۔"

"بھائی! اس وقت۔۔۔" تاجور پریشان ہو گئی۔

"ہاں! اسی وقت جانا ضروری ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں آجاؤں گا۔ تمہیں اگر ڈر لگے تو مجھے فون کرلینا۔ چلو! دروازہ بند کرلو۔" تاجور اٹھ کر اس کے ساتھ دروازے تک آئی تو وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر بولا۔

"ویسے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم سو جانا۔"

"آپ کسی اور شہر تو نہیں جارہے بھائی؟" تاجور کا خدشہ زبان پر آگیا۔

"نہیں! کسی اور شہر کیوں جاؤں گا۔ کہا نا ایک دو گھنٹے میں آجاؤں گا۔ چلو، دروازہ بند کر کے سو جاؤ۔ شاباش۔"

اس نے تاجور کی پیشانی چومی اور مسکرا کر اسے حوصلہ دیا۔ پھر جب دروازہ بند ہو گیا۔ تب وہ تیزی سے سیڑھیاں اترا۔

رات کے اس پہر سڑکیں سنسان تھیں۔ جب ہی وہ پندرہ منٹ سے بھی پہلے توصیف احمد کے سامنے کھڑا تھا۔

"سر! سب ٹھیک ہے نا۔۔۔؟"

"ہاں! وہ میری بیٹی۔۔۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" توصیف احمد شش و پنج میں تھے۔

"کیا ہوا سر! کوئی سیریس بات تو نہیں ہے؟" وہ خود کو احتیاطوں کے کڑے پہروں میں مقید کر کے آیا تھا۔

"نہیں! اب تو۔۔۔" توصیف احمد نے اس قدر کہا تھا کہ نرس ان کے پاس آکر کہنے لگی۔

"سر! مزید بلڈ کی ضرورت پڑے گی۔ صبح سے پہلے انتظام کرلیں۔"

توصیف احمد نے اثبات میں سر ہلا کر نرس کو جواب دیا۔ پھر شمشیر علی کو دیکھنے لگے۔ اصل میں انہوں نے اسی لیے اسے بلایا تھا۔ پہلے تو وہ اجلال رازی کو ہر معاملے میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جس سے ان کی ڈھارس بندھی رہتی تھی۔ رازی کو وہ حقیقتاً" بیٹوں کی طرح دایاں بازو سمجھتے تھے اور اس نے بھی انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ لیکن یہاں وہ رازی کو بلانے سے قصداً" گریز کر رہے تھے۔ ایک تو اریبہ سے رشتہ ختم کرنے پر وہ کچھ محتاط ہو گئے

تھے۔ دوسرے ابھی یاسمین نے کہا تھا کہ ساجدہ بیگم کے گھر سے کوئی بات ہوئی ہے۔ جس سے ان کی بیٹیاں دکھی ہوئی ہیں۔ اس لیے انہیں رازی کا خیال آیا بھی تو انہوں نے جھٹک دیا تھا اور اب خود ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مزید بلڈ کے لیے بھاگ دوڑ کرتے۔

"آپ بیٹھیں سر! میں دیکھتا ہوں۔"

شمشیر علی نے خود ہی ان کا مسئلہ اور ضرورت سمجھتے ہوئے انہیں لے جا کر یاسمین کے ساتھ بٹھایا پھر پہلے ڈاکٹر سے مل کر سارہ کی حالت معلوم کی۔ سارہ کا بلڈ گروپ، جو اتفاق سے اس کے بلڈ گروپ سے مل گیا تو پھر اس نے کچھ نہیں سوچا۔ فوراً" خون دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب بیڈ پر لیٹا تو جیب سے سیل فون نکال کر اریبہ کا نمبر ملایا۔

"ہاں شام۔۔۔!" ادھر اریبہ جیسے منتظر بیٹھی تھی۔

"ڈونٹ وری! سارہ ٹھیک ہے۔" اس نے اتنے آرام سے کہا کہ وہ سلگ گئی۔

"تمہیں کیسے پتا۔۔۔؟"

"میں اسپتال میں موجود ہوں اور ڈاکٹر سے ساری رپورٹ لے کر تمہیں بتا رہا ہوں۔ خود سے نہیں کہہ رہا۔ چاہو تو اپنے ڈیڈی سے پوچھ لو۔" وہ ابھی بھی آرام سے بولا۔

"شٹ اپ۔۔۔!" اریبہ نے لائن کاٹ دی تو وہ ہنسنے لگا۔ سامنے سے توصیف احمد آرہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بھی اس نے اپنی ہنسی چھپانے کی کوشش نہیں کی یا شاید بھول گیا تھا۔

"کیا ہوا شمشیر علی۔۔۔؟" توصیف احمد نے دور ہی سے اس کی رگوں سے خون بوتل میں منتقل ہوتے دیکھ لیا تھا جب ہی اس کے ہنسنے پر متعجب تھے۔

"کچھ نہیں سر! بس عادتاً" ہنس رہا ہوں۔" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔

"عادتاً"۔۔۔؟" توصیف احمد کے ایک لفظ میں سوالیہ نشان موجود تھا۔ اب وہ بوکھلا کر بات بنانے کی کوشش کرنے لگا۔

"سر! وہ۔۔۔ بچپن میں جب مجھے چوٹ لگتی تھی اور کہیں سے خون نکل آتا تھا تو میں اپنی ماں کو پریشانی سے بچانے کی خاطر ہنسنے لگتا تھا۔ کیونکہ سر میری ماں خون دیکھ کر بہت پریشان ہو جاتی تھیں۔"

"لیکن تم۔۔۔ آئی مین! تمہیں بلڈ بینک سے معلوم کرنا چاہیے تھا۔" توصیف احمد نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

"سر! آپ معلوم کر چکے تھے نا! جب آپ کو نہیں ملا تو پھر مجھے کہاں سے ملتا؟ پھر یہ تو اچھا ہے سر! کہ میرا گروپ مل گیا۔ ورنہ جانے کہاں کہاں بھاگنا پڑتا۔"

توصیف احمد اس پر سے نظریں ہٹا کر اس بوتل کو دیکھنے لگے جس میں اس کا خون جمع ہو رہا تھا۔ ان کے پاس اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر احسان مندی کا تاثر شمشیر علی واضح دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریبہ اب اپنے آپ پر جھنجلا رہی تھی کہ اسے پہلے ہی توصیف احمد کو فون کرنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ بس یہ ہی سوچتی رہی کہ یاسمین اپنا سیل فون گھر چھوڑ گئی ہے۔ لیکن اس میں اس کا قصور بھی نہیں تھا۔ پریشانی میں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ بہرحال جب توصیف احمد سے بات کر کے اور ان کے اطمینان دلانے پر اس کا تڑپتا مچلتا دل ٹھہر گیا۔ تب اسے چائے کی شدید طلب ستانے لگی۔ ذہن سے بوجھ اترا تو سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔

اس نے پہلے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر کچن میں آگئی۔ چائے بنانے تک اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ چائے پیتے ہی ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بن گیا۔ لیکن کسی ایک سوچ پر اس کی گرفت نہیں ہو پا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے ہر بات اس کے لیے معمہ ہے۔ جسے حل کرتے کرتے اس کی زندگی تمام ہو جائے گی۔ پھر بھی وہ اندھیرے میں رہے گی۔

کوئی ایسی بات ہے جو رشتوں کا تقدس پامال کر رہی ہے اور وہ شاید سارہ جانتی ہے۔ لیکن وہ راز کیوں بن گئی ہے۔ اس کے ساتھ شیئر کیوں نہیں کرتی۔ سوچتے ہوئے وہ پھر الجھنے لگی تو اس نے سر جھٹک دیا اور وضو کر کے جاء نماز بچھالی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

نماز سے جہاں اسے سکون ملا۔ وہیں نیند بھی مہربان ہو گئی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ وہیں جاء نماز پر ہی سو گئی۔

پھر بی بی نے اسے اٹھایا تھا۔ وہ اسے بیڈ پر سونے کا کہہ رہی تھیں۔ لیکن وہ یکلخت بیدار ہو گئی۔

"نہیں بی بی! مجھے اسپتال جانا ہے۔ آپ جلدی سے چائے بنا دیں۔"

"بیٹا! سارہ کیسی ہے؟" بی بی بہت فکر مند تھیں۔

"پتا نہیں بی بی! جا کر دیکھوں گی تو پتا چلے گا۔" اس نے کہتے ہوئے وارڈ روب کھول لی اور اپنا سوٹ نکال کر واش روم میں بند ہو گئی۔

پھر تقریباً" آدھے گھنٹے بعد وہ سارہ کے پاس پہنچ گئی تھی۔ سارہ آنکھوں پر بازو رکھے جانے سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ یاسمین نے اشارے سے اسے سارہ کو چھیڑنے سے منع کیا تو وہ یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر آگئی۔

"ہوش آیا سارہ کو۔۔۔؟"

"ہاں! صبح ہوش میں آئی ہے۔ لیکن بیٹا! ڈاکٹر نے اس سے کوئی بھی بات کرنے سے منع کیا ہے۔ تم ابھی اس سے کچھ مت پوچھنا۔" یاسمین نے کہا تو وہ فوراً" بولی۔

"میں سمجھتی ہوں مما! اور اب مجھے سارہ سے کچھ پوچھنا بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ یاسمین ٹھٹک گئی۔

"بیٹا۔۔۔!"

"آپ گھر جائیں مما!" اس نے یاسمین کو بولنے نہیں دیا۔ "بہت تھک گئی ہوں گی آپ اور ہاں! ڈیڈی کہاں ہیں؟"

"تمہارے ڈیڈی کو میں نے ابھی گھر بھیجا ہے۔" یاسمین نے بتایا تو وہ کہنے لگی۔

"آپ بھی ڈیڈی کے ساتھ چلی جاتیں۔ میں آ تو رہی تھی۔ خیر! اب میں سارہ کے پاس ہوں۔ آپ جائیں مما! دو تین گھنٹے کی نیند لے لیں۔ ورنہ بیمار پڑ جائیں گی۔"

"نہیں پڑتی بیمار اور میں صبح یہاں دوسرے بیڈ پر سو گئی تھی۔ البتہ تمہارے ڈیڈی نہیں سوئے تھے۔ جب ہی میں نے زبردستی انہیں بھیجا ہے۔ میں ٹھیک ہوں بیٹا!" یاسمین کسی طرح جانے پر آمادہ نہیں ہوئی تو وہ خاموش ہو گئی۔ پھر کمرے میں آکر چپ چاپ سارہ کو دیکھے گئی۔ سارہ کا ایک بازو ہنوز آنکھوں پر دھرا تھا۔ دوسرے ہاتھ پر ڈرپ لگی تھی۔ عقب سے یاسمین نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تب اس نے چونک کر یاسمین کو دیکھا تھا۔

"میں ابھی آتی ہوں مما۔۔۔!" وہ یاسمین کا بیٹھنے کا اشارہ نظر انداز کر کے بولی اور تیزی سے باہر نکل آئی۔

اس وقت وہ کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں سارہ کی آنکھوں پر رکھا بازو تھا جس کی صرف کلائی پر بندھی بینڈیج پر سرخ خون نظر آ رہا تھا۔ باقی رنگت سفید لٹھے کی مانند ہو رہی تھی۔ جس نے اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر دی تھیں۔ اس نے ٹائم دیکھ کر ہی گاڑی ساجدہ بیگم کے گیٹ پر روکی تھی۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اور اجلال رازی کچھ دیر میں آفس کے لیے نکلنے والا تھا۔ اس نے رازی کے نکلنے کا انتظار نہیں کیا اور سیدھی اندر چلی آئی۔

کچن سے نکل کر آتی ثنا نے اسے دیکھا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ حد درجہ ناگواری کا اظہار تھا۔

"رازی کہاں ہے؟" اس نے ثنا کی سکڑی پیشانی دیکھ کر ہی تیکھے لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟" ثنا بھی کم نہیں تھی۔

"یہ تم رازی سے پوچھنا کہ اریبہ کیوں آئی تھی۔ تمہارے کیوں کا جواب وہ دے گا۔" وہ زہر خند سا کہہ کر تیزی سے رازی کے کمرے کی طرف بڑھی اور پھر دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی تو اجلال رازی جو آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر حیرت میں گھر گیا۔

"تم۔۔۔ میرا مطلب ہے سب ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک۔۔۔!" اس کے لہجے میں حد درجہ کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ "جو گیم تم کھیل رہے ہو رازی! اس میں سب ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے۔ میں یا سارہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو تو مرنا ہی ہے۔ تم بتاؤ۔ کسے مرنا چاہیے۔ مجھے یا سارہ کو۔۔۔؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو اریبہ! ہوش میں تو ہو۔۔۔؟" رازی نے بہت ضبط سے اسے ٹوکا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی رازی! جب ایک شخص ایک ہی وقت میں دو سگی بہنوں کے ساتھ فلرٹ کر رہا ہو تو پھر وہ یہی چاہتا ہے کہ دونوں میں سے ایک مر جائے تاکہ دوسری کے ساتھ وہ دنیا دکھاوے کو شادی کر لے۔ کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ تمہیں اریبہ اور سارہ ایک ساتھ مل جائیں۔" اریبہ اب چوہے بلی کا کھیل ختم کرنا چاہتی تھی۔

رازی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ پھر اس کی پیشانی پر گہری لکیر کھینچ گئی تھی۔

"میں تمہاری بات کا کیا جواب دوں اریبہ۔۔۔! اگر تم اپنی حیا نیلام کر آئی ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کی غیرت کو للکارتی پھرو۔۔۔"

"تم۔۔۔!" وہ سناٹے میں آگئی۔

"ہاں میں اور صرف میں ہی نہیں سارا زمانہ تھوک رہا ہے تم پر۔ اتنے دن جانے کس کس کے ساتھ رہی ہو' کیا کرتی رہی ہو۔ اس کے بعد بھی آفرین ہے تم پر کہ ہاتھ میں آئینہ لیے پھرتی ہو۔ ارے پہلے اپنی صورت دیکھو پھر کسی اور کو آئینہ دکھانا۔۔۔ سمجھیں تم۔۔۔"

اجلال رازی نے ایک جھٹکے میں اسے پاتال میں دھکیل دیا تھا۔ وہ کتنی دیر نفی میں سر ہلاتی رہی پھر اس کی آواز پاتال سے ہی آئی تھی۔

"نہیں۔ کیسے سمجھ سکتی ہوں میں۔ کھرے کھوٹے کی پہچان ہوتی تو سمجھ پاتی کہ تمہارا اصل چہرہ کیا ہے۔ تم جو محبت کے صرف دعوے کرنا جانتے ہو۔ تمہاری لغت میں لفظ بھروسا اور اعتماد ہے ہی نہیں اور اعتماد نہیں ہے تو محبت کیسے ہو گی۔ واقعی تف ہے مجھ پر لیکن تم سن لو رازی!"

اس کی آواز اچانک تیز ہو گئی۔
"تم سارہ کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔ سارہ میری بہن ہے، میں اسے تمہارے ہاتھوں کھلونا نہیں بننے دوں گی۔ سمجھے تم۔"
وہ اپنی بات کہہ کر جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے پلٹی تھی کہ رازی نے ایک ہی جست میں اس کا راستہ روک لیا۔
"رکو اریبہ! تم بھی سنتی جاؤ۔ سارہ اور میرے بیچ مت آؤ۔ تم اگر اسے اپنی ضد بناؤ گی تو بہت بڑی غلطی کرو گی۔"
"شٹ اپ رازی۔!" وہ پوری قوت سے چیخی تھی۔ "یہ میری ضد نہیں اپنی ماں جائی کے ساتھ محبت ہے، جو میں اسے تم جیسے شخص سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ آئندہ اپنی زبان پر سارہ کا نام مت لانا۔ ہٹو سامنے سے۔"
"تم کیا سمجھتی ہو۔ جو تم چاہو گی ہمیشہ وہی ہو گا۔ نہیں اریبہ! تم اپنا وقار، اپنا اعتبار اور اپنی بات منوانے کا حق سب کھو چکی ہو۔ تمہارے لیے اب یہی بہتر ہے کہ تم خاموش تماشائی بن جاؤ۔ ورنہ ہر قدم پر منہ کی کھاؤ گی۔"
"یہ تو وقت بتائے گا کہ کون منہ کی کھاتا ہے۔" وہ اسے دھکیل کر نکلنا چاہتی تھی لیکن رازی نے اس کی کلائی پکڑ کر پیچھے کی طرف موڑ دی یوں کہ اس کی پشت رازی کے سینے سے جا لگی تھی۔
"کوئی بھی مرد ایک مشکوک کردار لڑکی کو بیوی نہیں بنا سکتا، ہاں وقت گزاری کی بات الگ ہے۔" اس نے نفرت انگیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔
"اف۔!" اس نے پورا زور لگا کر خود کو اس کی گرفت سے نکالا اور اس کی طرف گھوم کر انتہائی تاسف سے بولی۔
"تم اتنا گر سکتے ہو۔" وہ تنفر سے بولی۔
"ٹھیک کہا تھا سارہ نے تائی امی کی اولادیں وہ نہیں ہیں، جو نظر آتی ہیں اور تم۔ تم کبھی میرے قابل تھے ہی نہیں۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔ شدید نفرت۔ سنا تم نے میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔" وہ غصے سے کانپ رہی تھی۔
رازی نے ایک دم پورا دروازہ کھول دیا۔
"تم جا سکتی ہو۔"
"ہونہہ۔!" وہ انتہائی تنفر اور حقارت سے سر جھٹک کر کھلے دروازے سے نکل آئی اور تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھی عقب سے ساجدہ بیگم پکارتی رہ گئیں۔
"اریبہ۔ اریبہ رکو بیٹا۔"
وہ اب کہاں رکنے والی تھی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اسے رکنا کہاں ہے۔



رازی جانتا تھا کہ وہ کمرے سے نکلے گا تو ساجدہ بیگم اس کے انتظار میں کھڑی ہوں گی۔ صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ اریبہ آئی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی اور وہ ان سوالوں کے لیے تیار تو تھا لیکن جواب نہیں دے سکتا تھا اور کمرے میں بند رہ کر منہ چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا جس سے ساجدہ بیگم کے شک کو تقویت ملے۔ اس لیے خود کو نارمل ظاہر کرنے کے ساتھ اس نے خود پر عجلت بھی سوار کر لی تھی اور یوں کمرے سے نکلا جیسے بہت لیٹ ہو رہا ہو۔
"رازی!" واقعی ساجدہ بیگم موجود تھیں اسے دیکھتے ہی پکارا۔
"امی! میں پہلے ہی بہت لیٹ ہو گیا ہوں۔ واپس آ کر بات کروں گا۔" وہ کہتے ہوئے رکے بغیر سیدھا باہر نکل

آیا۔ پھر آفس پہنچتے ہی اس نے سارہ سے بات کرنے کی غرض سے توصیف ولا فون کیا تو ادھر سے بی بی نے فون اٹھایا تھا۔
"بی بی! سارہ کو فون دیں۔" اس نے بی بی کی آواز سنتے ہی کہا۔
"سارہ تو ابھی اسپتال میں ہی ہے۔" بی بی نے بتایا تو وہ چکرا گیا۔
"اسپتال میں؟ خیریت؟ کیا ہوا ہے بی بی؟"
"آپ کو نہیں پتا؟ سارہ نے کل اپنی کلائی کی نس کاٹ لی تھی۔ تب سے اسپتال میں ہے۔ میں تو خود بہت پریشان ہوں۔ پتا ہی نہیں چل رہا کیا حال ہے بچی کا۔" بی بی بولے جا رہی تھیں اور وہ جیسے سن کر بھی نہیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دائرے بننے لگے۔ جن میں کبھی اریبہ کا چہرہ ابھرتا تھا اور کبھی سارہ کا۔
"او مائی گاڈ!" اس نے ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔
"جو گیم تم کھیل رہے ہو رازی! اس میں سب ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے۔ میں یا سارہ۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو تو مرنا ہی ہے۔ تم بتاؤ! کسے مرنا چاہیے؟ مجھے یا سارہ کو؟"
اریبہ کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسپتال جانے کا سوچ کر گاڑی کی چابی اٹھائی تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں جائے۔ سارہ جانے کون سے اسپتال میں تھی۔ بی بی سے پوچھنا فضول تھا اور توصیف احمد کا خیال آنے پر وہ خائف ہو گیا تھا کہ انہوں نے اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔
"کہیں سارہ نے تو۔" وہ سوچتے ہوئے دہل گیا۔ حقیقتاً" اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ تقدیر نے پانسا پلٹ دیا تھا۔ ایک بار اریبہ انگوٹھی واپس کر گئی تھی۔ تب سب اس کے ساتھ تھے اور اب وہ تنہا تھا۔ شاید قدرت نے اس کے لیے یہ ہی سزا منتخب کی تھی۔ سزا کاٹے بنا اس کا گناہ معاف ہونے والا نہیں تھا۔ وہ یہ ہی سوچ رہا تھا۔ پھر ساری ہمتیں یکجا کر کے بھی توصیف احمد کو فون کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔
"یس۔!" توصیف احمد کا "یس" بے دھیانی لیے ہوئے تھا۔
"چچا جان! آپ کہاں ہیں؟" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پوچھا۔
"کیوں؟ کیا بات ہے؟" توصیف احمد کے لیے دیے انداز پر وہ مزید کمزور پڑ گیا۔

"وہ۔ میں نے ابھی گھر فون کیا تھا تو معلوم ہوا سارہ۔۔۔"

"ہاں! سارہ ٹھیک ہے۔" توصیف احمد نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

"کون سے اسپتال میں ہیں آپ؟ میں آرہا ہوں۔"

"نہیں بیٹا! ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے نکلنے والے ہیں۔"

"اچھا! میں پھر گھر آجاؤں گا۔" اس نے ہمت کرکے کہا۔ لیکن ادھر سے سلسلہ منقطع ہوچکا تھا۔ اس نے ڈھیلے ہاتھ سے ریسیور چھوڑ دیا۔ اب اسے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ دیر پہلے اریبہ پر اچھالا جانے والا کیچڑ خود اس پر آن گرا ہو۔ اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔



شمشیر علی اتنا کمزور نہیں تھا کہ دو بوتل خون دے کر نڈھال ہو جاتا۔ بس کچھ کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ بہر حال رات خون دینے کے بعد وہ تاجور کی وجہ سے گھر چلا آیا تھا۔ پھر صبح تگڑا ناشتا کرکے آفس بھی آگیا۔ لیکن اس کا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بہت مشکل سے اس نے کچھ ضروری کام نمٹائے۔ پھر سارہ کی خیریت معلوم کرنے اسپتال چلا آیا۔ اصل میں تو اس کا دھیان ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ اگر مزید خون کی ضرورت ہوگی تو وہ کہیں سے انتظام کردے گا۔ کیونکہ رات اس نے توصیف احمد کو خاصا کمزور دیکھا تھا اور وہ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ بھی کرسکتا تھا۔

"تم کیسے ہو شمشیر علی؟ ابھی تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔" توصیف احمد نے اسے دیکھتے ہی کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں سر! اور اس لیے آیا ہوں کہ اگر مزید بلڈ کی ضرورت ہو تو۔۔۔"

"او نو نو۔۔۔ اللہ کا شکر ہے، میری بیٹی اب کافی بہتر ہے۔"

"سر! کچھ اور چاہیے تو بتائیے میں لا دیتا ہوں۔"

"ہاں!" توصیف احمد سوچنے لگے۔ اسی وقت اس نے یاسمین کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر چہرہ دوسری طرف موڑا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ ادھر سے اریبہ آرہی تھی۔ اس نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اریبہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے پھر بھی وہ تیز چل رہی تھی اور اسی تیزی سے آکر وہ توصیف احمد کے سینے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"اریبہ!" توصیف احمد پریشان ہوگئے۔ "کیا ہوا بیٹا؟"

"کیا ہوا میری بچی کو؟" یاسمین جو شمشیر علی کی وجہ سے کمرے سے نکلتے ہی رک گئی تھی تیزی سے آگے آئی۔

"اریبہ! کیا ہوا بیٹا؟ کہاں چلی گئی تھیں تم؟" یاسمین اریبہ کو اپنی طرف کھینچنے لگی۔

شمشیر علی کو اپنی وہاں موجودگی کھلنے لگی تو وہ غیر محسوس طریقے سے دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ پھر دیوار سے لگ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ جو بہت مضبوط نظر آتی تھی اس وقت بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ جانے بہن کی وجہ سے رو رہی تھی یا کوئی اور بات۔

"کوئی اور بات۔" شمشیر علی کے دل پر بوجھ آن گرا۔ اور جو بھی بات ہوگی اس کا ذمہ دار وہ ہوگا۔

اس لڑکی پر ساری قیامتیں میری وجہ سے ٹوٹ رہی ہیں اور شاید اب اس کی ہمت جواب دے گئی ہے، جو دھڑلے سے کہتی آرہی تھی کہ میرے ساتھ جو بھی مسئلہ ہوگا، میں خود نمٹ لوں گی، لیکن اب یہ تھک گئی ہے

شاید۔ کیا میں نے اس کے ساتھ اتنا برا کیا ہے؟ وہ اریبہ کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں خود سے بولے جا رہا تھا۔

توصیف احمد اریبہ کو اپنے ساتھ لگائے کمرے میں لے گئے۔ پھر کمرے کا دروازہ بند ہو گیا تو اسے وہاں رکنا مناسب نہیں لگا۔ دل پر ایک اور بوجھ لیے وہ اسپتال سے نکل آیا۔ آفس میں پہلے ہی کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا' اس لیے اس نے گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔ اسے اریبہ کا رونا بری طرح محسوس ہو رہا تھا اور وہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ اب جب اس کی بہن کافی بہتر ہے تو پھر وہ کیوں رو رہی تھی۔ اسے گزری شام یاد آئی۔ جب وہ شاپنگ مال میں اس کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس وقت اریبہ نے بتایا تھا کہ اس نے ساری شاپنگ اپنی بہن سارہ کے لیے کی ہے۔ سارہ اس سے ناراض ہے اور یہ اسے منانے کے جتن ہیں۔

"ایسی بھی کیا ناراضی کہ سارہ نے اپنی جان پر کھیلنے کی سعی کر ڈالی۔" وہ سوچتے ہوئے الجھنے لگا اور ایسے ہی الجھے ذہن کے ساتھ اس نے کمپاؤنڈ میں گاڑی پارک کی' پھر اترتے ہوئے اس نے دیکھا تاجور بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا' لیکن جب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی نظر سامنے والے اپارٹمنٹ کی بالکونی میں کھڑے لڑکے پر پڑی تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ لڑکا اشاروں میں بات کر رہا تھا اور اس طرف تاجور تھی۔

"یا اللہ!" اس نے دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو یقیناً ''ڈھے جاتا۔ اسے اب پتا چلا تھا' دوسروں پر ٹوٹنے والی قیامتوں کا درد سننا کتنا آسان ہوتا ہے۔ خود پر بیتے تو سہا نہیں جاتا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا تھا' اریبہ کے قدم ڈگمگا رہے تھے' پھر بھی وہ تیز چل رہی تھی اور وہ مرد تھا۔ اس کے قدم اٹھ کے نہیں دے رہے تھے۔ بمشکل ایک ہاتھ سے دیوار اور دوسرے ہاتھ سے ریلنگ کا سہارا لے کر وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے اوپر آیا تو دل چاہا ماسٹر کی سے دروازہ کھول کے ایک دم تاجور کے سر پر جا کھڑا ہو۔۔۔ مگر اس کے بعد سر اٹھا کر چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا۔

قدرت بھی انسان کو کیا' کیا دکھاتی ہے۔ تاجور کی جگہ کوئی اور ہوتی تو یہ نظارہ اس کے لیے دلچسپ ہوتا۔ اب تو روح پر آریاں چل رہی تھیں۔ چابی جیب میں رکھ کر اس نے بیل کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ دروازہ کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن اس پر صدیاں بیت گئی تھیں۔

"بھائی! آپ جلدی آ گئے؟" تاجور اپنی فطری معصومیت سے بولی۔

"کیوں' نہیں آنا چاہیے تھا؟" وہ بے اختیار کہہ گیا۔

"کیوں نہیں بھائی! میں تو دعا کر رہی تھی کہ آپ آ جائیں' میں نے آپ کی پسند کا لوکی گوشت پکایا ہے۔" تاجور نے کہا تو وہ کوشش کے باوجود اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ معصومیت مسخ ہو کر کتنی بھیانک ہو جاتی ہے' اس میں دیکھنے کا یارا نہیں تھا۔

"کھانا نکالوں بھائی؟" تاجور نے اس کی خاموشی محسوس نہیں کی۔

"ابھی نہیں۔" وہ کہہ بالکونی میں آ گیا۔ سامنے اب وہ لڑکا موجود نہیں تھا۔

"کیا ہوا بھائی؟" تاجور کی اب سہمی ہوئی آواز آئی تھی۔ وہ جواب دیے بغیر پلٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کے بدن میں شرارے بھر گئے تھے۔ لیکن ہمیشہ سے اس کی عادت تھی کہ وہ غصے میں بات نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا تھا۔



اجلال رازی ساجدہ بیگم کو خالدہ کے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا اور جانے اس نے سارہ کے بارے میں انہیں کیا بتایا تھا کہ وہ پریشان ہو گئی تھیں۔ دل کے ہاتھوں مجبور تھیں۔ گھریلو رنجشیں اور ناچاکیاں اپنی جگہ' وہ کسی کا برا

نہیں سوچتی تھیں۔ اس لیے سارہ کا سن کر وہ رازی سے یہ تو نہیں کہ سکیں کہ انہیں اسپتال لے جائے۔ اس لیے نہیں کہ توصیف احمد نے انہیں اطلاع نہیں دی تھی' بلکہ انہیں یہ خیال تھا کہ شاید توصیف احمد اس واقعے کو چھپانا چاہتے ہیں' جب ہی وہ خالدہ کے پاس آ گئی تھیں کہ توصیف احمد سے بھی یہیں ملاقات ہو جائے گی۔

"کیا ہوا ہے سارہ کو؟" انہوں نے خالدہ سے پوچھا تو اس کی تشویش الگ تھی۔

"پتا نہیں آپا! رات توصیف بس اتنا کہہ کر گئے تھے کہ سارہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ پھر صبح گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آئے تھے' پھر وہیں چلے گئے' مجھے تو لگ رہا ہے آپا! یاسمین اب ان ہی بہانوں سے توصیف کو اپنی طرف کھینچنا چاہ رہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے' لیکن یہ بھی سچ ہے کہ سارہ کو کچھ ہوا ہے' وہ اسپتال میں ہے۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو خالدہ ناگواری سے بولی۔

"اچھا' ان لڑکیوں کو اسپتال راس آ گیا ہے کیا' کبھی ایک جاتی ہے' کبھی دوسری۔"

"بس اللہ رحم کرے۔" ساجدہ بیگم نے خالدہ کی کیفیت سمجھتے ہوئے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا۔

"آپ اسپتال سے آ رہی ہیں کیا؟" خالدہ نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ اب اسپتال جانے کی میری ہمت نہیں ہے۔ مریضوں کو دیکھ دیکھ کر میری اپنی حالت غیر ہو جاتی ہے اور توصیف ولا میں جانا نہیں چاہتی' اس لیے تمہارے پاس آئی ہوں کہ توصیف سے یہیں سارہ کی خیریت معلوم کر لوں گی۔" ساجدہ بیگم نے طریقے سے بات بنا دی تھی۔

"دیکھیں توصیف کو کب فرصت ملتی ہے۔" خالدہ بہت شاکی ہو رہی تھی۔

"اچھا۔۔۔ تم نہ دل برا کرو۔ یاسمین کچھ بھی کرے' کوئی بھی حربہ استعمال کرے' توصیف اس کی طرف لوٹنے والے نہیں ہیں' بس بچیوں کی وجہ سے مجبور ہیں۔ ظاہر ہے اولاد ہے وہ بھی بیٹیاں' جب تک اپنے گھر بار کی نہیں ہو جاتیں توصیف آرام سے نہیں ہو سکتے۔" ساجدہ بیگم نے خالدہ کو تسلی دیتے ہوئے سمجھایا تو وہ جل کر کہنے لگی۔

"اپنے گھر بار کی۔۔۔ آپا! اب کون کرے گا ان لڑکیوں سے شادی۔ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ دیکھیے گا' بیٹھی رہیں گی ساری زندگی ماں کے کلیجے سے لگ کر اور نہ خود چین سے رہیں گی' نہ ہمیں رہنے دیں گی۔"

"اللہ سے خیر مانگو خالدہ! لڑکیوں میں خدانخواستہ کوئی عیب نہیں ہے۔" ساجدہ بیگم نے ٹوک کر کہا۔

"عیب نہیں ہے' عزتیں گنوا بیٹھی ہیں۔ اس سے بڑا عیب اور کیا ہو گا۔"

"اچھا بس چپ ہو جاؤ۔ کم از کم تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" ساجدہ بیگم نے ٹوک کر کہا۔ ساجدہ بیگم پریشان ہو گئی تھیں' شاید اس لیے کہ رازی ابھی بھی سارہ سے شادی پر بضد تھا۔

"مجھے تو اب اپنے بچوں کی فکر ہو رہی ہے آپا! پتا نہیں یاسمین۔۔۔" خالدہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ توصیف احمد کو آتے دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی۔ جبکہ توصیف احمد' ساجدہ بیگم کو دیکھ کر ٹھٹکے تھے۔

"السلام علیکم!" خاصا نروٹھا انداز تھا۔

"کیسی طبیعت ہے سارہ کی؟" ساجدہ بیگم سلام کا جواب دینا بھول گئیں۔

"جی۔۔۔ اب تو بہتر ہے۔" توصیف احمد کو جیسے ناچار وہیں بیٹھنا پڑا تھا۔

"شکر ہے۔۔۔ ابھی کہاں اسپتال میں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ دوپہر میں ہی گھر آ گئی تھی۔" توصیف احمد جیسے بادل نخواستہ جواب دے رہے تھے۔

"تو مجھے پتا ہوتا تو میں وہیں چلی جاتی' تم نے بتایا بھی نہیں۔" ساجدہ بیگم نے طریقے سے شکوہ بھی کر ڈالا۔

"بس بھابھی جان! اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ آپ ناحق پریشان

ہو تیں۔" توصیف احمد ان پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔
"ہوا کیا تھا؟"
"بس وہ کچن میں سبزی کاٹ رہی تھی تو نس پر چھری لگ گئی۔ نس کٹنے سے کافی خون بہہ گیا تھا۔"
"اوہ۔۔۔!"
"خالدہ چائے۔۔۔ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" توصیف احمد غالباً" اس موضوع سے بچنے کی خاطر اٹھ کر چلے گئے۔
"بس آپا! اب کوئی بات مت کیجئے گا۔" خالدہ نے بھی توصیف احمد کا نروٹھا انداز محسوس کر کے کہا' پھر کچن میں جانے لگی تھی کہ ساجدہ بیگم اسے روک کر بولیں۔
"خالدہ! ڈرائیور سے کہو مجھے گھر چھوڑ آئے۔"
"کیوں آپا! رات کا کھانا کھا کر جائیے گا۔"
"نہیں۔۔۔ گھر میں ثنا اکیلی ہے' رازی بھی پتا نہیں کب آئے گا۔" ساجدہ بیگم اب یہاں آکر پچھتا رہی تھیں۔ انہیں ہر گز امید نہیں تھی کہ توصیف احمد اس طرح ملیں گے۔
"پھر بھی آپا! چائے تو توصیف کے ساتھ پی لیں' نہیں تو وہ برا مانیں گے۔" خالدہ کی بات ٹھیک تھی۔ ساجدہ بیگم خاموش ہو گئیں لیکن جب توصیف احمد نے چائے اپنے کمرے میں ہی منگوالی' تب انہوں نے خالدہ کا بھی خیال نہیں کیا اور چائے پیئے بغیر ہی چلی آئیں۔
ادھر رازی ان کے فون کے انتظار میں بیٹھا تھا' انہیں دیکھ کر اچنبھے میں گھر گیا۔
"آپ کیسے آئی ہیں امی؟"
"خالدہ کا ڈرائیور چھوڑ گیا ہے۔" ساجدہ بیگم رازی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھیں۔
"کیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ مجھے فون کر دیتیں۔ میں تو انتظار میں بیٹھا تھا۔"
"ہاں مجھے پتا ہے' تم اسی انتظار میں بیٹھے تھے' لیکن کوئی ضرورت نہیں تھی وہاں جانے کی' توصیف کو بلانا ہوتا تو رات میں ہی نہیں بلا لیتے۔ جب وہ نہیں چاہ رہے تو۔۔۔" ساجدہ بیگم مزید منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔
"کیا نہیں چاہ رہے چچا جان! کچھ کہا ہے انہوں نے آپ سے' بتائیں نا امی؟" رازی ان کے پاس بیٹھ گیا۔
"کیا بتاؤں' تمہیں خود سمجھ لینا چاہیے' ہر معاملے میں سب سے پہلے تم ہی بلائے جاتے تھے' اب نہیں بلائے گئے تو سمجھ لو کہ صرف تمہارا اور اریبہ کا رشتہ ہی ختم نہیں ہوا' باقی رشتے بھی ختم ہو گئے۔"
ساجدہ بیگم نے ناراضی سے کہہ کر ایک طرح سے رازی کو یہ بھی باور کرانا چاہا کہ وہ سارہ کا خیال دل سے نکال دے اور وہ نادان نہیں تھا' ان کا اشارہ سمجھ کر ہونٹ بھینچ گیا' کیونکہ یہ بحث کا وقت نہیں تھا۔



"تمہیں تو پتا ہے سارہ! میں کتنی پاگل ہوں' ہمیشہ سے' غصے میں میری مت ماری جاتی ہے' پھر میں کچھ نہیں دیکھتی' کچھ نہیں سوچتی' ایسے ہی عالم میں' میں نے تمہیں جانے کیا کچھ کہہ دیا تھا' مجھے معاف کر دو۔" اریبہ' سارہ کے پاس انتہائی نادم بیٹھی تھی۔
"لیکن تمہیں یہ بھی تو پتا ہے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں' جان دیتی ہوں تم پر' پھر تم نے ایسی حرکت کیوں کی؟ قسم سے تمہیں کچھ ہو جاتا تو تم سے پہلے میں مر جاتی۔" سارہ کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں تو وہ اس کا ہاتھ چوم کر بولی۔

"رونا مت ورنہ میں تم سے زیادہ رووں گی۔" سارہ پلکیں جھپکنے لگی۔

"میں سمجھ گئی ہوں سب کو پورے خاندان کو ہمارا گھرانہ کھٹکتا ہے۔ اس لیے جس کا بس چلتا ہے یہاں چنگاری پھینک دیتا ہے کہ ہم میں باہمی محبت اور اتفاق نہ رہے' ایسا ہی ہے نا؟" اس نے اپنی بات کی تصدیق چاہی تو سارہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور تم نے ٹھیک کہا تھا' تائی امی کی اولادیں وہ نہیں ہیں جو نظر آتی ہیں' بالکل ٹھیک کہا تھا تم نے' پتا نہیں میں کیوں نہ سمجھی رازی' رازی' رازی' اف' مجھے اب اپنے آپ پر غصہ آرہا ہے' میں اس شخص کے خواب دیکھتی تھی جو سچ تو یہ ہے میری نفرت کے قابل بھی نہیں۔ یہ محبت کے بلند بانگ دعوے کرنے والا کہتا ہے کہ میں اتنا عرصہ جانے کس کس کے ساتھ رہی ہوں' یہ ہے اس کی سوچ۔" اریبہ کیونکہ جذبات میں مسلسل بولے جارہی تھی' اس لیے وہ بات بھی کہہ دی جو اگر وہ اپنے آپ میں ہوتی تو کبھی نہ کہتی۔

"یہ۔۔۔ یہ تم سے رازی بھائی نے کہا؟" سارہ کو اس کی آخری بات سے شدید دھچکا لگا تھا۔

"ہاں۔۔۔ اور بھی بہت کچھ کہا۔" وہ آزردگی میں گھر گئی تھی۔ "اور اس کی دیدہ دلیری دیکھو' اس کے بعد بھی وہ اس گھر سے ناتا جوڑنا چاہتا ہے۔ میں نہیں تو تم' نہیں سارہ! تم اتنی ارزاں نہیں ہو کہ رازی کی خواہش کی بھینٹ چڑھ جاؤ' ایسا تو میں کبھی ہونے نہیں دوں گی۔"

"اریبہ۔۔۔!" سارہ نے پریشان ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ایسی باتیں مت کرو' تم اگر چاہتی ہو میں زندہ رہوں تو بھول جاؤ سب اور یہ یقین رکھو کہ میں بھی رازی سے اتنی ہی نفرت کرتی ہوں جتنی کہ تم' بلکہ شاید تم سے بھی زیادہ۔"

اریبہ نے سارہ کا ہاتھ دبا کر اثبات میں سر ہلایا' پھر اس موضوع سے ہٹتے ہوئے اپنے لہجے میں اشتیاق سمو کر کہنے لگی۔

"اچھا ہاں سارہ! تمہیں پتا ہے' تمہاری رگوں میں کس کا خون دوڑ رہا ہے۔"

"کیا مطلب؟" سارہ بالکل نہیں سمجھی تھی۔

"مطلب یہ کہ اسپتال میں جب تمہارے لیے بلڈ کی ضرورت پڑی تو شمشیر علی نے اپنا خون دیا تھا۔" اریبہ نے بتایا تو سارہ کو نام سے یاد نہیں آیا۔

"شمشیر علی!" وہ سوالیہ نظروں سے اریبہ کو دیکھنے لگی تھی۔

"تاجور کا بھائی۔"

"اوہ۔۔۔ وہ وہاں کیسے آگیا؟" سارہ نے اب سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ڈیڈی کے آفس میں ہوتا ہے نا' تو شاید ڈیڈی نے ہی اسے بلایا ہوگا' مجھے بھی مما سے پتا چلا ہے۔" اریبہ نے بتایا تو سارہ مسکرا کر رہ گئی۔

"ویسے سارہ! ایک بات ہے' تمہیں بہت شوق تھا نا کہ تمہارا بڑا بھائی ہوتا' جسے تم بھائی جان کہتیں' تو اللہ نے تمہاری خواہش پوری کردی ہے' شمشیر علی سے تمہارا خون کا رشتہ بن گیا ہے' اب اسے بھائی جان کہہ کر اپنا شوق پورا کرلینا۔" اریبہ بہت محظوظ ہو کر بول رہی تھی' سارہ کو ہنسی آگئی۔

"میں غلط نہیں کہہ رہی' چلیں گے تاجور کے پاس' شمشیر علی کا شکریہ بھی ادا کریں گے اور تم تاجور سے بھی مل لینا۔"

سارہ نے ہنس کر سر ہلایا۔

"گڈ۔۔۔ ایسے ہی ہنستی رہا کرو۔" اریبہ نے پیار سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا تو وہ اس کے گلے لگ گئی۔

"تم بہت اچھی ہو اریبہ!"



شمشیر علی سچ مچ ڈھے گیا تھا۔ اس کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی' تین دن ہوگئے تھے' وہ آفس بھی نہیں جارہا تھا اور مستقل تو وہ تاجور کے پہرے پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' وہ کیا کرے' تاجور کو واپس ابا کے پاس چھوڑ آئے' لیکن وہاں بھی تو وہ محفوظ نہیں تھی۔

"پھر کیا کروں؟" سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہوگیا تھا اور اسے تاجور کی اب ہر حرکت مشکوک لگنے لگی تھی۔ اچھا بھلا انسان شک میں مبتلا ہو کر کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر یہاں محض اس کا شک نہیں تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس کے بعد آنکھیں بند نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ تاجور کو تنبیہہ کیسے کرے' اس مقام پر اسے اپنی اماں شدت سے یاد آنے لگی تھی۔ مائیں ہی بیٹیوں کی محافظ ہوتی ہیں۔ وہ یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"میں اپنے ہاتھوں سے تاجور کا گلا دبادوں گا۔" اس کا ڈپریشن حد سے سوا ہوگیا تھا' تین دنوں سے وہ مسلسل ایک ہی بات سوچ رہا تھا اور اب اسے لگا جیسے اس کا یہی حل ہے۔

"ہاں۔۔۔ میں تاجور کو بے آبرو نہیں ہونے دوں گا۔ مار ڈالوں گا اسے۔" اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا' تب ہی تاجور آکر بولی تھی۔

"بھائی! آٹا ختم ہوگیا ہے۔"

اس نے سن کر بھی جیسے نہیں سنا تھا' سرخ آنکھوں سے تاجور کو دیکھے گیا۔

"بھائی۔۔۔!" تاجور اس کی سرخ آنکھوں سے ڈر گئی۔ "کیا ہوا ہے بھائی' آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ادھر آؤ۔" اس نے بلایا تو تاجور اس کے پاس آگئی۔

"سر دبادوں بھائی!"

"نہیں' بیٹھو۔" اس نے تاجور کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیا اور دوسرا ہاتھ پہلے اس کے سر پر رکھا' پھر آہستہ آہستہ گردن تک لے آیا۔

تاجور کچھ الجھ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں مرنے سے ڈر تو نہیں لگتا۔" اس نے پوچھا تو تاجور روہانسی ہوگئی۔

"لگتا ہے بھائی! بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کیوں۔۔۔ مرنا تو ہے' سب کو مرنا ہے' میں بھی مرجاؤں گا۔"

"اللہ نہ کرے بھائی! اللہ آپ کو میری عمر لگادے' آپ ہمیشہ جئیں۔" تاجور رونے لگی۔

تب ہی ڈور بیل جھنجھنا اٹھی' تو وہ ایک دم تاجور کو چھوڑ کر اٹھ گیا اور جا کر دروازہ کھولا تو اریبہ اور سارہ کھڑی تھیں' وہ پریشان ہوگیا۔

"آپ۔۔۔؟"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

آسیہ رزاقی



پرانے زمانے میں اردو ادب کے رسیا مصنف حضرات اپنے دور کے ہم عصروں کے تذکرے لکھا کرتے تھے۔ پھر پطرس بخاری نے دوستوں کے واقعات لکھ کر سب کو محظوظ کیا۔ خیر۔۔۔ ہم تو ان ادیبوں کے پیروں کی دھول بھی نہیں۔ (ادب کے لحاظ سے) مگر شوق کی کیا کہیے۔ کچھ نہ کچھ اوٹ پٹانگ لکھنے سے غرض 'پھر یہ کہ بذات خود ہمیں اس شوق نے اس لیے بھی اکسایا کہ چند نادر و نایاب ہستیوں سے واسطہ پڑ گیا۔ ان کے بارے میں اظہار کرنے کو دل بے چین سا ہو گیا۔ فکاہیہ ادب' مزاحیہ ادب' ہم اس میں کورے سہی' مگر شوق کا کوئی مول نہیں۔ یہ خطرہ بھی درپیش ہے کہ ہم سے پہلے کوئی اور انہیں اپنا موضوع بنا کر محفل ہی نہ لوٹ لے اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ ہم اناڑی سہی' مگر جن کو موضوع بنا کر سامنے لانا ہے' وہ ضرور اس قابل ہیں کہ ان کا تعارف ہو۔

جی ہاں۔۔۔ یہ ذکر خیر ہماری بھانجیوں کا ہے۔ (اور ان کی اولادوں کا بھی) (کہ اولادیں بھی ان سے کم قابل ذکر نہیں۔) اللہ کے فضل و کرم سے سب ایک سے بڑھ کر ایک منفرد کردار ہیں۔ نہ صرف بھانجیوں' بلکہ ان کی اولادوں کی بھی ہم خالہ جان ہیں۔ (خوش قسمتی سے)

بچپن میں بزرگوں کی زبانی کہانیاں سنی تھیں۔ ان کہانیوں میں غصیلا جن' یا ستم گر دیو بھی ضرور ہوتا تھا۔ شہزادی کی تلاش میں آنے والا آدم زاد جب جن یا دیو کے قبضے میں آجاتا' وہ انہیں "ماموں" کہہ کر خطاب کرتا' دیو یا جن بے چارگی سے کہتا۔

"اب تجھے کیا سزا دوں۔۔۔ تو' تو بھانجا ہے' لے جا شہزادی کو۔"

اس طرح شہزادی کی گلوخلاصی اس رشتے کے احترام میں ممکن ہو جاتی اور دشمنی رشتے کے تقدس میں تبدیل ہو جاتی۔

کاش! کبھی کسی دیونی' یا جننی نے بھی کہا ہوتا۔

"اے آدم زادی! اب تجھے کیا کہوں کہ میں تیری خالہ جان ہوں۔" اور دوستی پکی۔

دوستی تو یوں بھی ہماری اپنی سب بھانجیوں سے ہے' مگر۔۔۔ نہ ہم دیونی' نہ وہ۔۔۔ خیر! وہ بھی ہماری جیسی آدم زادیاں ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ اور اس اختلاف کا تقاضا ہے کہ تعارفی مضمون کا عنوان ہونا چاہیے۔

"نادر و نایاب و عجیب۔"

تو شروع کرتے ہیں 'اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے' جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

اس مضمون کے بعد جو ہوگا' اس کے ذمے دار قارئین ہوں گے' جن کی تفریح طبع اور دلچسپی کے لیے یہ منظر عام پر آنے والا ہے۔ (اللہ ہم پر مزید رحم کرے۔ آمین) اپنی معلومات دوسروں تک پہنچانا چغلی یا غیبت ہرگز نہیں' پھر بھی اللہ معاف کرے۔ اب ذرا ذکر ہو جائے بھانجی نمبرون (کہ ہر معاملے میں نمبرون ہیں) ان کو بچپن سے گم شدہ ہو جانے کا بہت شوق

ہے۔

عرصہ گزرا، ہم ایک جننگ فیکٹری میں تھے، جہاں ہمارے میاں صاحب مینجر تھے۔ یہ صاحبہ اپنی والدہ کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں۔ ہمارے گھر کے سامنے ہی کپاس کے ڈھیر پہاڑ کی صورت میں موجود تھے۔ جیسے کے ٹو برف کے انبار میں ڈھکی ہوئی۔ ہم بہنیں باتیں کرنے لگیں۔ یہ محترمہ کھیلتے کھیلتے باہر نکل گئیں۔ کافی دیر بعد بہن کو خیال آیا کہ یہ خاموشی معنی خیز ہے۔ ضرور کسی تخریب کاری میں مصروف ہوں گی یہ صاحبہ مگر۔۔۔ وہ تو گھر میں تھیں ہی نہیں۔ اب پریشانی اور اماں جان کے آنسو۔

ہمارے میاں کو خبر ہوئی۔ انہوں نے پہلا کام فیکٹری بند کروانے کا حکم دیا کہ بچی کسی خطرناک جگہ پہنچ کر نقصان نہ اٹھا بیٹھے۔ (یا کر بیٹھے۔)

پھر مزدوروں سے کہا۔ "کپاس کے پہاڑ کھود کر بچی کو برآمد کرو۔" مزدور بیلچے لے کر آئے۔ کئی پہاڑ تھے۔ ایک ایک کر کے کھودے گئے فرہاد نے تو پتھر کے پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر برآمد کی تھی یہ تو نرم روئی تھی۔

مزدور پہاڑوں سے نامراد اتر آئے بچی ہوتی تو ملتی۔ وہ تو ایک برقعہ پوش خاتون کے ہمراہ ان کے پیچھے چلتی ہوئی گیٹ سے نکل گئی تھی۔ یہ بات گیٹ کیپر نے حلیہ یاد آنے پر بتائی۔

اب اور فکر۔۔۔ بارے اعلان کروایا گیا، نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ شام کو ایک تانگے والا انہیں لے کر آیا۔ یہ محترمہ تفریح کی شائق تانگے میں جا کر بیٹھ گئیں۔ وہ پریشان انہیں لیے لیے پھرا۔ (سیر مفت کی) چھوٹا شہر تھا اور شرافت کا زمانہ، اس نے اعلان سنا اور فیکٹری کے گیٹ پر لا کر گیٹ کیپر سے سوال کیا۔

"یہ بچی کس کی ہے؟" غرضیکہ اندر گھر میں آئیں تو ایک ہاتھ میں برفی، دوسرے ہاتھ میں گڑ کی ڈلی، خوش بخوش۔

تانگے والے نے خاصی مدارات کی تھی، بسکٹ بھی کھلائے تھے، ان کی برآمدگی پر اماں جان مزید زار و قطار روئیں لپٹا کر۔

دوسری بار دودھ والا دودھ دے کر جا رہا تھا۔ یہ اس کے پیچھے بھی چلی گئیں۔ وہ تو سائیکل پر تھا۔ یہ جا، وہ جا، یہ سڑک پر سیدھی چلتی گئیں، بارے جلد ہی گمشدگی کی خبر مل گئی اور یہ مترگشت کرتی مل گئیں۔

اب تو وہ خاصی بڑی ہو گئی ہیں۔ (خاصی) نگران کا دل اب بھی کہیں بھی جانے کو ہمکتا ہے، ہر جگہ جانے کو تیار، فراخ دل، ذمہ دار۔ تحائف دینے کی شوقین مشورے دینے کی بھی، زندہ دل، ہنگامہ پسند، ہر محفل میں نمایاں (ویسے تمام بھانجیاں ہی مختلف خوبیوں کی بدولت ہر محفل میں نمایاں ہی رہتی ہیں، ماشاء اللہ) وسیع حلقہ احباب، فیشن سے گہرا شغف، بچپن سے سوئی دھاگے کے استعمال کا شوق تھا، علاوہ گم ہونے کے، اب اسی شوق کی بدولت ایک درزی خانہ چلا رہی ہیں۔

ہمیں ہر سال دو سوٹ اور چپل تحفے میں دیتی ہیں، سردی، گرمی کے الگ الگ، ہم کہتے ہیں بھئی پچھلے سال تم نے جو چپل دی تھی، ابھی وہ موجود ہے، اچھی حالت میں، دو، چار دفعہ ہی پہنی ہے۔ (مہنگی جو ہے)

وہ منہ سکوڑ کر کہتی ہیں، انتہائی حیرت اور پریشانی سے "ہائیں۔۔۔ خالہ جان، پھینکیں اسے، پرانی ہو گئی ہے، اب یہ نئی پہنیں۔"

پھینکنے میں شاید ہی ان کا کوئی ثانی ہو گا، کیونکہ ان کی دانست میں ہر چیز جو پرانی ہو، پھینک دینی چاہیے، یا کسی کو دے دینا چاہیے، وہ گھر کے پرانے برتن، دیگچیاں، پلیٹیں، کپڑے، غرض جو چیز دل سے اتر جائے، گیٹ کے باہر رکھ دیتی ہیں، خالی ڈبے، کشن وغیرہ تک رات کو رکھے، صبح گیٹ خالی۔

ان کی امی جب کراچی اپنے بیٹوں کے پاس جاتی ہیں، واپس آ کر اپنی "بیش قیمت" اشیا اور ضروری سامان کی تلاش کرتی ہیں۔

"وہ بڑی دیگچی نظر نہیں آ رہی، جس میں حلیم وغیرہ پکتا تھا۔"

"وہ۔۔۔ پھینک دی، پرانی ہو گئی تھی، کون رگڑتا۔"

"کروشیے کی بیڈ شیٹ کیا دھوبی کو دھلنے دے دی، غارت کر دے گا۔"

"اتنی پرانی تھی، بدرنگ، پھینک بھی دی۔"

"ائے ہئے۔" تعجب، مگر معلوم ہے۔

"اور وہ دیکھنا بادامی سلک کا کڑھائی والا سوٹ، اور وہ چھتی کے بکس میں تو نہیں رکھ دیا، الماری میں نظر نہیں آ رہا۔"

"امی! اتنے دنوں سے اسے پہنا نہیں تھا آپ نے، پرانا دھرا تھا۔"

"تو وہ اتنی مہنگی کڑھائی کا سلک کا سوٹ، خاص موقع پر ہی پہنا جاتا ہے۔"

"وہ میں نے شمیم کو دے دیا، بے چاری۔ اس کی نند کی شادی تھی، پہن لے گی۔"

"اے لو، ہائیں، وہ میری مسہری کہاں رکھ دی بھئی۔"

"ٹیلر ماسٹر کو دے دی، اسے ضرورت تھی، پرانے فیشن کی۔"

"پائپ کا پلنگ دھوپ میں بیٹھنے کے کام آتا تھا، چھت پر ہے؟"

"وہ۔۔۔ دھوبی کو دے دیا، اس کے کئی بچے ہیں، پلنگ دو ہی تھے۔"

"کچن میں فریزر تھا، اب تو جگہ بھی ہو گئی ہے، اسے کدھر رکھا۔"

"فلاں صاحب کو دے دیا۔"

"ائے ہئے پورا فریزر؟" انتہائی حیرت کا اظہار تھا۔

"تو آدھا کیسے کرتی؟" ادھر بھی حیرانی "نہیں ضرورت تھی، یہاں تو بس جگہ ہی گھیر رکھی تھی، بجلی بہت کھاتا تھا، سب نے اسے میز بنا رکھا تھا، ہر چیز الا بلا اس پر لاد دی جاتی تھی، نرا کباڑ۔"

گھر صاف ستھرا رکھنے کے شوق میں ہر چیز کی چھانٹی ہوتی رہتی، مگر پھر بھی، کوئی جگہ خالی نظر نہ آتی، لاؤنج میں، سیڑھیوں پر، ڈائننگ ٹیبل پر، صوفوں پر، بیڈ پر، سلے، ان سلے کپڑوں کا ڈھیر، شاپر بھرے ہوئے رکھے رہتے ہیں۔ (درزی خانہ)

ایک بار یہ اپنے بچوں کو لے کر لبرٹی گئیں۔ اتوار کا دن تھا۔ درزیوں کی چھٹی تھی، شام ہونے والی تھی، گھر بند کر کے احتیاطاً" دروازے پر چینی بڑا تالا بھی لگا دیا۔ دونوں لاک بند، پورچ کی لائٹ جلا کر گئیں، گیٹ بھی لاکڈ کر دیا، مگر لبرٹی جس خاص چیز کے لیے گئی تھیں، وہ ملی نہیں تو جلدی واپسی ہو گئی، ورنہ کھانے پینے اور شاپنگ میں دیر ہو ہی جاتی تھی، مگر اس دن بچوں کو گھر پر کچھ کام تھا، میچ دیکھنے یا ٹی وی پر کسی پروگرام دیکھنے کا۔ اپنے گیٹ کے قریب ایک لینڈ کروزر کھڑی دیکھ کر سوچا، پڑوس میں کوئی آیا ہو گا، بیٹے کو چابی دی کہ گیٹ اور پھر اندر کا لاک کھولے، پورچ کی لائٹ بند تھی، گیٹ کھلا تو گاڑی اندر لائیں، بیٹا دروازہ کھول رہا تھا، گھبرا کر بولا۔

"اماں۔۔۔ دروازے کا لاک تو ٹوٹا ہوا ہے۔"

چینی تالا لگا ہوا تھا، مگر عین نیچے چھینی، ہتھوڑی بھی پائی گئی، کوئی چوری کی نیت سے آیا، مگر چینی لاک نہ کھل سکا، پچھلی دیوار پھاند کر بھاگ گیا، اسی دوران لینڈ کروزر بھی بھاگ گئی۔ مارے ڈر کے باہر کھڑے کھڑے ریسکیو کو فون کیا، پندرہ منٹ میں پولیس آ گئی، ہم لوگ بھی آ گئے تھے، پولیس نے معائنہ کیا پھر چابی مانگی، دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے، ہم سب پیچھے تھے۔

وہی عام نظارہ، جو لاؤنج میں دیکھا جاتا تھا، یعنی صوفے پر، کپڑوں کے ڈھیر، ہر طرف کپڑے ہی کپڑے، پولیس نے ہر کمرا جھانکا، باتھ روم اسٹور کا جائزہ لیا، اوپر جا کر بھی سیر کی، نہیں کوئی چور نہ تھا، پولیس والے حیران تھے۔ اگر چور اندر نہیں آیا تو پھر یہ شاپر، پوٹلیاں، سلے ان سلے کپڑے، کمروں میں، بیڈ پر بھی کپڑے، آخر کس نے الماریوں سے نکال کر جگہ جگہ جمع کیے اور اگر آیا تھا۔ (خواہ مکھی بن کر ہی) تو مال کے کر گیا کیوں نہیں۔

"ہم نے "چوری نہیں ہوئی" کی یقین دہانی کرائی، شکریہ ادا کیا۔ بے یقینی اور حیرانی ان کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی، انہوں نے ایسا گھر اب تک کہاں دیکھا ہو گا، جہاں کپڑے، الماریوں، سوٹ کیسوں کے

بجائے، صوفوں، میزوں اور پلنگوں پر رکھے جاتے ہوں۔"

ہماری ان بھانجی کو بلند آواز میں بولنے کی عادت ہے، کوئی ڈھکی چھپی راز کی بات ان کو بتادی جائے، وہ راز نہیں رہتی، محلہ بھراس سے واقف ہوجاتا ہے کہ وہ اس خفیہ بات پر جو رائے زنی کرتی ہیں، وہ آس پاس کے گھروں میں بخوبی سنی جاتی ہے، ایک بار گلے میں تکلیف ہوئی، ڈاکٹر کے پاس گئیں، انہوں نے معائنے کے بعد ہدایتیں جاری کیں۔

"آپ کو کم بولنا، آہستہ بولنا چاہیے، ورنہ مستقل گلے کی خرابی کا شکار ہوں گی، اس تکلیف کا، یعنی ایسی گلے کی خرابی کا شکار عموماً" گلوکار ہوا کرتے ہیں، آپ بھی کم گایا کریں۔"

ان کے بیٹے کو اسکول میں ایک جملہ بنانے کے لیے لفظ دیا گیا۔ "بلند پایہ"

اس نے جملہ بنایا "میری اماں کی آواز بہت بلند پایہ ہے۔"

ان کا بیٹا کچھ بڑا ہوا تو اسے موسیقی سے دلچسپی ہوگئی، ماموں نے گٹار دلوادیا، اب ان کے کمرے سے کبھی مغربی موسیقی کی چیخ و پکار، کبھی مشرقی کلاسیکل گانوں کی آوازیں آتی ہیں، کبھی کبھار تو جنگ و جدل شمشیر و سناں کی جھنکاریں، درد انگیز فریادیں اور کبھی غصیلی چیخم دھاڑ بھی سنائی دیتی ہے۔ ایک بار ہم تو ڈر گئے کہ نہ جانے کس سے کشتم کشتا ہورہی ہے، یا کے بازی کے دور چل رہے ہیں۔ پتا چلا بیٹا مقابلے کے لیے پریکٹس کررہا ہے۔ لمز میں موسیقی کا پروگرام ہے، اسی سلسلے کی تیاری کررہا ہے، زور و شور سے۔

نتیجہ یہ کہ مغربی موسیقی کے مقابلے میں فرسٹ آئے اور مشرقی کلاسیکل پروگرام میں بہترین گلوکار کا انعام ملا۔ پھر وہ اولیول کے امتحان کی تیاری میں شدومد سے جت گئے۔ بند کمرے سے گٹار کے ساتھ دھینگا مشتی، چیخیں، ہاؤ ہو کی دہاڑیں، والدہ نیچے سے ہی چلائیں۔

"ارے کچھ پڑھ لے، نمبر کم آئے تو دیکھنا، گھر میں گھسنے نہیں دوں گی۔"

اور کبھی چند ایسی گالیوں سے بیٹے کو نوازا جاتا، جیسے صاحبزادے کسی الو گدھے کے خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ جب گالیوں سے منع کیا جاتا، تو عذر پیش کرتیں۔ "پڑھتا ہی نہیں ہے۔"

"نماز تو پڑھتا ہے۔" نانی فوراً" نواسے کی گواہی دیتیں۔ (جاء نماز ان ہی سے تو مانگنے آتا تھا۔)

ان صاحب زادے کی ایک بڑی بہن ہیں، بے حد معصوم، نرم دل، رحم دل، بلیاں گھر میں گھس کر کچن کی راہ لیں، دودھ یا گوشت چٹ کر جائیں، مارنا بھگانا درکنار، روکتی بھی نہیں، کھڑی دیکھتی رہتی ہیں۔

"بے چاری بھوکی ہیں۔" کہہ کر سب سے ہمدردی کی خواہش، حالانکہ ان کی اماں نے باقاعدہ بلیوں کا راشن مقرر کیا ہوا ہے۔ بازار سے روز مرغی والے سے درجن بھر سریاں (مرغی کے سر) لے کر آتی ہیں اور گیٹ کے پاس رکھ کر آواز لگاتی ہیں۔

"بلی... آجاؤ۔" بلی ایک نہیں، دس بارہ ہیں، جو خوب مزے کرتی ہیں۔ تو ذکر تھا بھانجی کی صاحب زادی کا، ایک زمانے میں (بچپن میں) یہ صاحبہ شرٹ پینٹ پہنا کرتی تھیں۔ ہم نے انہیں دوپٹے کے تحفے دینے شروع کیے، کبھی کامدانی کا دوپٹا، کبھی حیدر آبادی چنری، معصومیت سے پوچھا۔

"خالہ جان! آپ مجھے دوپٹے ہی کیوں دیتی ہیں۔"

ہم نے کہا "اس لیے کہ تم اوڑھنا شروع کرو، دوپٹا ہمارے معاشرے میں حیا کی علامت ہوتی ہے۔"

خیر اب تو وہ دوپٹا خوب لپیٹ کر اوڑھنے لگی ہیں۔

ویسے ان منحنی صاحب زادی کو لیڈری کا بھی شوق ہے، بچپن میں جس اسکول میں یہ پڑھا کرتی تھیں ——— وہاں ہماری چار عدد بھتیجیاں بھی پڑھتی تھیں، ان میں سب سے بڑی بہن تو واقعی سب کی لیڈر تھیں، اپنے بڑے پن کا فائدہ اٹھا کر ظاہری رعب داب سے چھوٹی بہنوں کا خوب دفاع کیا کرتی تھیں، کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی چھوٹی بہنوں کو کچھ کہہ سکے۔ بلکہ ان دونوں بہن بھائی کی بھی بزرگ بہن گئی تھیں۔ اگر کبھی کسی نے ان کو چھیڑا تو دوسرا فوراً" ڈراتا۔

"نوین آپی کو خبر ہوئی تو خیر نہیں، دوستی کرلو فوراً" وہ سب کی دھنائی کریں گی۔" اب یہ دونوں بہن بھائی رہ گئے۔ اسکول کے بچوں کو اب کسی آپی کا ڈر نہ رہا، ان کے بھائی کو کسی لڑکے نے مارا، یہ محترمہ فوراً" ان کی کلاس میں پہنچیں، کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک پیر زور سے زمین پر پٹخا، آواز میں رعب اور زور پیدا کرکے چیخیں۔

"اوئے... کس نے مارا ہے میرے بھائی کو اور کس نے اس کا لنچ ٹھونسا ہے؟"

کلاس کے بچوں کو وہ منحنی وجود، جاہ و جلال کے تمتمایا چہرہ، معصوم چہرہ گنڈاسے والے سلطان راہی جیسا لگا، سب پر سکتہ طاری ہوگیا۔

"اوئے!" گردن پھلا کر چلائیں۔ "نوین آپی چلی گئی ہیں، مگر میں موجود ہوں، کسی نے میرے بھائی کو ہاتھ لگایا، یا جھگڑا کیا، یا اس کے بیگ سے پنسل چرائی، میں چھوڑوں گی نہیں، اوئے۔" کہہ کر دوسرا پیر پٹخا، کمر پر ہاتھ رکھا۔ "میں اکیلی تم سب کے لیے کافی ہوں۔"

کہہ کر دوسرا پیر پٹخا، مکا ہوا میں لہرایا اور سب کو حیران اور خوف زدہ کرکے آگئیں، کلاس پر امن ہوگئی اور ان کو اسکول کے ڈراموں میں جگہ ملنے لگی، ولن کی۔

بھائی نے اولیول کا امتحان دیا اور فوراً" کراچی ماموں کی پناہ میں چلا گیا۔ اماں رزلٹ لینے گئیں، اسکول میں ٹائپ کیا ہوا کارڈ ملا، پڑھ کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے نوجوان سے بولیں۔

"میرا خیال ہے رزلٹ بدل گیا ہے، پھر سے چیک کریں۔" اس نے کمپیوٹر کو ادھر سے ہلایا، ادھر سے کچھ کیا، از سر نو جائزہ لے کر وثوق سے بولا۔

"میڈم! یہی رزلٹ ہے آپ کے بیٹے کا۔" حیرت بے یقینی، سات A ایک B ناقابل یقین، فوراً" وہیں سے کراچی فون کیا، اسے رزلٹ بتایا، ادھر سے ایک چیخ کے ساتھ آواز آئی۔

"اماں... پتا نہیں کس کا رزلٹ لے آئی ہیں آپ، میرا کیسے ہوسکتا ہے۔"

اب انہیں موسیقی سے روکنے کی ضرورت نہیں۔

اور اب ذکر ہوجائے بھانجی نمبر دو کا، اعلا تعلیم یافتہ، مدبر، سنجیدہ، اردو ادب سے گہرا شغف، گھر سے نکلنے والے دستی ماہنامہ "دستک" کی ایڈیٹر رہ چکی ہیں۔ (ویسے سب بھانجیاں اللہ کے فضل سے اعلا تعلیم یافتہ ہی ہیں۔ ایم اے سے کم کوئی نہیں۔)

بچپن ان کا بھی خاصا ہنگامہ خیز گزرا (خاصا نہیں، کافی) گود میں ان کو لینے والیاں بازو کے نرم حصے میں نیلاہٹ دیکھ کر حیران رہ جاتیں۔ اتنی باریکی سے چٹکیاں کاٹتیں کہ کسی کو احساس نہ ہوتا۔ قرآن پاک پڑھانے والی استانی جی نے انہیں شلوار اور دوپٹا پہن کر آنے کی تاکید کی، تو دوپٹا گول کرکے بغل میں دبا کر ان کے گھر جاتیں، اوڑھتے ہوئے شرم آتی تھی، لوگ کیا کہیں گے، اتنی سی عورت۔

پھر یہ بڑی بھی ہوگئیں، ایک بار امتحان کے زمانے میں پڑھائی میں منہمک تھیں، تو ان کی والدہ کو ان سے ہمدردی ہوئی، وہ ان کے لیے چائے لے کر آئیں اور اپنی چائے لے کر اوپر چلی گئیں، یہ بھی فوراً" دندناتی ہوئی ان کے پیچھے اپنا مگ لے کر پہنچ گئیں اور بولیں۔

"ماما! آپ نے بتایا ہی نہیں کہ ہماری چائے میں آپ نے چینی ڈالی کہ نہیں اور اوپر آگئیں۔"

ماما بے چاری حیران ہوگئیں، انہوں نے کہا۔ "تم چکھ کر دیکھ لیتیں۔"

یہ بھی حیران ہوئیں اور ماما کی عقل کو داد دیتی ہوئی عش عش کرتی نیچے آئیں۔

یہ تو طالب علمی کا دور تھا، پھر وہ اور بڑی ہوئیں اور انہیں یک لخت خیال آیا کہ وہ پھیل رہی ہیں، موٹاپے کے تدارک کے لیے انہوں نے سارے گر آزمانے شروع کیے، ماڈل ٹاؤن پارک میں روزانہ جوگنگ، کھانے پینے میں احتیاط، ابلی ہوئی مونگ کی دال، کچی سبزیاں اور قہوہ، ان کی خوراک بن گیا، جم جوائن کیا، ہفتوں یہ سلسلہ جاری رہا، سب منع کرتے رہے کہ زیادہ ڈائٹنگ کمزور کردے گی، مگر انہیں اپنے پتلی ہونے کا احساس تب ہی ہوا، جب نقاہت سے

لڑکھڑانے لگیں۔

اب وہ خاصی سمجھ دار ہوگئی ہیں' ایک مشہور اسکول میں ٹیچر ہیں' ان محترمہ کے بھی' نمبرون بھانجی کی طرح دو بچے ہیں' لڑکی' لڑکا' لڑکی جب بہت چھوٹی تھی' پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آنے لگے تھے۔ جو بات منہ سے نکل جائے اُسے پورا کروانے کا مادہ بہت کم سنی میں ہی نظر آنے لگا۔

ایک بار یہ بچی اپنے والدین اور دادا' دادی کے ہمراہ کھاریاں سے لاہور آرہی تھی' سب اپنی مختلف باتیں کررہے تھے۔ یہ بے چاری بور ہورہی تھیں۔ ذہن رسا نے اس کا توڑ "فوراً" دریافت کرلیا اور زور سے کہا۔

"آلو کھانا ہے۔"

دادی کی گود میں تھیں' انہوں نے بہت پیار سے کہا۔ "ہاں' ہاں' میرا بیٹا لاہور جاکر آلو کھائے گا۔"

وہ پھر باتوں میں لگ گئیں' مگر یہ موصوفہ اپنا مشن نہیں بھولیں۔

"آلو کھانا ہے۔"

دادی نے چپس دیے۔ "یہ آلو کے ہیں۔" جو انہوں نے منہ بنا کر ریجیکٹ کردیے۔

"نا... آلو کھانا ہے۔"

اب دادا نے بھی تسلی دی۔ "ہاں بیٹا' بس ابھی کچھ دیر بعد۔"

تالیاں وی گئیں' یہ رشوت نامنظور۔

"آلو کھانا ہے۔"

ماں نے جوس پلایا' بسکٹ دیے' تکرار قائم رہی۔

"آلو کھانا ہے۔" اور ہر قسم کی کوشش کے باوجود ایک ریکارڈ مستقل بجتا رہا "آلو کھانا ہے" دادا کے سر میں درد ہوگیا' دادی عاجز آگئیں' ماں' باپ پریشان' لیکن شاباش مستقل مزاجی کے۔ لاہور آہی گیا' کار رکتے ہی دادا نے انہیں گود میں دبوچا اور نیچے اتر کر گھر میں گھسے' سلام دعا تو بعد میں' پہلے بچی کو ان کی نانی کی گود میں پٹخا اور بال نوچ کر بولے۔

"بھئی لبنیٰ! اسے آلو کھلادو۔"

لیکن اب وہ آلو سے بے نیاز نانی کی گود میں کھلکھلا رہی تھیں' ان کو نانی نے اہمیت بھی تو دی تھی۔

کچھ بڑی ہوئیں' تو اماں کو ان کے ننگے کان برے لگنے لگے' کان چھدوائے گئے۔ چاندی کی بالیاں پہنا دی گئیں' پھر اسکول جانا شروع ہوا تو بالیاں اتاری گئیں' کچھ عرصہ بعد کان بند ہوگئے' اتفاق سے ایک قریبی عزیز کی شادی کا کارڈ ملا۔

ہائے ہائے' بچی بے چاری بغیر بالیوں کے ننگے کانوں سے جائے' یہ نہیں ہوسکتا' لبرٹی میں ایک بورڈ دیکھا۔

"بغیر تکلیف کان چھدوایئے۔" ماں' نانی بچی کو وہاں لائیں' سوراخ کرنے والے "ڈاکٹر" کو صورت حال بتائی' اُس نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔" اور پستول اٹھایا۔ (سوراخ کرنے والا) بچی کھڑی ہوگئی۔ آج کل کے بچے پستول کی خونریزی سے واقف ہیں۔ خوف زدہ تھی' نانی نے اسے پچکار کر بٹھایا۔ مگر... بچی زور آور تھی' کسی طرح قابو میں نہ آئی۔ اماں' نانی' ڈاکٹر مل کر زور لگاتے رہے کہ کسی طرح بچی چین سے بیٹھے۔ بچی میں جن کی طاقت آگئی تھی۔ اماں کا اسکارف کھسک گیا' بلکہ اتر گیا' نانی ہانپ گئیں' لوگوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ جمع ہوگیا۔

مفت کا تماشا دیکھنے والوں کی کمی نہیں اور ایسی ریسلنگ.....

"ہائے بچی کس طرح تڑپ رہی ہے' آپا جی! رحم کرو اس پر۔" ہمدرد تماش بین۔

"باجی جی! جان دیو' بچی بڑی ہو جان دیو' فیر کان چھدوا لینا۔" ہمدرد مشورے۔

ڈاکٹر بھی شاید ڈر گیا۔ "چھوڑیں آپا جی' پھر سہی۔"

مگر' اب یہ انا کا سوال تھا' ضد بھی' تماش بین خواتین کے سامنے شرمندگی' ہارنے کی ذلت' نانی نے بازوؤں میں جکڑ لیا' اماں نے پیر قابو کیے' بارے اس چھوٹے پستول نے کام دکھایا۔ مگر... ایک کان کے سوراخ نے جو ڈیڑھ گھنٹہ ضائع کیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو تھکا دیا۔ اس تماشے کے بعد اب کوئی اور کسٹمر آئے گا؟ اتنے لوگ گواہ ہیں' وہ تھک کر بیٹھ گیا' ایک کان کا

سوراخ لے کر ہاں بیٹی گھر آگئیں۔

رات کو نانی بازو دباتی رہیں۔

"نہ جانے کیا ہوا ہے' اتنا درد تو میرے بازو میں کبھی نہیں ہوا۔"

ماسی کو بلایا گیا' اس نے مالش کی' دبانے کے دوران انکشاف کیا۔

"باجی! آپ کے بازو میں تو کھلیاں پڑ گئی ہیں۔"

ہولناک انکشاف' بہت غور کرنے پر یاد نہ آیا کہ کون سا بھاری کام کیا ہے' تب بیٹی نے یاد دلایا۔

"ماما۔۔۔ آپ نے عفی کے کان چھدوانے پر کتنا زور لگایا تھا' پکڑم پکڑائی کی وجہ سے۔"

ان عفی صاحبہ کو بھی گم شدہ ہونے کا اتفاق ہوا' آس پاس بہن' بھائیوں کے ہی گھر تھے' ہر جگہ وہ آزادانہ چلی جاتی تھیں۔ مگر۔۔۔ تلاش کے باوجود کسی گھر میں نہ ملیں۔ اب پریشانی شروع' کوئی ادھر بھاگا' کوئی ادھر' پھر کچھ دیر بعد ایک اجنبی لڑکا ان کو کندھے پر بٹھائے بلند آواز میں پکارتا نظر آیا۔

"یہ بچی کس کی ہے۔" اتفاق سے درزی نے دیکھ کر پہچانا۔

"ارے۔۔۔ یہ تو ہماری میڈم کی رشتے دار کی بیٹی ہے۔"

بچی کو دیکھ کر سب نے سکھ کا سانس لیا' ان صاحبہ کو دوست بنانے کا بھی شوق ہے' جس کو بیسٹ فرینڈ کا درجہ دیتی ہیں' زمین آسمان کے قلابے تعریف کے ملاتی ہیں' کوئی پوچھے' بیسٹ فرینڈ کا نام کیا ہے؟ کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار ہوتا ہے' دوستی میں نام کی اہمیت نہیں' ثابت ہوا ان کا چھوٹا بھائی بھی ہے' سادہ طبیعت' نمازی' ڈسپلن کا پابند' فوجی کا بیٹا ہے آخر۔

اب جگر تھام کر بیٹھو' بھانجی نمبر تین کا ذکر خیر ہو جائے۔

یہ صاحبہ گوناگوں خصوصیت اور خوبیوں کی مالک ہیں' ان کے لیے ہمارا تجویز کردہ نام' عملی تفسیر کہا جاسکتا ہے' یعنی نادر و نایاب و عجیب۔

ذہین' سمجھ دار (ایک ہی بات ہے) دور کی کوڑی لانے والی۔ (ان کے اپنے بارے میں ان کے خیال میں۔) بہت زیادہ بولنے کا شوق' اونچی آواز میں رائے زنی کا بھی شوق ہے۔ (اپنی کزن' نمبر ایک بھانجی کے مانند) اعلا تعلیم یافتہ' بچوں کی تربیت کا منفرد انداز اختیار کرتی ہیں۔

پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتی ہیں۔ اسی حالت میں تربیت شروع ہوتی ہے' فل آوازیں' ہدایتیں' **نصیحتیں**' غصہ' گرمی' یہ نہ کرو' وہ نہ کرو' وہاں کیوں گئے' پردہ چھوڑو' پھٹ جائے گا' تمیز سیکھو' میز پر نہ چڑھو' شیشہ ٹوٹ گیا تو زور سے چبھے گا' خون نکلے گا' پھر ڈاکٹر انجکشن لگائے گا' کتنی زور کی تکلیف ہوتی ہے۔

یہ سب کچھ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے تقریر ہوتی ہے' بچہ خواہ کسی خطرے سے دوچار ہونے والا ہو' اٹھ کر ہاتھ پکڑ کر روکنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب دبنگ آواز میں ماں تربیت کر رہی ہے' تو بچہ اس آواز سے ڈر ہی جائے گا' بچہ ڈر تو جاتا ہے۔ مگر جو کر رہا ہے وہ کرتا رہتا ہے' اسے علم ہے' ماں اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں' اس لیے چیخ و پکار کی پروا کیے بغیر اپنے شغل میں لگا رہے گا' یہ اپنا کام کرتی رہیں گی' چیخنے چلانے کا' ان کو میزبانی کا بھی شوق ہے' ایک بار ہمیں بھی مہمان بنانے میں کامیاب ہو گئیں۔

"خالہ جان! بہت سارے کپڑے لے کر چلیں' ہم آپ کو کراچی کی سیر کرائیں گے' سمندر کی' سب رشتے داروں سے ملوائیں گے' کئی دن رہیں گی آپ' ہاں۔"

"تمہارے گھر میں تو دو بیڈ ہیں' ایک تمہارا' ایک بچوں کا' ہمیں کیا زمین پر سلاؤ گی؟"

"آپ ہامی تو بھریں' سب کچھ ہو جائے گا' سیر و تفریح' ہوٹلنگ' مزے کریں گے۔" (لالچ)

سیر و تفریح کا ہمیں زیادہ شوق نہیں اور کراچی میں تو لے دے کے ایک سمندر ہی ہے سیرگاہ اور ہمیں سمندر سے خوف آتا ہے' لاہور میں تو بے شمار تفریح گاہیں ہیں ——— بارہ دری' شالیمار باغ' مقبرہ جہانگیر' مینار پاکستان' قلعہ' شاہی مسجد' نور جہاں کا مقبرہ' شملہ پہاڑی' باغ جناح' گلستان فاطمہ' گلشن اقبال' ریس کورس پارک' ماڈل ٹاؤن پارک۔

لیکن خیر ان کی محبت سے مجبور ہو کر ان کے گھر گئے' معہ بہت سے کپڑوں کے' کراچی میں رشتے دار بھی تو بہت ہیں' گھر جا کر دیکھا' ایک نیا بیڈ موجود' واہ بھئی' قدر کرنی چاہیے' اتنا خیال' اتنی محبت۔

"میاں کے کان کھا لیے ہم نے کہ خالہ جان کے لیے بیڈ لا کر دو۔" فخریہ بتایا۔ (واقعی کان کھا ہی لیے ہوں گے۔)

وہ کچن میں مصروف ہو گئیں' ہم نے بچوں کی فرمائش پر کارٹون دیکھے' خوف ناک۔ ریسلنگ دیکھی' ہولناک' پھر ملازمہ لڑکی نے آکر کہا۔

"باجی! کھانا لگا دوں' باجی کسی کام سے چلی گئی ہیں۔"

"اچھا بھئی!" ہم نے بچوں کے ساتھ کھانا کھا لیا' کھانے کے بعد ان کی بیٹی آم کے اچار کی گٹھلی چوستی چٹخارے لیتی رہی۔

"رات کو اچار نہیں کھانا چاہیے' گلا خراب ہو جاتا ہے' بچوں کو تو بالکل بھی تیل اور تیز مسالے کی کھٹی چیزیں نہیں کھانی چاہئیں' گلا بند' آواز بند' کل سے اچار بند۔"

ہم نے بچی کو نصیحت کی' وہ تکلفاً "چپ ہو گئی۔

اب پھر' لی وی' ہم اور بچے' دیر ہو گئی تو ہم بچوں کے ساتھ ان کے بیڈ پر ہی لیٹ گئے' انہیں کہانی سنائی' ایک کے بعد دوسری' تیسری' پھر تینوں سو گئے' نیا بیڈ نیا ہی رہا۔

صبح وہ بچوں کو لے کر اسکول گئیں' اسکول سے واپسی پر انہیں کسی کو کہیں پر لے کر جانا تھا۔ اس طرح کی ڈیوٹی انہوں نے خود لی ہوئی ہے' کوئی عزیز دوسرے شہر یا دوسرے ملک سے آرہا ہو' اسے لینے ایئرپورٹ جائیں گی' جانے والوں کو ایئرپورٹ یا اسٹیشن پہنچانے بھی جائیں گی۔

بالآخر دوپہر کو بچوں سمیت آئیں' کھانا کھایا' بستر پر گر کر خر خر کی موسیقی نشر کی۔

سہ پہر کو اٹھیں' نہا دھو کر تیار ہو کر نکلیں۔ دائیں طرف والی پڑوسن آگئی' اس کی فرمائش پر اسے لے کر شاپنگ کے لیے چلی گئیں۔

رات میں تھکی ہوئی آئیں' دوسروں کو شاپنگ کرانا آسان تو نہیں' خاصی مشقت ہے۔ آرام کر کے اٹھیں' افراتفری میں کھانا کھایا۔

سامنے والی بلڈنگ میں ان کے ساس سسر رہتے ہیں' دن بھر اتنی مصروفیت رہی' ان کی خیریت کو جانہ سکیں۔ ہر روز حاضری بھی ضروری تھی' اطلاع دے کر چلی گئیں' ہم بچوں کو کہانیاں سنا' سنا کر ان کے ساتھ ان کے بیڈ پر سو گئے' نیا بیڈ' نیا کا نیا۔

اگلے دن ناشتے پر انہوں نے آج کا پروگرام نشر کیا۔

"کھانا تیار کر کے بائیں طرف والی پڑوسن کے ساتھ بھی شاپنگ کے لیے جانا ہے' کل وہ دائیں طرف کی پڑوسن کو ہمارے ساتھ دیکھ چکی تھی' اب اگر ہم نہ گئے یا کوئی بہانہ کیا' تو وہ بے حد ناراض ہو جائے گی' اس کے بھائی کی شادی ہے' اس کی شاپنگ بہت ضروری ہے' وہاں سے آکر پھر اسپتال جانا ہے' نند داخل ہے' اگر اس کے ساتھ رہنے کے لیے کوئی وہاں نہ آیا تو ہمیں ہی مجبوراً رہنا پڑے گا' پھر کل صبح ہم آئیں گے' خالہ جان! ہم کل آپ کو گھمانے لے چلیں گے۔"

"تم۔۔۔ ہمیں کلفٹن ہی چھوڑ آؤ۔" پروگرام سن کر ہی گھبراہٹ ہونے لگی۔

بہت برا مانیں۔ "واہ' بہن کے گھر تو خوب دل لگتا ہے' بھانجی کیا چٹکیاں کاٹتی ہے؟ کہ دو دن میں اکتا گئیں۔"

"دراصل ہمیں وہاں کام ہے۔" ہم نے بہانا کر دیا' بارے مان گئیں۔

جلدی جلدی کھانا تیار کیا' بائیں ہاتھ والی پڑوسن کے ہمراہ ہماری بھی روانگی عمل میں آئی۔ (معہ ان بہت سارے کپڑوں کے) راستے سے اسکول سے بچوں کو لیا۔ پیٹرول پمپ سے پیٹرول لیا' موبائل کارڈ لینے اسٹور میں جا گھسیں' بچی ان کے ساتھ ہی گئی تھی' واپس آئی تو چیونگم کے پیکٹ ہاتھ میں' ببل گم منہ میں بھری ہوئی تھی' چیونگم اس نے بھائی کو دیے' ہماری

بھی خاطر کی۔

"توبہ' توبہ' یہ تو بہت گندی چیز ہے۔" ہم نے انہیں سمجھایا۔ "نہ تم کھایا کرو' نہ بھائی کو دو' آنتوں میں چپک کر سخت خرابی کرتی ہے' بچے بیمار ہو جاتے ہیں' تمہاری ماما منع نہیں کرتیں؟"

بچی نے شدومد سے انکار میں سر ہلایا۔ "بالکل نہیں' وہ خود ہمیں دیتی ہیں اور اچار بھی کھلاتی ہیں' بہت مزے کا ہوتا ہے۔" وہ ہمیں سمجھانے لگی۔

"تمہاری ماما کو آنے دو' ابھی ہم ان سے پوچھیں گے' اتنی خراب چیز کھلاتی ہیں۔"

بچی نے سر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ "خالہ جان! آپ تمہ کے گھر کب جائیں گی۔"

دیکھا۔ پابندیاں بچوں کو بالکل پسند نہیں' بچے ہمارے دور کے ہشیار ہو گئے۔ ہمیں کلفٹن چھوڑ کر چلی گئیں' مگر شاید گھر میں ان کا دل نہیں لگتا' اگلی صبح وہ بچوں کو اسکول چھوڑ کر کلفٹن آگئیں۔ "خالہ جان' جلدی کریں' بولٹن مارکیٹ جانا ہے۔" مختصرا" بتایا۔

"بولٹن مارکیٹ میں ایک دکان دار فون پر آرڈر لے کر مطلوبہ اشیا گھر پہنچا دیتا ہے' ہم نے اس سے پیمپر منگائے تھے۔ (یقینا" کسی پڑوسن کی فرمائش ہوگی) وہ دے کر چلا گیا' بعد میں دیکھا تو چھوٹے سائز کے تھے۔ اس سے فون پر کہا کہ اس بار بڑے پیمپر لاکر اپنے چھوٹے لے جاؤ' وہ بہت مصروف ہے' اس نے کہا' باجی آپ خود آخر مرضی کے پیمپر لے جائیں۔ اب مجبوری یہ کہ ہم کبھی بولٹن مارکیٹ گئے نہیں۔ (تعجب' کوئی ایسی بھی مارکیٹ ہے' جو ان کے دیدار سے محروم ہے۔) اکیلے جانے کی ہمت نہیں۔"

خیر' ہمارے انکار کرنے پر وہ ہماری چھوٹی بہن (جن کے گھر ہم مہمان تھے۔) اپنی چھوٹی خالہ تمہ کو لے کر چلی گئیں' اب ذرا تمہ کی زبانی احوال سن لیں' بولٹن مارکیٹ پہنچنے تک گاڑی کا شیشہ بار بار اتار کر ہر کس و ناکس سے بولٹن مارکیٹ کا پتا پوچھتی رہیں۔ خیر' وہاں پہنچ کر گاڑی پارک کی' گلی میں گاڑی نہیں جا سکتی' گلی میں داخل ہوتے ہی ایک مزدور کو دیکھا جو دکان کی سیڑھی کی مرمت کر رہا تھا' یہ رک کر اس سے پوچھنے لگیں۔

"بھائی! پیمپر کی دکان کہاں ہے؟"

مزدور کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کرنے لگا۔ آگے بڑھے تو ایک ہتھ ریڑھی والے بوڑھے بابا ملے' ان کی ریڑھی کپڑوں کے بنڈل سے بھری ہوئی تھی' بے چارے بمشکل اسے گھسیٹ رہے تھے۔ انہوں نے اس سے بھی پوچھ لیا۔

"بھائی جان' پیمپر کی دکان کا پتا ہے؟"

وہ پسینہ پونچھ کر بولے "آگے دیکھ لو۔"

کپڑے کی دکان پر خواتین کا رش تھا۔ دکان کے اندر جھانک کر انہوں نے پوچھا۔

"بھائی صاحب۔ پیمپر کی دکان کا پتا بتا دیں۔" سیلز مین مصروف' وہیں سے بولا۔ "کی پتا۔" اور پھر مصروف ہو گیا۔ آگے ایک بڑھئی ملا' خاصا عمر رسیدہ تھا' اس سے پوچھا۔

"بھائی جی' پیمپر کی دکان کہاں ہے بھلا؟"

وہ منہ اٹھا کر حیرانی سے دیکھ کر بولا۔ "اس جی!" دراصل بابا' چاچا کہنے کے بجائے ایک جوان لڑکی بھائی کہہ کر مخاطب کرے' حیرانی تو ہوگی۔

ہم نے انہیں ٹوکا۔ "اُفوہ۔ آگے چلو' مل جائے گی دکان' بھاگ نہیں جائے گی۔"

"اے ہے۔ تو پوچھنے میں حرج کیا ہے؟ ذرا جلدی پہنچ جاتے۔"

یہ نیا نسخہ معلوم ہوا' خیر ایک دکان پر سیلز مین کو پہچان کر اندر گھسیں۔

"اتنی دور اندر جا کر دکان لینے کی کیا ضرورت تھی' کتنی مشکل سے پوچھ پوچھ کر پہنچے ہیں۔" شکوہ کیا' پیمپر تبدیل کیے' واپسی ہوئی' سب سے پہلے بوڑھا بڑھئی ملا' بڑے اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

"ادی! پیمپر کی دکان مل گئی؟"

"اے ہے' بڈھے کا نخا پن دیکھو' بیٹی' نہ کاکی' ہمیں ادی کہہ رہا ہے۔"

کپڑے کا سیلز مین بھی اب خالی بیٹھا تھا' اندر سے

پکار لیا۔ "باجی! دکان مل گئی؟"

ہتھ ریڑھی والا' ایک اسٹول پر بیٹھا سستا رہا تھا۔

"آپا جی' دکان ملی؟"

"توبہ' کتنے کیچڑ لوگ ہیں' ہر کسی کو ہماری فکر ہے' ہاں بابا مل گئی۔" گلی سے باہر نکلے' مزدور ابھی سیڑھی پر بیٹھا کچھ کر رہا تھا' بڑے شوق سے ٹوپی اتاری' جھاڑ کر پھر پہنی۔

"ادی دکان مل گئی؟"

"ہاں بابا' مل گئی' یہ رہے پیمپر' پہنو گے؟"

کہہ کر جلدی سے آگے بڑھیں کہ کہیں وہ مانگ ہی نہ لے' نتیجہ یہ کہ راستے بھر پھر تمہ کی ڈانٹ سنتی رہیں اور اکثر سنا کرتی ہیں کسی نہ کسی معاملے میں۔ ان کی شاپنگ کا قاعدہ یہی ہے کہ سارا بازار جان لے' یہ محترمہ آئی ہیں۔

ایک بار لاہور آئیں' شوق کا بھلا ہو' حسب معمول شاہ عالم مارکیٹ کے دورے پر گئیں' وہاں پارکنگ نہیں ہے' ایک پلازے کی چوتھی یا پانچویں منزل پر پارکنگ ہے' گاڑی اوپر چڑھا کر لے گئیں' سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آئیں' کچھ خریداری کی' پھر فٹ پاتھ پر پٹھان کے سامنے رنگ برنگی چپلیں دیکھ کر مچل گئیں' اپنی ایک چپل اتار کر ہر چپل پہن کر دیکھی' پھر واپس آگئیں' اگلے دن ہمارے پاس دوڑی آئیں۔

"خالہ جان! بھیا کہاں ہیں؟" پتا چلا کہ جس پٹھان کی دکان پر چپل اتاری تھی' وہ وہیں رہ گئی' اس کی پرانی چپل پہن کر چل پڑی تھیں' ہمارے چھوٹے بیٹے بھی شاہ عالم مارکیٹ کے رسیا ہیں' انہوں نے حجت کی' تو فرمایا۔

"بھئی' جلدی میں کچھ نظر نہیں آیا' اپنی سمجھ کر اس کی پہن لی' اب وہ ہماری نازک اندام چپل پہن کر گھر گیا ہوگا' اتنا چوڑا پنجہ تھا اس کا' ستیاناس کر دی ہوگی۔"

غرضیکہ پٹھان کی پرانی چپل ایک شاپر میں' اپنی نمونے کے طور پر دوسرے شاپر میں رکھ کر بھیا کو دی۔

"جا کر اس پٹھان سے بدل لیں' رات بھر ہمیں نیند نہیں آئی کہ بے چاری ہماری نازک اندام کے تو چیتھڑے اڑ گئے ہوں گے۔" (چپل کے) بارے ان کے بھیا صاحب کہ وہ بھی اس دشت کے پرانے سیاح ہیں' شاہ عالم مارکیٹ گئے اور ان کی چپل لے آئے۔

"پٹھان بہت ہنس رہا تھا' تم نے یقینا" اوٹ پٹانگ باتیں کی ہوں گی حسب معمول۔"

"بھئی ہنستا نہ' تو کیا روتا' اس کی مسٹنڈی پشاوری پرانی چپل نے مفت میں کار کی سیر کر لی' شاہ عالم کی تنگ گلی سے نکل کر ماڈل ٹاؤن تک۔"

ہم نے ان کو ایک بار بہت خوب صورت پرنٹ کا سیاہ رنگ کا سوٹ دیا' ان کی بہن' یعنی بھانجی نمبر 2 کے لیے آتشی گلابی رنگ کا' دیکھتے ہی بھڑک گئیں۔

"اچھا جی۔ ہمارے لیے کالا' آپی کا آتشی گلابی' اتنا فرق کیوں؟"

"ان کے گورے رنگ پر گلابی رنگ اچھا لگے گا۔" ہم نے سادگی سے کہہ دیا' تلملا گئیں' چراغ پا ہو کر بولیں۔

"ہاں جی' وہ تو گوری ہیں' کالے تو ہم ہیں' اس لیے ہمارا سوٹ کالے رنگ کا لیا ہے' وہ جو گوری ہیں' وہ اس لیے کہ ہمیشہ اے سی کمرے میں رہتی ہیں' آرام سے۔"

"اوہو۔ بھئی' وہ اسکول میں بچوں کے ساتھ دماغ کھپاتی ہیں' صبح گھر سے نکلتی ہیں' شام کو گھر آتی ہیں' تھکی ہوتی' آرام نہ کریں۔" ہم نے صفائی پیش کی' جو انہیں پسند نہ آئی۔

"جی۔ اے سی والے کمرے میں ہی پڑھاتی ہیں' انہیں ہماری طرح کچن میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا' انہیں پکا پکایا مل جاتا ہے' ہر کام بیٹ مین کر لیتا ہے' انہیں بازاروں کے چکر نہیں لگانے پڑتے۔ ان کے بچوں کے بنیان' انڈر ویر تک ہم خرید کر بھیجتے ہیں' ان کے سوٹ ہم درزی سے سلوا کر بھیجتے ہیں' درزیوں کے چکر کون لگاتا ہے' ہم۔ ہم تو کالے ہوں گے ہی' اچھا خالہ جان' کل ہم آتشی گلابی سوٹ پہن کر تارو کے ولیمہ میں آئیں گے' پھر فیصلہ ہوگا۔"

اف... ایسی دھواں دار تقریر، جیسے قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر جوش میں آکر خطابت کے جوہر دکھاتا ہے۔

"بھئی... اب تمہیں بازاروں میں پھرنے کا شوق ہی اتنا ہے، پڑوسیوں تک کے لیے ماری ماری پھرتی ہو۔"

ہم نے بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ مگر بھئی اگلے دن ولیمہ کی تقریب میں آتشی گلابی رنگ کا سوٹ پہنے بجلیاں گراتی پھر رہی تھیں، انصاف کا تقاضا تھا کہ...

"ہاں بھئی، تم تو واقعی گلابی رنگ کی ہو، مگر بہن سے کچھ سیکھ بھی لو، جاگنگ کرو، جم جاؤ، کھانے پینے میں احتیاط کرو، ورنہ تھوڑے دن کے بعد توپ بن جاؤ گی۔"

"ہائے... ہم کھاتے ہی کیا ہیں؟" وہ معصوم بن گئیں۔

تینوں بھانجیوں میں اتحاد بہت ہے، تینوں کی دو، دو اولادیں ہیں، بیٹی بڑی، بیٹا چھوٹا، تینوں کزنز، ایک محفل میں ہوں تو کسی چوتھے کا چراغ نہیں جلتا، زبانیں نہیں ہلتیں، اس لیے کہ یہ تینوں ہی بولتی ہیں، زور و شور سے، میزبان بیچارا گونگے کا گڑ کھائے بیٹھا ان کے منہ تکتا رہتا ہے۔

نمبر 3 کی بیٹی کو سوال کرنے کا بہت شوق ہے، ایک بار انہیں لفٹ میں ایک صاحب ملے، ان سے پوچھنے لگیں۔

"انکل... آپ کی عمر کتنی ہے؟"

انہوں نے کہا "میں ستر سال کا ہوں۔"

"ہو لیں... پھر تو آپ میری ایج کے ہی ہوئے، میں بھی سیونٹی کی ہوں۔"

انہوں نے کچھ حیران ہو کر دیکھا، تو بولیں۔ "بس یہ ہے کہ میں اپنا بہت خیال رکھتی ہوں۔"

وہ مزید حیران ہو کر بولے "بھئی تم تو کوئی چیز ہو۔"

"انکل! میں کوئی چیز نہیں ہوں، بہت شریف لڑکی ہوں، آپ میرے گھر آکر دیکھیں، ہر وقت سفید ساڑھی پہنے پوجا کرتی رہتی ہوں۔" (ہائے، یہ انڈین ڈرامے)

ہماری ایک خالہ پنڈی میں ہیں، انہوں نے فون کیا، یہ صاحب زادی ریسیور اٹھا کر بولیں۔ "جی... السلام علیکم، آپ کون؟"

انہوں نے کہا۔ "میں ہوں تمہاری ماما کی نانی کی بہن۔"

حیرت سے کہا۔ "ارے، آپ ابھی زندہ ہیں؟"

بازار میں گداگری کے خلاف مہم نے زور پکڑا ہوا تھا، اعلان ہو رہا تھا کہ گداگری کے معاملے میں نرمی نہیں ہوگی، سب گرفتار کیے جائیں گے، ہماری نمبر چار بھانجی پریشان ہو گئیں۔

"ماں... تو پھر بے چارے کمائی کہاں سے کریں گے۔ ان کے پاس گدھا گاڑی ہی آمدنی کا ذریعہ ہے۔"

ہماری عادت ہے کہ کوئی بچہ، بچی اچھا کام کر کے دکھائے، ہم فوراً" اعلان کرتے ہیں "دس روپے انعام" اکثر تو یہ اعلان زبانی کلامی ہی رہتا ہے، کچھ دینے کی نوبت نہیں آتی، بچیاں اسی اعلان سے خوش ہو جاتی ہیں، ان صاحبہ نے چنے کی دال کا حلوہ بنا کر ہمیں پیش کیا، حسب عادت ہم نے فوراً" خوشی کا اظہار کیا۔

"دس روپے انعام۔"

سن کر منہ بنا لیا۔ "لو جی، دس روپے کا فائدہ؟"

ہم نے شرمندہ ہو کر رقم بڑھائی۔ "پچیس روپے انعام۔"

"... پچیس روپے میں تو آرٹی فشل ٹاپس بھی نہیں آتے۔"

لو جی، آدھی چھٹانک دال کا حلوہ کھلا کر وہ کسی جاگیر کی توقع کر رہی تھیں۔

ایک بار انہوں نے گلاب جامن بنائے، بہت عمدہ، ہم نے ان کے حسب منشا انعام دیا، وہاں چند اور رشتے دار بھی تھے، سب نے ایک ایک گلاب جامن کھائی، تعریف کے ساتھ سو سو روپے ان کی نذر کیے، حوصلہ افزائی۔ کچھ دیر بعد ان کا بھائی گھر آیا، میز پر ڈش دیکھ کر

خوش ہوا۔

"اوہو گلاب جامن۔" وہ آگے بڑھا، یہ فوراً" سد راہ ہوئیں۔

"بھائی جان! سو روپے نکالیں پہلے، کیونکہ ان کی یہی قیمت ہے، پوچھ لیں خالہ جان سے۔"

کبھی کبھی ڈان میں کالم بھی لکھتی ہیں، اسپورٹس کے بارے میں، فوٹو گرافی بہترین کرتی ہیں، چونکہ یہ سب سے چھوٹی بھانجی ہیں، ہمیں لازم ہے ان کی قدر و عزت کریں، پچھلی بار ہم کراچی گئے۔ ان کے لیے چھوٹی موٹی چند چیزیں لے لیں، ان کے گھر اس دن عیشہ صاحبہ موجود تھیں، نمبر تین بھانجی کی بیٹی، سوالوں کی شوقین، دیکھتے ہی بولیں۔

"اچھا خالہ جان! ببا کے لیے بھر بھر کے تحفے لاتی ہیں اور میں آپ کو نظر نہیں آتی۔"

ہم شرمندہ تو ہوئے، مگر ہم بھی ان کی ماما کی خالہ جان ہیں، واپس آکر ان کی عمر اور پسند کے مطابق کچھ چیزیں لیں اور تمہ کے پتے پر کراچی روانہ کیں، تمہ وہ پارسل لے کر ان کے گھر گئیں، خوشی خوشی پارسل کھولا گیا، ان کا چھوٹا بھائی بھی آخر ان ہی کا بھائی ہے، سخت ناراض ہوا کہ اس کے لیے کچھ نہیں ہے، اس نے فوراً" تمہ سے شکوہ کیا کہ عیشہ کے لیے اتنی چیزیں میرا کچھ نہیں، انہوں نے کہا "بھئی یہ تو خالہ جان نے عیشہ کو بھیجا ہے۔" وہ خالہ جان کو خالو جان سمجھا اور کلفٹن فون کر کے تمہ کے شوہر سے کہا۔

"اچھا خالو جان، آپ سے کٹی، آپ عیشہ کو پارسل بھیجتے ہیں، مجھے کچھ نہیں۔" خالو جان حیران۔

یہ صاحبزادے بھی کسی سے کم نہیں، لاہور آئے ہوئے تھے، تو ہم نے دیکھا کہ ایک مرغے کے پیچھے دوڑیں لگا رہے ہیں، آگے آگے بے چارا مرغا ٹانگیں اچھالتا چیختا ہوا، بھاگ رہا تھا، جب بہت دیر ہو گئی تو ہم نے کہا۔

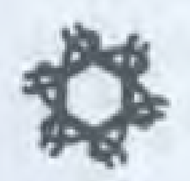
"بھئی... اسے روکو، تھک جائے گا اور رات کو اس کی ٹانگوں میں درد ہوگا، آخر چھوٹا سا بچہ ہی ہے۔"

"اسے کچھ نہیں ہوگا، مرغا ہی تھک کر گر جائے گا اور مر جائے گا، ایسا ہو چکا ہے۔"

ان کی خالہ نے ایک بار مرغی کے نیچے انڈے بٹھائے، چھبیس دن بعد چوزے نکل آتے ہیں۔ یہی سب کو بتایا گیا تھا، مگر انتظار کون کرے، ایک ہفتے بعد ہی مارے شوق کے اس بچے نے مرغی کے شور و غوغا کے باوجود کئی انڈے نکالے، توڑ توڑ کر دیکھا، پھر اعلان کیا۔ "کسی میں بھی بچہ نہیں ہے، انڈے گندے ہیں۔"

بمشکل سمجھایا گیا، مگر ذوق تحقیق کا بھلا ہو، سب کی آنکھ بچا کر انڈے نکالے، دھو کر پھر رکھ دیے، ان کے خیال میں سب انڈوں پر گندگی لگی تھی، نتیجہ صاف ظاہر ہے، بیس انڈوں سے تین بچے ہی نکلے، شاید یہ وہی انڈے تھے جو ان کی دست برد سے بچ گئے تھے۔ نہ جانے پھر ان چوزوں کا کیا ہوا۔

کمپیوٹر نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لی ہوئی ہے، ٹی وی اور کمپیوٹر بہت سی خرابیوں کا موجب ہے، مگر اس دور کی ضرورت بھی، اس کا بے جا استعمال نقصان دہ بھی ہے، شکر ہے کہ ہمارے گھرانے میں ابھی تک کمپیوٹر تعلیم حاصل کرنے کے کام آرہا ہے۔ تربیت کے لیے گھر کا ماحول ہی بہترین استاد ہوتا ہے، جہاں امن، یگانگت ہو، محبت، خلوص، ہمدردی اور رواداری ہو، بچپن سے ذہنوں میں نقش ہو جائے، پھر بگڑنے کے مواقع کم ہوتے ہیں۔



نگہت سیما

حورعین کے آنسو



ایبک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشیلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام "حورعین" دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"الریان" کے سربراہ عبدالرحمٰن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

"مراد پیلس" کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمٰن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (مومی) "الریان" آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ فلک شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی ماں زریں جائیداد کے چکر میں لے جاتی ہے مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک

سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن شاہ کی بہن مروہ کی سسرالی رشتے دار مائرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن، فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کر دیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ "الریان" والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرکے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایبک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مائرہ اور بیٹی رابیل کے علاوہ سب ایبک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ عمر احسان تو ایبک کا فین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی اریب فاطمہ، جو کہ مروہ پھپھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے، ایبک سے کافی متاثر ہے۔



عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت تڑپتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا، حسن رضا اور زبیدہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہینڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی، کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملواتا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔ اسماعیل خان سے ملنے جلنے کی وجہ سے احمد رضا مشکوک ہو جاتا ہے۔ اسے ایک مرتبہ پولیس بھی پکڑ کرلے جاتی ہے مگر حسن رضا اسے چھڑا لاتے ہیں۔

احسان شاہ، فلک شاہ کو مائرہ سے اپنی محبت کا احوال سناتا ہے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مائرہ ان سے کھل کر اظہار محبت کر دیتی ہے جبکہ ان کا رشتہ عمارہ سے طے ہو چکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔

ہمدان کو عمارہ پھوپھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی، لیکن گھر والوں کے شدید رد عمل کے بعد وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ نئی نسل

میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پھوپھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

مائرہ کو فاطمہ کا الریان میں رہنا سخت ناپسند ہے۔ عمارہ اپنے بابا عبدالرحمٰن کو دیکھنے اسپتال جاتی ہیں۔ اسپتال میں عمارہ کو دیکھ کر سب بہت خوش ہوتے ہیں، مگر مائرہ اور رابیل انہیں تنفر اور سخت تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ مائرہ عمارہ سے کافی بدتہذیبی سے پیش آتی ہے جبکہ احسان شاہ غصے سے منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

فلک شاہ حق نواز کی پارٹی باقاعدہ طور پر اختیار کرلیتے ہیں۔ مائرہ اور احسان کی شادی کے بعد ایک جھگڑے میں فلک شاہ کبھی بھی "الریان" میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں، بصورت دیگر ان کی طرف سے عمارہ کو طلاق ہوگی، جبکہ احسان شاہ کہتے ہیں کہ "الریان" سے اگر کوئی "مراد پیلس" گیا تو وہ خود کو گولی مارلیں گے۔

اسماعیل خان احمد رضا کو ورلڈ سوسائٹی آف مسلم کمیونٹی کا اہم کارکن بنا کر اس سے الٹے سیدھے بیان دلوا دیتا ہے۔

حسن رضا یہ خبر پڑھ کر احمد رضا کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔

ایبک کی پیدائش کے بعد مائرہ نے احسان کے ساتھ منگنی کرتے ہوئے فلک شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی بے عزتی نہیں بھولی ہے اور وہ اس بات کا بدلہ ضرور لے گی۔ ایبک، اریب، فاطمہ سے اظہار محبت کرتا ہے۔

حسن رضا، احمد کو گھر سے نکال کر دکھی ہو جاتے ہیں۔ تاہم انہیں احمد کی حرکت پر ملال بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے معافی مانگتے ہیں اور اس کے دوست ابراہیم کے ساتھ اسے ڈھونڈتے ہوئے طیب خان کی کوٹھی جا پہنچتے ہیں، مگر وہ لاعلمی کا اظہار کر دیتا ہے۔ احمد رضا، الوینا کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ وہ اکثر گھر جانے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر الوینا مختلف حیلے بہانوں سے اسے روک لیتی ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں طیب خان اور رباب حیدر مدہوشی کی کیفیت میں احمد رضا سے اسماعیل خان کی نبوت کا بیان دلوا دیتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس بیان کی تردید کرتا ہے، مگر رچی اسے سختی سے جھٹلا دیتا ہے۔

عمارہ اور ایبک کے ساتھ عبدالرحمٰن شاہ کے مراد پیلس آنے کی خوشی میں فلک شاہ خوب تیاری کرتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی میں کھو جاتے ہیں۔ فلک شاہ، مائرہ کا ذکر شیر دل سے کرتے ہیں۔ شیر دل انہیں تسلی دیتے ہیں کہ وقتی جذباتیت ہے۔ ختم ہو جائے گی۔ ان کی پارٹی نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ حق نواز کی صحافی دوست کو چند اہم شخصیات اغوا کرکے قتل کروا دیتی ہیں جس کی وجہ سے حق نواز پارٹی چھوڑ دیتا ہے۔

ایک ایک ماہ کا ہوا تو دادی کا انتقال ہو گیا۔ حق نواز نے دوسری پارٹی اختیار کرلی۔ فلک شاہ ان کے ساتھ تھے۔ فلک شاہ الریان کے برابر والے مکان میں رہتے تھے اور اکثر الریان جاتے رہتے تھے۔ داداجان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن شاہ نے احسان کی شادی کا فیصلہ کیا۔ مائرہ نے عین وقت پر شادی سے انکار کر دیا۔ یہ بات مروہ پھپھو اور فلک شاہ جانتے تھے۔ رحیم یار خان میں مائرہ اچانک فلک شاہ کے کمرے میں داخل ہوتی ہے اور پرانی باتیں دہراتی ہے تاہم آخر میں احسان سے شادی پر راضی ہو جاتی ہے۔ ان دنوں ملک دشمن عناصر کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی وجہ سے حق نواز بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ دوسری طرف مائرہ، عمارہ سے بدتہذیبی سے پیش آتی تھی۔ پھر حق نواز کہیں لاپتا ہو گیا۔

کافی دنوں بعد شیر دل فون پر بتاتے ہیں کہ حق نواز زخمی حالت میں اسپتال میں ہے اور فلک سے ملنا چاہتا ہے۔ فلک پریشانی کے عالم میں تیز بخار میں تھکتے ایبک کو الریان چھوڑنے جاتے ہیں تو ملازمہ کی اطلاع پر وہ احسان کے کمرے میں جاتے ہیں۔ مگر کمرے میں قدم رکھتے ہی مائرہ ان پر غلط الزامات کی بوچھاڑ کر دیتی ہے۔ احسان شاہ، مائرہ کی بات پر یقین کرلیتا ہے۔ فلک شاہ کو صفائی دینے کا موقع نہیں ملتا۔ انہیں حق نواز کے پاس جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ وہ نیچے آتے ہیں تو بابا انہیں ڈانٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ انہیں علم ہو جاتا ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہیں۔ غصے کی کیفیت میں فلک شاہ کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ آئندہ اگر وہ الریان آئے تو عمارہ کو تین طلاق۔ حق نواز ان سے ملے بغیر مر جاتا ہے۔ جنازے میں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ کئی مفتیوں اور علماء سے فتویٰ لیتے ہیں۔ ان سب کے مطابق الریان جانے کی صورت میں عمارہ ان پر حرام ہو جائیں گی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مراد پیلس چلے جاتے ہیں۔

عبدالرحمٰن شاہ تڑپ کر فلک شاہ سے ملتے ہیں اور انہیں وہیل چیئر پر دیکھ کر بہت دکھی ہو جاتے ہیں۔ حق نواز کے بعد فلک شاہ بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ شیر دل کی کوششوں سے مخالفین انہیں زخمی حالت میں شیر دل کی کوٹھی کے باہر پھینک جاتے ہیں۔ اس تشدد میں ان کی ٹانگیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اس ملاقات میں فلک شاہ، عبدالرحمٰن شاہ کو مائرہ کے بارے میں بھی سب بتا دیتے ہیں۔ عمارہ کو بھی اس بات کا پہلی دفعہ علم ہوتا ہے۔ وہ حیران اور خفا ہو جاتی ہیں۔

حسن رضا، طیب خان کے چوکیدار کی مدد سے اس جگہ پہنچتے ہیں۔ جہاں احمد رضا چھپا ہوتا ہے۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے جب احمد رضا باہر نکلتا ہے تو حسن رضا اس پر پستول تان لیتے ہیں، مگر ٹریگر دبا نہیں پاتے اور حسن رضا انہیں دیکھے بغیر چلا جاتا ہے۔ احمد رضا کے شدید اصرار پر الوینا اسے گھر لے جاتی ہے۔ دروازہ بجانے پر ایک اجنبی نکلتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ حسن رضا یہ گھر فروخت کرکے یہاں سے جا چکے ہیں۔ وہ حیرانی کے عالم میں دلبرداشتہ ہو کر پلٹتا ہے کہ گلی کے دوسرے کونے سے حسن رضا اسے دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اسے آواز دے کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ مگر وہ سن نہیں پاتا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ اسماعیل خان کو مخبری پر پولیس گرفتار کرلیتی ہے۔ احمد رضا لندن چلا جاتا ہے۔

آٹھویں قسط

"تو کیا وہ۔ وہ بھی تم سے؟" ایبک نے دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کا دل سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آگرے گا۔

"وہ۔ وہ بھلا کیسے؟" ہمدان کی آنکھوں میں حیرت اتری۔ "وہ تو مجھے جانتی تک نہیں۔ میری کبھی اس سے بات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے صرف تین یا چار بار دیکھا ہے، جب میں رینا کو لینے گیا تھا اس کے کالج اور اس نے بھی ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی تھی اور رینا کا تو پتا ہے نا تمہیں، اس نے میرا تعارف تک نہیں کروایا اس سے۔"

اور ایبک کو لگا جیسے اس کا بہت دیر سے رکا ہوا سانس بحال ہوا ہو۔ وہ کرسی کی پشت پر بازو ٹیکتے ہوئے تھوڑا سا آگے کو جھکا۔

"کون ہے؟ کیا نام ہے؟" ایبک نے اپنی آواز کی لرزش کو خود محسوس کیا۔ شاید یہ اچانک مل جانے والی خوشی تھی کہ دھڑکنیں ابھی تک بے ترتیب تھیں۔

"وہ رینا کی کوئی دوست ہے۔ بظاہر وہ گندمی رنگت کی ایک عام سی شکل و صورت کی لڑکی ہے لیکن اس کی آنکھیں۔۔۔ میں تمہیں کیا بتاؤں، اس کی آنکھوں میں کتنا سحر ہے۔ مجھے لگا میں نے پہلے بھی انہیں کہیں دیکھا ہے۔ اتنی ہی حسین اتنی ہی حزیں آنکھیں۔ تمہیں کیا بتاؤں ایبک فلک شاہ! ان آنکھوں میں کتنا حزن تھا، کتنی اداسی تھی جیسے جنوری کی سرد صبحوں میں سیاہ پانیوں والی جھیلوں پر برف جمی ہو۔ جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا تو سوچا اگر ان جھیلوں پر سے اداسی کا یہ کہر ہٹ جائے تو یہ کیسی لگیں گی۔ جھلمل کرتی، جگنوؤں کی طرح دمکتی۔ میں نے پل کے پل ان آنکھوں کو کئی رنگوں میں دیکھ لیا تھا۔ خوشی کے رنگ، ہنسی کے رنگ، مسرت کے رنگ۔

یاسین چھٹی پر تھا اور میں رینا کو لینے گیا تھا۔ وہ رینا کے ساتھ کالج گیٹ سے باہر آئی تھی، رینا نے گاڑی کے قریب آکر اسے خدا حافظ کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ مڑ کر کسی اور لڑکی کے سے باتیں کرنے لگی۔ رینا نے گاڑی میں بیٹھتے ہی ہمیشہ کی طرح کتاب کھول کر گود میں رکھ لی تھی۔ اس نے مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا تب میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

"رینا! تمہارے ساتھ یہ کون لڑکی تھی؟"

"دوست ہے میری۔" جواب دے کر وہ پھر کتاب میں کھو گئی تھی۔"

ایک دلچسپی سے اسے دیکھتا ہوا کرسی پر بہت اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"مرینہ اپنی دنیا میں مگن رہنے والی لڑکی ہے۔"

"ہاں، لیکن اس روز سے پہلے مجھے اس کی یہ عادت کبھی بری نہیں لگی تھی۔" ہمدان نے برا سا منہ بنایا۔

"میں چاہتا تھا وہ اس کے متعلق کچھ بتائے لیکن وہ تو پڑھنے میں مگن تھی۔ دوسرے روز میں خود مرینہ کو لینے پہنچ گیا تھا۔ وہ اس روز بھی رینا کے ساتھ ہی کالج سے باہر آئی تھی اور اس کا پورا وجود اداسی کی کہر میں لپٹا ہوا تھا۔ یوں جیسے کوئی بے حد خوبصورت جزیرہ گہری دھند میں لپٹا ہو۔

آج مرینہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بتایا تھا۔

"یہ میری دوست ہے سمیرا۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ مجھ سے جونیئر ہے۔"

"اور تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں اس سے محبت ہوگئی ہے؟" ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"ہاں! لیکن مجھے لگتا نہیں ہے بلکہ مجھے سچ مچ اس سے محبت ہوگئی ہے اور یہ بات میں نے صرف تم سے شیئر کی ہے۔ ماما کی خواہش رابی کے لیے ہے اور شاید مائرہ چچی بھی یہی چاہتی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کہا تو نہیں ہے لیکن مجھے کچھ اندازہ ہے۔ اگر میں نے سمیرا کو نہ دیکھا ہوتا تو مجھے رابی سے شادی کرنے میں کوئی انکار نہیں تھا۔ لیکن اب۔۔۔ اب نہیں ایبک! اب کسی اور سے شادی کرنا خود اپنے ساتھ منافقت کرنا ہے۔"

اس نے ایبک کی طرف دیکھا۔ "کیا محبت ایسے بھی ہوجاتی ہے اس طرح اچانک، صرف ایک نظر دیکھ کر۔ وہ تو شاید کسی اور ہی دنیا میں رہتی ہے۔ اپنے آپ میں گم اردگرد سے بے خبر۔۔۔"

"ہاں شاید کبھی کبھی ہوجاتا ہے ایسا۔" ایبک مسکرا دیا۔

"لیکن انجام اس کا انجام کیا ہوگا "

"محبت ہمیشہ اپنے انجام سے بے خبر ہوتی ہے میری جان۔" ایبک اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا خیال میرے ذہن سے نکل جائے لیکن میں آج تک ان آنکھوں کے سحر سے نکل ہی نہیں پارہا ہوں۔"

"تو مرینہ سے پوچھنا اس کے متعلق۔ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔ کیا پتا وہ پہلے سے ہی کہیں انگیجڈ ہو ہوں۔"

ایبک نے بغور اسے دیکھا۔ وہ واقعی بے حد الجھا ہوا اور پریشان لگ رہا تھا۔

"میں نے ابھی شادی، رفاقت، اس سب کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچا۔ ابھی تو میں صرف محبت کی کسک سے آشنا ہوا ہوں۔ یہ بڑا عجیب سا احساس ہے۔ میٹھی میٹھی سی چبھن۔

یوں جیسے آپ نے ہاتھوں میں بہت سے گلاب لے رکھے ہوں۔ گلابوں کی خوشبو مشام جاں کو معطر کرتی اور مست کیے دیتی ہو۔ اور کانٹے ہتھیلیوں میں چبھتے ہوں اور میٹھی میٹھی سی اذیت دیتے ہوں۔"

اور ایبک کو بھی لگا جیسے اس کے دل میں بھی کانٹے چبھے ہوں۔ میٹھی میٹھی سی اذیت اور کوئی خوشبو اندر ہی اندر لہرا لہرا کر مست کرتی ہو۔

"کیا تم نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ایبک۔"

"میں نے!" ایبک فلک شاہ چونکا۔ اریب فاطمہ کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

"میں فریش ہوکر آتا ہوں تو پھر باہر چلتے ہیں۔"

"کہاں؟" ہمدان نے پوچھا۔

"کہیں بھی کسی بھی جگہ پر۔" ایبک واش روم کی طرف بڑھا تو ہمدان نے پھر اسے آواز دی۔

"ابی! ایک خاص بات تو تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ رات بابا بابا جان کو لے کر آگئے اچانک۔"

"کیا؟" ایبک نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "لیکن پرسوں میری بابا سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بابا جان کے آنے کے متعلق تو کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ بابا جان سے بھی بات ہوئی تھی وہ کہہ رہے تھے کہ میں بہاول پور واپس گیا تو وہ میرے ساتھ لاہور آئیں گے۔"

"ہاں بابا آفس سے پرسوں کسی ٹائم بہاول پور کے لیے نکل گئے تھے۔ بابا جان کو لینے وہ ہی حفصہ اور عادل کی منگنی کا سلسلہ ہے۔"

"اچھا!" ایبک یکدم خوش ہوا۔ "بابا تو مصطفیٰ ماموں سے مل کر بہت خوش ہوئے ہوں گے کتنا یاد کرتے تھے وہ انہیں۔"

"بابا نے مجھے فون کیا ہوگا لیکن میرا فون بند تھا۔ لکھتے لکھتے سو گیا چارج کرنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔" اس نے سوچا۔

"احسان انکل نے مصطفیٰ ماموں کو منع نہیں کیا بہاول پور جانے سے؟"

"میری بابا سے زیادہ بات نہیں ہوئی ہے۔ کل تمہارے جانے کے کوئی دو گھنٹے بعد بابا، بابا جان کے ساتھ آئے۔ کسی کو بھی نہیں پتا تھا ان کے بہاول پور جانے کا۔ عادل نے مجھے بتایا تھا۔ وہ کل صبح سویرے ہی آفس چلے گئے تھے اور وہاں سے ہی ایرپورٹ چلے گئے تھے۔ شاید عثمان انکل کو پتا ہو۔ بابا تو جلدی سونے کے لیے چلے گئے تھے لیکن ہم سب کافی دیر تک بابا جان کے پاس بیٹھے رہے۔ مائرہ آنٹی تو آئی تھیں بابا جان سے ملنے لیکن جب تک میں وہاں تھا احسان انکل نہیں آئے تھے حالانکہ بابا جان نے دو بار ان کے متعلق پوچھا بھی تھا۔"

ہمدان نے تفصیل سے بتایا۔ اور ایبک سرہلاتے ہوئے فریش ہونے چل دیا۔

اور کچھ دیر بعد وہ دونوں "الریان" کی طرف جارہے تھے۔

ہمدان کی بائیک انہوں نے کرنل شیر دل کے گیراج میں چھوڑ دی تھی اور اب ایبک کی گاڑی میں تھے دونوں۔

"تمہاری کہانی کا کیا بنا؟ مکمل ہوئی یا نہیں۔ عمر کو جب بھی موقع ملتا ہے، وہ اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔"

ہمدان نے پوچھا تو ایبک مسکرا دیا۔

"حالانکہ عمر نے اس کے صرف ابتدائی چند صفحات ہی پڑھے تھے۔"

"بعض اوقات ایک نظر ہی کافی ہوتی ہے۔"

ہمدان نے ذو معنی بات کی اس سے پہلے کہ ایبک کچھ کہتا، ہمدان نے اچانک سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ۔۔۔ یہ ہجوم کیسا ہے؟"

"شاید کوئی حادثہ ہوا ہے۔" ایبک نے کہا اور پھر ایک دم ہی اس کی نظر منیبہ پر پڑی تھی جو ہجوم سے باہر آرہی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ تو منیبہ ہے، ہومی!" منیبہ نے لمحہ بھر رک کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیزی سے سڑک کراس کرنے لگی۔

ایبک نے فوراً ہی گاڑی سائڈ پر کرکے بریک لگائے تھے اور ہمدان تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا اور اس نے بلند آواز میں پکارا تھا۔

"سونی۔۔۔ منیبہ۔۔۔!" اور منیبہ ایک دم ٹھٹک کر رکی تھی اور پھر اس کی نظر ہمدان پر پڑی تھی۔

"ہمدان۔۔۔ ہومی۔" اس کے لبوں سے نکلا تھا اور وہاں ہی کھڑے کھڑے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ہمدان اور دوسری طرف سے ایبک تقریباً دوڑتے ہوئے ایک ساتھ اس کے قریب پہنچے تھے۔

"کیا۔۔۔ کیا ہوا سونی۔ کیوں رو رہی ہو؟" ہمدان نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"وہ۔۔۔ رابیل۔۔۔ رابیل کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے وہاں۔۔۔ ادھر۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ کیسے؟" ہمدان کے لبوں سے نکلا اور منیبہ بلند آواز میں رونے لگی تھی۔ اس کی بات سنے بغیر ایبک دوڑ پڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے وہ لمحہ بھر کے لیے رک گیا تھا۔ اس نے لاریب فاطمہ کو دیکھا جو رابیل کا سر گود میں رکھے اپنی سیاہ چادر سے پٹیاں کاٹ کاٹ کر رابیل کے سر اور بازوؤں پر کس کس کر باندھ رہی تھی اور سب لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ اردگرد کی آوازوں سے بالکل بے نیاز تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔

"ارے کوئی گاڑی روکو۔"

"کسی نے ٹکر مارنے والے کا نمبر دیکھا۔"
"وہ لڑکی گئی تو ہے اپنے ڈرائیور کو بلانے۔ گاڑی ہے ان لڑکیوں کے پاس۔"
مختلف آوازیں تھیں۔
یہ اریب فاطمہ تھی جس کی آنکھیں ذرا سی بات پر آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں۔
اس نے دانتوں سے چادر کا ذرا سا حصہ کاٹا اور پھر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پھاڑ ڈالا۔ اب پھر وہ اس کے سر پر پٹی باندھ رہی تھی۔ لیکن خون تھا کہ بہتا چلا جا رہا تھا۔ یہ سب ایبک نے چند لمحوں میں دیکھ لیا تھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے سب سے پہلے رابیل کی نبض چیک کی تھی۔ اریب فاطمہ ہاتھ میں پٹی پکڑے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
ایبک نے رابیل کا بازو نیچے رکھا اور پھر کھڑا ہوا اور جھکتے ہوئے رابیل کو دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔
"آؤ...!" اس نے ساکت بیٹھی لاریب کو دیکھا تو لاریب کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی وہ کھڑی ہوئی اس کے کپڑے خون آلود تھے۔
لوگوں نے اطراف میں ہو کر ایبک کو راستہ دیا تھا۔ لاریب ایبک کے پیچھے چل رہی تھی اور اب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس کے لب ہل رہے تھے۔ وہ مسلسل دعا مانگ رہی تھی۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کی طرف آتا ہمدان اور اس کے پیچھے آتی منیبہ رک گئی۔
"کیا زیادہ زخمی ہے۔ خون بہت بہہ رہا ہے۔ مائی گاڈ! کیا ہو گا۔" اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہمدان کہہ رہا تھا۔ منیبہ نے لاریب کی طرف دیکھا۔
"حوصلہ کرو لاریب! دعا کرو اللہ رابیل کو زندگی دے گا۔" منیبہ اپنی پریشانی بھول کر اب لاریب فاطمہ کو تسلی دے رہی تھی جس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔
"ہمدان! میری پاکٹ سے گاڑی کی چابی نکالو اور گاڑی لاؤ قریب۔" ایبک نے ایک نظر ہمدان کو دیکھا۔
پٹی باندھنے کے باوجود خون بہنا بند نہیں ہوا تھا۔ رابیل کے سر سے بہنے والے خون سے ایبک کی آستین اور شرٹ خون آلود ہو رہے تھے۔
گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ لاریب فاطمہ کے لب اب بھی مسلسل ہل رہے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور رخسار آنسوؤں سے گیلے ہو رہے تھے۔
"لاریب فاطمہ! آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں اور رابیل کا سر گود میں رکھیں۔ آپ کے کپڑے پہلے ہی خون آلود ہو چکے ہیں۔"
لاریب فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گئی۔
ہمدان کی مدد سے اس نے رابیل کو پچھلی سیٹ پر اس طرح لٹایا کہ لاریب فاطمہ نے اس کا سر اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور ایک بازو اس کے گرد حمائل کر کے اسے سہارا دے رکھا تھا۔
"منیبہ! آپ پلیز اپنی گاڑی میں آئیے۔" ایبک نے پریشان حال کھڑے یاسین کو دیکھا۔
"یاسین تم منیبہ بی بی کو لے کر ہمارے پیچھے آؤ۔"
"ہمدان پلیز ہم نزدیک ترین کسی بھی کلینک اسپتال میں لے چلو جلدی۔"
فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایبک فلک شاہ نے ہمدان شاہ سے کہا جو ہونٹ بھینچے بازو اسٹیئرنگ پر رکھے پیچھے مڑ کر رابیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔
ہمدان نے چونک کر اسے دیکھا۔
"ہاں یہاں آگے کہیں ایک پرائیویٹ کلینک ہے تو سہی۔"
"ٹھیک ہے! وہیں چلو۔ کسی بڑے اسپتال تک جانے میں زیادہ خون بہہ جانے کا خطرہ ہے۔ یہاں سے فرسٹ ایڈ لے کر پھر کسی اسپتال میں چلتے ہیں۔"
بات مکمل کر کے ایبک نے مڑ کر دیکھا۔
لاریب فاطمہ کی نظریں رابیل کے چہرے پر

تھیں۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور رخسار گیلے تھے۔
ایک گہری سانس لے کر ایبک نے رخ موڑ لیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ ایک کلینک کے سامنے تھے۔ گاڑی رکتے ہی ایبک اتر کر تیزی سے اندر کی طرف لپکا۔ ابھی وہ راہداری میں ہی تھا کہ اندر سے آتے ایک شخص نے ایبک کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں یکدم چمک نمودار ہوئی تھی۔
"آپ... آپ ایبک ہیں نا۔ ایبک فلک شاہ؟"
"ہاں۔"
"میں ڈاکٹر حمزہ خالد ہوں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔
"مجھے آپ سے ملنے کا..."
اس کی نظر یکدم ایبک کے خون آلود کپڑوں پر پڑی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ایبک نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
"اس وقت میں بہت پریشان ہوں۔ میری کزن کا یہاں سے کچھ فاصلے پر ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ گاڑی میں ہے پلیز پہلے اس کے لیے کچھ کریں۔" اور ڈاکٹر اسٹریچر لانے کا کہہ کر ایبک کے ساتھ ہی تقریباً دوڑتا ہوا باہر پارکنگ میں کھڑی گاڑی تک آیا۔
اور کچھ ہی دیر بعد رابیل کو اندر تھیٹر میں منتقل کر دیا گیا۔ ڈاکٹر حمزہ انہیں وہیں پر چھوڑ کر ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ تھیٹر میں چلے گئے تھے اور وہ سب وہاں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔
لاریب فاطمہ خاموشی سے کھڑی تھی۔
"بیٹھ جاؤ لاریب فاطمہ پلیز۔" ایبک نے نرمی سے کہا تو لاریب فاطمہ منیبہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"اب کیا ہو گا مونی... رابیل!" اس نے منیبہ کی طرف دیکھا تو منیبہ نے ہولے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔
منیبہ بھی مسلسل دعا مانگ رہی تھی۔
ہمدان اپنے فون پر نمبر ملا رہا تھا۔
"بابا جان کو ایک دم اچانک کچھ مت بتانا ہمدان۔"
"نہیں! میں پاپا کو فون کر رہا ہوں۔ وہ خود بابا جان سے بات کریں گے۔"
"پاپا! میں ہمدان ہوں۔ وہ رابیل کا..."
وہ مصطفیٰ شاہ کو تفصیل بتا رہا تھا جب ایبک اٹھ کر تھیٹر کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ واپس آ گیا تھا۔ لاریب فاطمہ اور منیبہ بیسن کے پاس کھڑی تھیں جو ایک طرف لابی میں ہی لگا ہوا تھا۔ ہاتھ دھو کر لاریب واپس آئی تو ایبک کی نظریں اس کی چادر پر پڑی تھیں اور پھر اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو ٹھہر کر جھک گئی تھیں۔
"منیبہ! تم اور لاریب فاطمہ یاسین کے ساتھ گھر چلی جاؤ... لاریب کے کپڑے..."
"نہیں... نہیں۔" لاریب نے یکدم اس کی بات کاٹی۔ "ابھی نہیں۔ رابیل ہوش میں آ جائے اور ڈاکٹر تسلی دے دے تو پھر چلی جاؤں گی۔"
ایبک خاموش ہو گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر حمزہ تھیٹر سے باہر آئے تھے۔
"اسٹیچز وغیرہ لگ گئے ہیں۔ سر کا زخم گہرا تھا۔ بازو پر ہلکا سا فریکچر ہے۔ لیکن خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ خون کی ضرورت ہو گی۔ کیا بلڈ گروپ ہے آپ کو علم ہے...؟"
"ہاں۔ ہاں او پوزیٹو ہے۔ رابی کا بلڈ گروپ۔ ایک دفعہ ہم نے چیک کروایا تھا۔" منیبہ نے جلدی سے کہا۔
"تو پھر میرا بھی او پازیٹو ہے۔ میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔"
ایبک ڈاکٹر حمزہ کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ لیکن فوراً ہی واپس آ گیا۔
"ہومی... ہومی! آنٹی اور انکل احسان کو فون کر دو۔ میرے خدا... کیا ہونے والا ہے۔ رابی کا سانس اکھڑ رہا ہے۔ یا اللہ! انکل مصطفیٰ کب تک پہنچیں گے؟"

ہمدان نے پریشانی سے اسے دیکھا۔
"کیا بہت حالت خراب ہے۔"
"ہاں۔ شاید۔ ڈاکٹر حمزہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ آکسیجن لگائی ہے۔"
لاریب فاطمہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جوں ہی مڑا بے اختیار اٹھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
"وہ... وہ ٹھیک تو ہو جائیں گی نا۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا۔"
"ان شاء اللہ!"
ایبک نے اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ پر تسلی آمیز انداز میں ہاتھ رکھا اور تیزی سے مڑ گیا۔ لابی کے آخر میں تھیٹر کی طرف مڑنے سے پہلے ایبک نے مڑ کر لاریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔
وہ دونوں ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگ رہی تھی اور اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور عمر کہتا تھا کہ رابیل لاریب فاطمہ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی اور یہ اس طرح رو رو کر اس کے لیے دعا کر رہی ہے جیسے بہت قریبی عزیز ہو۔ اتنے آنسو تو منیبہ نے بھی نہیں بہائے ہوں گے جتنے اب تک یہ بہا چکی ہے۔
"اور یقیناً" لاریب فاطمہ تم ایک انمول دل کی مالک ہو۔"
وہ تھیٹر سے باہر نکلتے ڈاکٹر حمزہ سے بات کرنے لگا تھا اور جب عثمان شاہ اور مصطفیٰ شاہ عمر اور زبیر کے ساتھ وہاں پہنچے تو اسے تھیٹر سے ملحق کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا اور خون کی بوتل لگا دی گئی تھی۔ ہمدان نے اس کے بیڈ کے نزدیک کھڑے کھڑے بغور اسے دیکھا۔ وہ مغرور آنکھیں بند تھیں گلابی لب جن پر اکثر طنز بھری مسکراہٹ ہوتی تھی۔ ان پر پپڑی جمی تھی سفید رنگت میں زردیاں گھلی تھیں۔ ہمدان کے دل کو کچھ ہوا۔
وہ بابا جان کی بہت لاڈلی تھی۔
اور اپنے غرور اور تنگ مزاجی کے باوجود وہ الریان کے ہر فرد کو بہت عزیز تھی۔
اس نے دیکھا۔ عمر اس کے بیڈ کے کنارے پر ٹکا اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اور لحہ لحہ بعد دایاں ہاتھ اٹھا کر ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتا تھا۔ زبیر بھی نم آنکھوں کے ساتھ اس کے سرہانے کھڑا تھا اور مصطفیٰ شاہ، منیبہ سے پوچھ رہے تھے۔
"یہ کیسے ہوا... کیونکر۔"
"ہم لوگ مارکیٹ سے باہر نکل کر دوسری مارکیٹ میں جا رہے تھے۔ وہ بائیک والا لڑکا رانگ سائیڈ سے آیا تھا اس نے رابیل کو ٹکر ماری تھی۔ رابیل گر پڑی تھی۔ میں اور لاریب دو قدم پیچھے تھے۔ ابھی ہم ششدر سے کھڑے تھے کہ ایک گاڑی رابیل سے ٹکراتی ہوئی تیزی سے نکل گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔" اس نے ایک جھرجھری سی لی۔
"مجھے لگا تھا گاڑی نے رابیل کو کچل دیا ہے۔ پھر لاریب فاطمہ کی چیخ پر میں نے آنکھیں کھولی تھیں۔ رابیل کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ لاریب اور میں تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھے تھے۔ لوگ ہمارے اردگرد جمع ہونے لگے تھے۔ لاریب نے اس کا سر گود میں رکھ لیا تھا۔ میں یاسین کو بلانے کے لیے آئی تھی کہ ہمدان اور ایبک نے ہمیں دیکھ لیا۔"
ایبک نے بھی مصطفیٰ شاہ اور عثمان شاہ کے ساتھ منیبہ کی بات پورے دھیان سے سنی تھی۔ تب ہی ڈاکٹر حمزہ اندر آئے تھے۔ انہوں نے ڈرپ کا جائزہ لیا تو مصطفیٰ شاہ نے بے چینی سے پوچھا۔
"کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟"
"نہیں! سر میں اور گردن کے پاس زخم ہے بس۔ خون زیادہ بہہ گیا تھا۔ شکر ہے بلڈ کا بروقت انتظام ہو گیا۔ ایبک شاہ کا بلڈ میچ کر گیا۔"
اور تب ہی عمر احسان شاہ نے بے حد عقیدت اور تشکر سے ایبک فلک شاہ کو دیکھا اس کے دل میں ایبک شاہ کا قد اور بھی بڑھ گیا۔

"تھینک یو... ایبک!" عمر نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا۔
"بکو مت۔" ایبک شاہ نے ہلکا سا ہاتھ اس کے کندھے پر مارا تو ہمدان شاہ کو یاد آیا کہ وہ تو ایبک کے لیے جوس لینے جا رہا تھا اور پھر مصطفیٰ شاہ اور احسان شاہ کو آتے دیکھ کر ان کے ساتھ ہی پلٹ آیا تھا۔
"سوری یار!" وہ ایک دم کھڑا ہوا تھا اور اس نے ایبک کو مخاطب کیا تھا۔
"میں تمہارے لیے جوس لے کر آتا ہوں ڈاکٹر حمزہ نے کہا تھا تمہارے لیے جوس لے آؤں۔"
"آئی ایم فائن یار!" ایبک نے اسے روکتے ہوئے کہا۔
"بیٹھو تم... اور ہاں تم نے انکل احسان کو اور مائدہ آنٹی کو فون کر دیا ہے۔"
"وہاں کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا۔ پھر ایک بار کوشش کرتا ہوں۔"
"ایسا کرو بیٹا! میسج کر دو۔"
مصطفیٰ شاہ نے کہا... وہ راستہ بھر انہیں فون کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہے تھے اور پی ٹی سی ایل پر بھی کوشش کی تھی لیکن مسلسل انگیج کی بیل آ رہی تھی۔
ہمدان نے فون نکالا تو مصطفیٰ شاہ نے منع کر دیا۔
"میں کرتا ہوں خود۔"
"فون کیوں نہیں اٹھا رہے ہو احسان! رابی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ہم اسپتال میں ہیں۔" انہوں نے میسج کیا تو فوراً" ہی بیل بج اٹھی تھی۔ دوسری طرف احسان شاہ تھے۔ "کیا ہوا کیسے... کہاں ہے رابی؟"
وہ بے قراری سے پوچھ رہے تھے۔
"رابی زخمی ہے اور ہوش میں نہیں ہے لیکن ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ خطرہ نہیں ہے پھر بھی..."
"جو بھی پہلی فلائٹ ملتی ہے ہم اسی سے آ رہے ہیں۔"
مصطفیٰ شاہ انہیں تفصیل بتانے لگے تھے اور ڈاکٹر

حمزہ ایبک سے کہہ رہا تھا۔
"میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں ایبک شاہ۔"
"اور یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔" ہمدان نے سوچا۔ "ورنہ کسی اور اسپتال میں جاتے تو یوں فوراً" رابیل کو ٹریٹمنٹ نہ ملتی۔ پہلے تو انکوائری رپورٹ اور شاید پولیس۔
اس بھلے ڈاکٹر نے تو تفصیل جانے بغیر ہی۔۔۔"
فون آف کر کے مصطفیٰ شاہ نے ایبک کی طرف دیکھا۔
"بیٹا! تم چلے جاؤ گھر اور بچیوں کو بھی لے جاؤ۔ کپڑے چینج کر کے آجانا۔"
"لیکن میں یہیں پہ رہوں گی رالی کے پاس۔" منیبہ نے انکار کر دیا۔ "ہاں لاریب کے کپڑے خون سے بھرے ہیں یہ چلی جائے۔"
یہ ایک چھوٹا سا کلینک تھا۔ یہاں کسی پیشنٹ کے رہنے کا انتظام نہیں تھا۔ اس لیے ڈاکٹر حمزہ کے کہنے پر اسے عمر اسپتال منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔
"ڈاکٹر عمر میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ میں انہیں فون کر دوں گا۔"
ڈاکٹر حمزہ کا رویہ بے حد مخلصانہ تھا۔ عمر متاثر ہوا۔
"تھینک یو ڈاکٹر حمزہ!" ایبک نے ڈاکٹر حمزہ کا شکریہ ادا کیا اور پھر لاریب کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور مصطفیٰ شاہ سے کہا۔
"میں لاریب کو "الریان" چھوڑ کر کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔ تب تک شاید رابیل ہوش میں آجائے تو پھر عمر اسپتال چلتے ہیں۔"
بات کر کے اس نے لاریب کی طرف دیکھا جو اپنی چادر درست کر رہی تھی۔ اس کی نظر ایک لمحہ کے لیے چادر کے پھٹے ہوئے حصے پر ٹھہری تھی۔ پھر اس نے لاونجب سے نظریں ہٹالیں۔
"آیئے لاریب فاطمہ!" لاریب اس سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ ایبک نے گاڑی کے پاس پہنچ کر اسے دیکھا۔ اور فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بغیر کچھ کہے بیٹھ گئی تو دروازہ بند کر کے چکر کاٹ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
سر جھکائے بیٹھی لاریب فاطمہ بے حد تھکی ہوئی اداس اور نڈھال لگ رہی تھی۔
"آپ بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ چینج کر کے آرام کر لیجیے گا کچھ دیر۔ بلکہ کوئی سکون آور یا نیند کی ٹیبلٹ لے لیجیے گا۔ ذہن کو سکون ملے گا۔"
ایبک نے گاڑی روڈ پر لا کر ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔
"وہ۔۔۔ رابیل وہ۔۔۔ ڈاکٹر نے آپ سے کیا کہا تھا۔ کیا واقعی خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا تو ایبک مسکرا دیا۔
"خطرے والی کوئی بات نہیں ہے لاریب فاطمہ! ڈاکٹر نے یہی کہا ہے لیکن اطمینان تو تب ہی ہو گا جب وہ ایک بار ہوش میں آجائے۔"
"اللہ کرے، وہ جلدی ہوش میں آجائیں۔ اف خون اتنی تیزی سے نکل رہا تھا کہ میری کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم کیا کریں۔۔۔ شکر ہے آپ اور ہمدان بھائی آگئے ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔ میں گھر جا کر نفل پڑھوں گی۔"
"آپ بہت پریشان تھیں اور ابھی تک ہیں۔"
"مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا، کہیں رابیل کو کچھ ہو نہ جائے۔ بہت دعائیں مانگیں میں نے اللہ سے کہ رابیل کو کچھ نہ ہو۔"
"اللہ نے آپ کی دعا سن لی۔" ایبک ذرا سا رخ موڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "ویسے مائرہ آنٹی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے۔"
"وہ اماں کے کسی کزن کی بیٹی ہیں۔ انکل احسان بھی اماں کے کزن ہیں۔"
لاریب فاطمہ کی نظریں اپنے ہاتھوں پر تھیں۔
"بی اے کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟ ماسٹرز کریں گی؟"
ایبک کا جی چاہ رہا تھا وہ اس سے باتیں کرتا رہے۔ یونہی ادھر ادھر کی باتیں۔ چند لمحے پہلے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اسے بتائے کہ آج صبح وہ اسے کھونے کے کرب

سے گزرا تھا! اسے لگا تھا جیسے اس کے لیے زندگی ختم ہو گئی ہے اور زندگی کے سارے رنگ مر گئے ہیں۔
اور کیا صرف ایک لاریب فاطمہ کے کھو دینے کا احساس زندگی کو اس کے لیے اتنا بے رنگ کر گیا تھا۔ اس وقت اس نے خود سے اعتراف کیا تھا کہ وہ لاریب فاطمہ سے محبت کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کے شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اپنے احساسات اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کی مسکراہٹ اس کے لیے کئی قرنوں کی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اسے پانا اس کے لیے زندگی کی شدید خواہشوں میں سے ایک خواہش ہے لیکن یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب نہ تھا۔ تب ہی اپنے احساسات کو دل میں چھپائے وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔
"پتا نہیں۔۔۔ ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ شاید ابا اجازت دیں، شاید نہ دیں۔" کچھ دیر بعد اس نے کہا۔
"اگر آپ نے ماسٹرز کیا تو کس سبجیکٹ میں اور کہاں سے کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"
"پتا نہیں۔" اس نے پھر کہا تھا۔ "شاید میں واپس چلی جاؤں وہاں رحیم یار خان میں بھی بہاول پور یونیورسٹی کیمپس ہے۔ لیکن ہمارا گھر گاؤں میں ہے چک نمبر 151 پہ۔ ابا ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بھائیوں کو بھی پسند نہیں ہے۔ اس لیے مروہ آنٹی نے مجھے یہاں چھوڑ دیا اتنی دور۔ ابا مان جاتے تو میں وہاں رحیم یار خان میں ہی رہتی۔ یہاں نہ آتی۔"
"آپ یہاں نہ آتیں تو مجھے کیسے ملتیں۔" بے اختیار ایبک کے لبوں سے نکلا تھا۔
لاریب فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو کر مدھم ہوئی تھی وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔
"آپ کو یہاں آنا ہی تھا لاریب فاطمہ! کچھ باتیں لکھ دی جاتی ہیں اور وہ ہونی ہی ہوتی ہیں۔"
لاریب فاطمہ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے نچلے ہونٹ کو کچل رہی تھی اور اس کی پلکیں ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ وہ اس وقت سگنل پر رکے ہوئے تھے۔ وہ اسٹیئرنگ پر بازو رکھے مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ یوں پلکیں جھپکاتی، ہونٹ کچلتی اس کے دل و دماغ کو اسیر کیے دیتی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا تھا اور آج صبح سے اب تک کیا کیا محسوس کیا تھا وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ کم از کم اس وقت نہیں۔ بے وقعتی سے ڈر رہا تھا۔ جذبے دل میں ہوں تو بہت عظیم ہوتے ہیں الفاظ میں ڈھل جائیں تو اکثر اپنی قدر و قیمت کھو دیتے ہیں اور وہ اپنے احساسات کے بے قدر و قیمت ہونے سے ڈرتا تھا۔
ایک ساتھ کئی گاڑیوں کے ہارن بجے تھے۔ اس نے چونک کر گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ اس کے پیچھے گاڑیوں کی ایک لمبی قطار تھی جن کے ہارن مسلسل بج رہے تھے۔
"یورپ میں اگر کوئی اس طرح ہارن بجائے تو فائن ہو جاتا ہے ان پر۔" اس نے ونڈ اسکرین میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہاں ایسا لگتا ہے جیسے ہر شخص بہت جلدی میں ہو۔ ایک رکشے والے سے لے کر بائیک والے تک سب۔ صبر کسی میں نہیں ہے۔"
وہ اپنے ان احساسات سے بچنا چاہ رہا تھا جو اسے ابھی تک گھیرے ہوئے تھے۔
"ہاں!" لاریب نے اس کی تائید کی۔ "راستہ بلاک ہو چکا ہے کوئی ہوا میں تو اڑ کر جا نہیں سکتا۔ لیکن پیچھے والے سچویشن جانتے ہوئے بھی ہارن پر ہارن بجائے جاتے ہیں۔ آپ صحیح کہتے ہیں۔ اماں بھی کہتی ہیں۔ صبر کسی میں نہیں ہے آج کل۔"
"اور حور عین نے صبر مریم سے سیکھا تھا۔ اپنی ماں سے۔"
بے اختیار اپنی ہی کہانی میں لکھا گیا جملہ اس کے لبوں پر تھرتھرایا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ بکھر کر معدوم ہو گئی۔
"پتا نہیں یہ کہانی کب مکمل ہو گی۔۔۔ ہو گی بھی یا نہیں۔"

وہ لاریب سے کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ لیکن "الریان" کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ "الریان" کے گیٹ سے گاڑی اندر لے جا رہا تھا۔

مرینہ اسے لاؤنج میں ہی مل گئی تھی۔

"کیسی ہے وہ اب؟ پاپا کا فون آیا تھا۔ لیکن مجھے تسلی نہیں ہو رہی۔ ایبک بھائی پلیز، آپ مجھے لے جائیں اسپتال۔"

حسب معمول وہ تیز تیز بولتے ہوئے دائیں ہاتھ سے بار بار پھسل آنے والی عینک کو ناک پر درست کر رہی تھی۔

"وہ ٹھیک ہے اب۔ تم پریشان مت ہو۔ بابا جان کیسے ہیں؟"

مرینہ کی نظریں ان کے خون آلود کپڑوں پر تھیں۔

"کیا آپ دونوں بھی زخمی ہیں؟" وہ خوف زدہ سی تھی۔

"نہیں ربنا گڑیا! یہ رابیل کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ میں نے بابا جان کا پوچھا ہے۔"

"بابا جان کو میں نے سکون کے لیے ٹیبلٹ دے دی تھی۔ اس وقت سو رہے ہیں۔ مما اور ربنا آنٹی ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔"

"لیکن میں رابی کو دیکھنا چاہتی ہوں پلیز ایبک بھائی!"

"بابا جان گھر میں اکیلے ہیں۔ کوئی آ جائے گھر میں تو چلی جانا۔ بلکہ میں کپڑے چینج کر کے اسپتال جاتا ہوں تو ہمدان اور منیبہ کو بھیج دیتا ہوں۔ پھر تم آ جانا۔" اس نے لاریب کی طرف دیکھا۔

"آپ پلیز چینج کریں اور کچھ ریسٹ کریں۔" وہ جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ تب ہی مرینہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر سمیرا باہر آئی تھی۔

"مرینہ پلیز۔ میں اب چلتی ہوں۔ تم لوگ خود پریشان ہو۔ ایسے میں میرا یہاں رہنا۔ پھر کبھی آ جاؤں گی۔"

اس نے ایبک کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ مرینہ سے مخاطب تھی۔ ایبک کی نظریں لمحہ بھر کو اس کی طرف اٹھی تھیں پھر جھک گئی تھیں۔ شاید وہ مرینہ کی کوئی سہیلی تھی۔

"یہ ایبک بھائی ہیں۔ ایبک فلک شاہ۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا ان کے متعلق۔ میرے کزن ہیں۔"

ایبک نے اسے چونکتے دیکھا لیکن اس نے کہا کچھ نہیں تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"اور پلیز سمیرا تم پریشان مت ہو۔ میں صرف تھوڑی دیر کے لیے جاؤں گی۔ تم لاریب فاطمہ سے باتیں کرنا۔"

اب کے ایبک چونکا تھا۔

"یہ سمیرا ہے میری دوست۔" مرینہ نے جب بتایا تو وہ واپس کمرے میں جا رہی تھی۔

"تو ہمدان نے اس کے متعلق صحیح ہی کہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی۔ اور اس کا پورا وجود کسی گہری خاموشی میں لپٹا ہوا لگ رہا تھا۔ جب وہ بول رہی تھی تب بھی یہ خاموشی اس کے وجود کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں۔ جب وہ مرینہ کی طرف دیکھ رہی تھی تو اسے لگا تھا جیسے ان آنکھوں سے کوئی الم جھانکتا ہو۔ ایسا الم، ایسا دکھ جو اندر ہی اندر کاٹتا ہو اور وجود کو لہو کرتا ہو۔"

ایبک نے واپس جاتے ہوئے سوچا۔

"اور ہمدان مصطفیٰ شاہ! یہ لڑکی سمیرا بے حد دلکش بھی ہے۔ اس کی گندمی رنگت میں بلا کی ملاحت اور کشش ہے اور اس کی بے نیازی میں دل کھینچ لینے والا سحر ہے۔ اور اگر ہمدان مصطفیٰ کو پتا ہو تا کہ وہ اس وقت "الریان" میں ہے تو وہ تو اڑ کر یہاں پہنچتا اور اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتا۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ گاڑی "الریان" کے گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔



ایبک نے صوفے کی پشت پر سر رکھتے ہوئے

ٹانگیں پھیلائی تھیں۔ آج کا سارا دن ہی بے حد مصروف گزرا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ بہاول پور فون کرے لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔

جب وہ کپڑے تبدیل کرکے اسپتال پہنچا تو مصطفیٰ شاہ اور عثمان شاہ بے حد پریشان تھے۔ رابیل کو ہوش نہیں آیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی نیورو سرجن سے بھی چیک کرالیا جائے۔ کہیں سر پر کوئی اور سیریس اندرونی چوٹ نہ ہو۔ پھر سرجن نے چیک بھی کرالیا کئی ایکسرے ہوئے۔ اسے عمر اسپتال میں منتقل بھی کردیا گیا لیکن وہ بے ہوش تھی۔ عمر اسپتال میں ڈاکٹر عمر کے علاوہ بھی کئی ڈاکٹر جاننے والے تھے۔ سو فوراً" ہی پرائیویٹ روم بھی مل گیا تھا اور ڈاکٹرز چیک بھی کررہے تھے۔ ادھر احسان شاہ اور مائرہ شیخ زید ایرپورٹ پر لاہور کی فلائٹ کے انتظار میں بیٹھے تھے اور بار بار فون کررہے تھے۔

دس بجے کے قریب رابیل نے آنکھیں کھولی تھیں اور عمر احسان شاہ نے جو اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا تھا نم آنکھوں اور روتی آواز کے ساتھ جو پہلی بات رابیل سے کی تھی وہ یہ تھی۔

"رابی آپی! آپ کا بہت خون بہہ گیا تھا اور پتا ہے ایبک بھائی نے آپ کو خون دیا۔"

رابیل کی نظریں ایک لمحہ کے لیے ایبک کی طرف اٹھی تھیں جو دروازے کے پاس کھڑا ہمدان سے کچھ کہہ رہا تھا اور پھر اس نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

"اور یہ عمر بھی بس۔۔۔!" ایبک نے سوچا تھا۔ "اب یہ بھی کوئی کرنے کی بات تھی۔"

وہ ڈاکٹر کو بلانے باہر چلا گیا تھا اور پھر ڈاکٹر نے رابیل کو چیک کرکے سب کو تسلی دی تو سب نے شکر ادا کیا۔ اس وقت تقریباً" سب ہی وہاں موجود تھے۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد مرینہ، ثنا آنٹی اور عثمان انکل واپس الریان چلے گئے تھے۔ لیکن ایبک کو گھر آتے آتے بارہ بج گئے تھے۔

اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی احسان شاہ اور مائرہ بھی پہنچ گئے تھے۔ وہ مصطفیٰ شاہ کو صبح پھر آنے کا کہہ کر چلا آیا تھا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں، لیکن وہ سونا نہیں چاہتا تھا' اس کے اندر لفظوں کا ایک ہجوم تھا۔ خیالات کا ایک بحر بیکراں تھا جو اُمڈ آنے کو بے تاب تھا' اسے سونا نہیں تھا' وہ اٹھا' اپنے لیے کافی بنائی اور پھر کافی پیتے ہوئے اس نے پچھلے لکھے ہوئے چند اوراق کا جائزہ لیا اور کافی ختم کرکے لکھنے بیٹھ گیا۔

"تو مریم اس روز کھڑی جالیوں میں سے باہر دیکھتی تھی' یہ گھڑونچی اندرونی صحن میں بنی تھی اور گھڑونچی کی دیوار میں اینٹیں اس طرح لگی تھیں کہ سوراخ سے بن گئے تھے اور ان سوراخوں یا جالیوں میں سے حویلی کے پیچھے والا میدان دکھتا تھا اور عموماً" گھڑونچیوں کی پچھلی دیوار اس طرح جالی دار بنائی جاتی تھی تاکہ ہوا آتی رہے اور گھڑوں میں پانی ٹھنڈا رہے۔ مریم گھڑونچی کے اوپر بنی الماری کا پٹ کھولے ساکت کھڑی جالیوں سے باہر دیکھتی تھی اور باہر دارو سائیں پیپل کے درخت کے گرد دیوانوں کی طرح چکراتا تھا اور کبھی کبھی اس کے لبوں سے ہوک کی طرح گیت کے بول باہر آتے تھے۔

"نی میں نیل کرائیاں نیلکاں"

مریم ساکت کھڑی سنتی تھی اور اسے یاد نہیں تھا کہ وہ الماری سے کیا نکالنے آئی تھی۔

اور اسے اکثر بھول جاتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے' کبھی وہ کچن میں یوں ہی کھڑی سوچتی رہتی کہ وہ آخر یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

کبھی اسٹور میں' کبھی کمرے میں۔

اور اب بھی اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ الماری سے کیا لینے آئی تھی اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا کہ سعدیہ کب اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی اور جالیوں میں سے دارو سائیں کو دیوانوں کی طرح چکراتے دیکھ رہی تھی۔

سعدیہ چوہدری فرید کی دوسرے نمبر کی بیٹی تھی۔ اس کی پانچوں بیٹیوں میں سے سب سے زیادہ خوب صورت' شوخ اور چنچل' اس کی آنکھیں ہنستی تھیں اور اس کے لبوں پر کلیاں چٹکتی تھیں اور مریم کو پتا نہیں کیوں اس کی ہنسی اور اس کی شوخی خوف زدہ کردیتی تھی اور مریم کی خوف کے ساتھ بھی پرانی سانجھ تھی۔

جب وہ اپنے میکے گھر کے آنگن میں سعدیہ کی طرح تتلی بنی چکراتی تھی' تب بھی یہ خوف اس کے وجود میں پنپتا تھا اور وہ اس خوف سے کبھی الگ نہیں ہوئی تھی۔ رات کو وہ اس خوف کو ساتھ لے کر سوتی اور صبح جاگنے پر وہ اسے اپنے پہلو میں پاتی۔

"یہ دارو سائیں کی آواز میں کتنا سوز' کتنا درد ہے' ہے نا اماں۔ اس کے گائے بول دل میں وحی کی طرح اترتے ہیں اماں اور اندر جل تھل کردیتے ہیں۔" جب سعدیہ نے اس کے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے کہا تھا تو مریم چونکی تھی' سعدیہ کی آنکھیں جگمگ جگمگ کررہی تھیں۔

"نی میں سوہے کیتے دلاں دے"

اس نے بڑے جذب سے گایا تھا اور مسکرائی تھی۔

"اماں! یہ دارو سائیں کو کسی سے محبت تو نہیں ہوگئی تھی۔"

"پیچھے ہٹ۔" مریم کانپ گئی تھی۔ "جھلا ہے' کم نصیب۔"

اور وہ گھڑونچی کے پاس سے ہٹ کر صحن میں بچھے سرخ پایوں والے نواڑی پلنگ پر بیٹھ گئی تھی' لیکن سعدیہ جالیوں میں سے جھانکتی تھی۔

گیت کے بول دہراتی تھی اور جیسے مست ہوئی جاتی تھی۔

اس کی عمر کتنی تھی' صرف سولہ سال اور اس نے سولہ سال کی عمر میں دارو سائیں کی آواز میں سوز اور درد کو کھوج لیا تھا۔

مریم سعدیہ کو کھوجنا چاہتی تھی' لیکن اس نے کوئی کھوج دیا ہی نہیں اور بھلا کوئی کھوج ملتا بھی کیسے' اس کے سپنوں کا شہزادہ تو سید امتیاز علی شاہ تھا' جسے اس نے پہلی بار چھت پر سے باہر والے صحن میں ٹہلتے دیکھا تھا۔

اس کے چھوٹے چاچے چوہدری نوید کا دوست' جو ہر سال ایک بار ان کی حویلی میں آکر ٹھہرتا تھا' چند دنوں کے لیے شکار کھیلنے کے لیے' چاچا نوید کہتا تھا۔

"وہ پرندوں پر گولی نہیں چلاتا' وہ صرف ہرن اور اڑیال کا شکار کرتا ہے' لیکن سعدیہ کے دل کا پرندہ تو زخمی ہوکر پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ کسی ایسے پرندے کی طرح تھی جو دور کہیں جھاڑیوں میں گرا ہو۔

تڑپتا ہو' پھڑپھڑاتا ہو۔ لیکن شکاری اسے ڈھونڈ نہ پائے اور ذبح کرکے اس تکلیف سے نجات نہ دلائے اور وہ وہیں ہی جھاڑیوں میں تڑپ تڑپ کر مرجائے۔

"تو کیا وہ۔۔۔" میں نے اس کے دکھ کو اپنے دل میں محسوس کیا۔

"ہاں۔۔۔" اس کی آواز میں ایک دم صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ "وہ اس کے گھر کے مردوں سے بالکل مختلف تھا۔ نرمی اور آہستگی سے بات کرتا تھا۔ اور اس کے گھر کے مرد تو اتنا اونچا بولتے تھے کہ درختوں پر بیٹھے پرندے سہم کر اڑ جاتے تھے۔ سعدیہ تو اس کی آواز کی نرماہٹ پر مرگئی تھی' کبھی بھڑولے والے کمرے کے روشن دان سے لٹک کر جو باہر مردانے میں کھلتا تھا۔

کبھی باہر والے صحن سے گزرتے ہوئے گیسٹ روم کی کھڑکی کے پاس جان بوجھ کر کسی بہانے سے رک کر وہ اس کی آواز سنتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جیسے ہیرے کی کنیاں دمکتی تھیں۔

اور مریم حیران ہوتی تھی' وہ تو کبھی کسی غیر مرد سے نہیں ملی' کبھی اکیلی گھر سے باہر نہیں گئی' پھر اس کی آنکھیں اتنی جگر جگر کیوں کرتی ہیں۔

اس کی چال میں اتنی مستی کہاں سے آگئی ہے' سیندھ تو گھر کے اندر سے ہی لگی تھی' پر مریم بے خبر تھی اور وہ بھر بھر کلائیوں میں چوڑیاں پہنتی۔

"آنکھوں کو کاجل سے سجاتی اور ذرا سی بات پر کھل کھل کر کے ہنستی۔
پر اس روز اس کی ہنسی اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی تھی' وہ جو پل پل گن کے گزارتی تھی کہ کب موسم بدلے اور کب امتیاز شاہ شکار کھیلنے ان کے گاؤں آئے۔ چوہدری فرید سے بات کرتے چوہدری نوید نے اس کے انتظار کے شیش محل لمحوں میں چکنا چور کردیے تھے۔
"نہ بھاجی! امتیاز شاہ تو امریکا سیٹل ہوگیا ہے' اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ اب اس نے کیا آنا شکار کھیلنے۔"
اور اس کی آنکھوں کی جوت یک دم بجھی تھی اور پھر۔۔۔
حورعین چپ ہوگئی تھی' سر جھکائے اپنی اوڑھنی کے پلو کو اپنی بائیں ہاتھ کی انگلی پر لپیٹتی وہ اتنی تھکی ہوئی' اتنی افسردہ لگ رہی تھی کہ میرا جی چاہا میں اس سے کہوں۔
"حورعین! آؤ میں تمہاری تھکاوٹیں بانٹ لوں اور تمہاری آنکھوں سے نکلنے والے ہر آنسو کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے چن لوں۔" لیکن مجھے اس کی خفگی سے ڈر لگتا تھا' وہ ناراض ہو کر چلی گئی تو۔
میں چپ چاپ اسے انگلی کی پور سے پلکوں پر اٹکے ایک آنسو کو پونچھتے دیکھ رہا تھا۔
"پھر۔۔۔؟"
"پھر کیا؟" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "چالیس اور پچاس کی دہائی کی طرح جالیوں اور جھروکوں اور کواڑوں کے پیچھے سے ایک جھلک کی محبت نے اسے کھالیا' اس کا خوب صورت بدن گھلنے لگا۔ وہ چارپائی پر لیٹی رہتی۔
مریم اسے ڈاکٹروں' حکیموں کے پاس لیے لیے پھری اور اٹھارہویں صدی کی ہیروئن کی طرح اسے ٹی بی ہوگئی تھی۔ اس کے اندر سے زندگی مرگئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے چارپائی پر پڑی رہتی۔
ساکت کھلی کھڑکی سے جب دارو سائیں کی آواز آتی تو وہ ایک دم چونک کر آنکھیں کھول دیتی۔ اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوتی۔
وہ کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرتی اور باہر پیپل تلے دارو سائیں کی آواز بلند ہوتی۔
"اج منصف ہوجا سوہنیا
میں کیتا عشق وکیل"

اور جب دارو سائیں کی آواز آنا بند ہوجاتی تو وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر جاتی' اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہلتے رہتے۔
"اساں سودے کیتے دلاں دے
تے رکھ لے نین"
اس کے سرہانے رکھی میز پر دوائیوں کی شیشیاں بڑھتی گئیں' مریم کے سجدے لمبے ہوتے گئے' لیکن۔۔۔"
اس نے سر جھکالیا۔
"حورعین!" میں نے تڑپ کر اسے دیکھا' تو اس نے سر اٹھایا' اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں' یوں جیسے کسی نے ان میں خون بھر دیا ہو۔
"اس روز زمین اسے اپنی آغوش میں سمیٹے سسکیاں بھرتی تھی۔
اور دارو سائیں دیوانہ وار قبرستان میں چکراتا تھا اور اس کی پرسوز آواز پورے قبرستان میں گونجتی تھی۔
"مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال
دھواں دھکے میرے مرشد والا جاں پھولاں تاں لال
مائے نی میں کنہوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال"
اور مریم قبر کی گیلی مٹی پر رخسار ٹکائے ہولے ہولے سعدیہ کو پکارتی تھی اور روتی تھی اور زمین کے آنسو اس کے ساتھ بہتے تھے اور دارو سائیں کا کپکپاتا ہاتھ ایک لمحہ کے لیے مریم کے سر پر ٹکا تھا اور مریم کی چیخیں نکل گئی تھیں اور دارو سائیں پھر قبرستان میں چکرانے لگا تھا۔
"مائے نی۔۔۔"
اور دارو سائیں کا درد کون جانتا تھا' سوائے مریم کے'

لیکن سعدیہ کا درد تو مریم بھی نہ جان پائی تھی۔
اس رات دارو سائیں پوری رات قبرستان میں چکر اتارہا تھا اور ساری رات زمین نے آنسو بہائے تھے اور زمین تو ہمیشہ ہی ایسے ہیروں کو اپنی آغوش میں چھپائے روتی تھی۔
جب طاعون نے کیسے کیسے لعل پارے اس کی گود میں بھر دیے تھے۔
ان لعل پاروں کی جگہ اس کی گود تو نہیں تھی' انہیں تو کہیں اور دمکنا تھا۔ وہ انہیں گود میں بھرتی جاتی اور روتی جاتی' تمہیں اتنا تو پتا ہوگا نا شاعر! جب تمہارے اس برصغیر میں طاعون نے تباہی مچائی تھی تو ہر گھر سے دو دو' چار چار جنازے اٹھتے تھے اور ایک وقت ایسا آیا تھا کہ انگریز سرکار نے اعلان کردیا تھا کہ پنڈی کو توپوں سے اڑا دیا جائے اور یہ 1918ء تھا۔ جب قحط نے انسانوں کو ہڈیوں کے ڈھانچوں میں بدل دیا تھا اور جب لوگ زمین کھود کھود کر چیونٹیوں کے بلوں سے ان کی جمع شدہ خوراک نکال کر کھاتے تھے' تو زمین اس بے بسی پر روتی تھی اور جب قحط ان کی ہڈیوں سے روح نکال لیتا تھا' وہ کسی مہربان ماں کی طرح ان کو اپنی آغوش میں لے لیتی تھی اور ان کے لیے روتی' آنسو بہاتی تھی' پر اس رات سعدیہ کو آغوش میں لیے وہ اسے تھپکتی تھی اور آہیں بھرتی تھی۔
اور حویلی کے کمروں میں ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے مریم اپنی چیخوں کو روکتی تھی اور ہوا کے دوش پر کبھی کبھی لہراتی' دارو سائیں کی آواز۔
"مائے نی میں کینوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال"
اس کا سینہ چیرتی تھی۔
اور حورعین کی آنکھوں سے آنسو برس پڑے تھے۔
"خدا کے لیے حورعین بس کرو۔" میں بے آواز چیخا تھا۔
"تمہارے آنسو میں اپنی ہتھیلیوں میں سمیٹ نہیں پاتا' انہیں آج میرے سامنے مت بہاؤ' ہاں ایک دن میں تمہارا سر اپنے سینے سے ٹکا کر کہوں گا' یہ سینہ تمہارا ہے' جتنا چاہے بھگولو' بہت کھل کر برس لینا' میں تمہیں سنبھال لوں گا اور تمہارے آنسو بھی سمیٹ لوں گا' لیکن اس وقت مت روؤ' میرا دل پھٹ جائے گا۔"
"ٹن ٹن۔۔۔"
پتا نہیں کب سے موبائل بج رہا تھا۔
ایبک فلک شاہ نے چونک کر ٹیبل پر پڑے موبائل کو دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھا کر اسے اٹھانا چاہا' لیکن بیل بند ہوگئی تھی۔ وہ قلم ہاتھ میں پکڑے یوں ہی خالی خالی نظروں سے ٹیبل کی طرف دیکھ رہا تھا۔
حورعین رو رہی تھی اور اسے کیا لکھنا تھا' وہ سوچنے لگا' تب ہی بیل دوبارہ بج اٹھی تھی' اس نے فون اٹھالیا' دوسری طرف ہمدان تھا۔
"ایبک۔۔۔ ایبک وہ۔۔۔"
"کیا ہوا؟" وہ ایک دم جیسے ہوش میں آیا تھا۔
"کیا ہوا رابیل تو ٹھیک ہے نا؟ اور تم کہاں ہو' ہمدان۔۔۔ بولو نا۔"
"ہاسپٹل میں ہوں اور۔" وہ ایک دم رو پڑا تھا۔
"ہومی۔۔۔ ہومی! کچھ کہو' بولو۔"
لیکن اس نے روتے روتے فون بند کردیا تھا' ایبک نے دو' تین بار اس کا نمبر ملایا' لیکن کوئی جواب نہیں آرہا تھا' اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔



بہاول پور کی وہ صبح بہت خوب صورت تھی یا فلک مراد شاہ کو لگ رہی تھی' انہوں نے آج برسوں بعد عمارہ کو یوں سامنے بٹھائے رکھا تھا' جتنی بار بھی عمارہ نے اٹھنا چاہا' انہوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔
"نہیں عمو! کچھ دیر تو اور بیٹھو' باتیں کرو۔" اور عمارہ کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔
شادی کے ابتدائی دنوں میں بلکہ اس حادثے سے پہلے تک وہ اکثر یوں ہی عمارہ کو اپنے سامنے بٹھالیا کرتے تھے' اٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو' جی چاہتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں تکتا رہوں۔"

وہ جھنجلاتی' کبھی اسے کچن میں ہدایات دینا ہوتیں' کبھی آپی کا کوئی کام ہوتا اور وہ اس کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے رہتے۔

"ٹھیک ہے' میں اجازت نہیں دے رہا جانے کی' تم کو جانا ہے تو چلی جاؤ۔"

اور عمارہ بے بس سی بیٹھی رہتی' لیکن اس حادثے نے تو جیسے سارے استحقاق ختم کردیے تھے' وہ تو عمارہ سے نظریں بھی نہ ملا پاتے تھے' انہوں نے چھبیس سال خود کو کٹہرے میں کھڑا کیے رکھا' وہ خود کو عمارہ کا مجرم سمجھتے تھے' ان کی جذباتیت نے ان کی زندگیوں میں سے چھبیس سال نکال دیے تھے۔

بابا جان آئے تھے۔

مصطفیٰ شاہ آئے تھے۔

ان سے مل کر۔ بابا جان سے دل کا حال کہہ کر بھی' ساری حقیقت بتا کر بھی جیسے دل کا بوجھ کم نہیں ہوا تھا' وہ اندر سے شرمندہ تھے۔ انہوں نے مصطفیٰ شاہ سے نظریں نہیں ملائی تھیں' وہ ان سب کے بھی تو مجرم تھے۔

بابا جان کو بیٹی سے دوری کا عذاب دینے میں احسان شاہ کی طرح برابر کے قصوروار۔ پہل تو انہوں نے کی تھی اور احسان شاہ نے اس دوری پر مہر لگادی تھی' لیکن اصل قصوروار تو وہ تھے۔

احسان شاہ بھلے ان سے خفا ہی رہتا' ان پر "الریان" کے دروازے بند کردیتا' وہ کبھی اس کی غلط فہمی دور نہ کرپاتے' لیکن عمارہ کے لیے تو "الریان" کے دروازے کھلے رہتے' ایک اور انجی تو اپنے ننھیال سے محروم نہ ہوتے' وہ کتنے لوگوں کے مجرم تھے۔

اس احساس نے چھبیس سال انہیں تڑپایا اور رلایا تھا اور ابھی بھی یہ احساس ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا' بابا جان اور مصطفیٰ شاہ کے جانے کے بعد بھی وہ یوں ہی مضطرب اور بے چین تھے' بار بار عمارہ سے معافی مانگتے تھے' لیکن یہ صبح صبح عثمان شاہ نے کیا فسوں پھونکا تھا کہ وہ۔

ان کے سامنے بیٹھی عمارہ نے سوچا تو انہوں نے جیسے ان کی سوچ پڑھ لی اور بہت گہری نظروں سے عمارہ کو دیکھا' عمارہ ان کی نظروں کی حدت محسوس کرکے گھبرائیں تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"عمو! تم آج بھی چھبیس سال پہلے کی طرح میرے سامنے بیٹھنے سے پزل ہوجاتی ہو' لگتا ہے جیسے کچھ بھی نہیں بدلا اور سوچو تو سب کچھ بدل گیا۔"

وہ ذرا سا اداس ہوئے تھے' لیکن پھر عثمان شاہ کی باتیں یاد کرکے ان کا دل ہلکا پھلکا ہوگیا' عثمان شاہ نے کہا تھا۔

"موی! ہمیں معاف کردو' ہم سے بھی بڑی غلطی ہوئی' ہم نے شانی کی دھمکی سنی اور یقین کرکے ہاتھ پیر چھوڑ کر بیٹھ گئے' کیا تم اور عمارہ اتنے غیر اہم' اتنے پرائے تھے کہ ہم نے سب کچھ بڑی آسانی سے قبول کرلیا کہ ہاں ٹھیک ہے' ایسا ہی ہے' عمو اور موی نہ سہی تو زندگیوں میں کوئی فرق نہ پڑے گا' ہم سب اپنے اپنے گھروں میں' اپنے اپنے بچوں کے ساتھ خوش تھے۔ اماں شاید سچ ہی کہتی تھیں کہ اولاد ہوجائے تو پھر بہن' بھائی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یار! پیچھے تو ہوتے ہیں' اولاد کے بعد سہی' لیکن ہم نے تو تمہیں اور عمو کو قطار سے ہی نکال دیا' جیسے تم کبھی اس قطار کا حصہ تھے ہی نہیں اور ہم نے کبھی اماں جان اور بابا جان کا سوچا ہی نہیں' عمو جن کی اولاد تھی' عمو سے میری سفارش کرنا موی! ۔ اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی' وہ جب یہاں آئی تو میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا' معافی بھی نہیں مانگ پایا۔

تم ہمیشہ سے جذباتی تھے موی! ہم سب جانتے تھے' شانی نے تمہیں ضرور ہرٹ کیا ہوگا' ہمیں تو چاہیے تھا کہ اس کو کان سے پکڑ کر تمہارے پاس لاتے کہ لو دونوں لڑ جھگڑ لو اور دل صاف کرلو' ایک دوسرے سے کہہ سن لو' ہم سے بڑی غلطی ہوئی' لیکن یہ سب لکھا جاچکا تھا' ایسا ہی ہونا تھا میری جان! ہمیں معاف کردو۔"

ہمیشہ کے کم گو سے عثمان شاہ کی اتنی طویل گفتگو فلک شاہ نے خاموشی سے سنی تھی۔

"مجھے تو خود آپ سے معافی مانگنی ہے' میرے غصے نے اور۔۔۔"

"بس اب مزید اس پر بات نہیں ہوگی' موی! اب ماضی پر رونے کے بجائے حال کے گزرتے لمحوں کو پکڑنا ہے' تم اور عمارہ لاہور آنے کی تیاری کرو' عادل کی منگنی ہے حفصہ کے ساتھ اور تمہیں انجی' جواد سب کو آنا ہے۔"

"کہاں۔۔۔ ہم کہاں آئیں گے عثمان بھائی! کرنل شیر دل کے گھر یا ہوٹل میں۔" ان کے لبوں سے سسکی نکل گئی تھی۔

"ایسے تو زخموں کے ٹانکے ادھڑ جائیں گے اور جو شانی نے ہمیں ہال سے ہی نکال دیا تو۔۔۔"

"عمارہ اپنے میکے گھر' اپنے بابا جان کے پاس آئے گی موی اور شانی سے تو اب میں نمٹ لوں گا۔"

عثمان شاہ کی آواز میں چہکار تھی اور فلک شاہ کا دل ڈوب گیا تھا۔ عمارہ کا میکہ تو انہوں نے عمارہ کے لیے اور اپنے لیے شجر ممنوعہ بنادیا تھا۔

"گھر اینٹ' پتھر اور چونے کی چار دیواری سے ہوتا موی! عمارہ کا میکہ وہی ہے جہاں عمارہ کے گھر والے ہوں گے' بابا جان ملک صاحب والا گھر لے رہے ہیں۔ مصطفیٰ بھائی ابھی ملک صاحب سے ہی بات کرنے گئے ہیں۔"

وہ خوشی سے سرشار تفصیل بتانے لگے تھے۔

"عثمان بھائی نے ایسا کیا کہہ دیا موی جو آپ۔۔۔" عمارہ نے پوچھا تو وہ چونکے۔

"عمارہ! بابا جان! ہمارے لیے گھر لے رہے ہیں' جہاں تم جاکر ان کے ساتھ رہوگی۔ وہ تمہیں تمہارا میکہ لوٹا رہے ہیں' جو میری وجہ سے چھن گیا تھا۔"

"اور آپ؟" عمارہ کی نظریں ان پر تھیں۔

"میں۔۔۔ میں بھلا وہاں کیسے جاسکتا ہوں عمو! احسان شاہ۔"

"تو میں آپ کے بغیر جب پہلے نہیں گئی تو اب کیوں جاؤں گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں لیکن انہوں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

"اب جانے میں اور پہلے جانے میں بہت فرق ہے اور میں آج بہت خوش ہوں عمو! تمہارے میکے کا مان تمہیں مل جائے گا۔ تم عادل اور حفصہ کی منگنی میں شریک ہونا' جیسے عورت میکے کی کسی تقریب میں شرکت کے لیے خوش خوش تیار ہوتی ہے۔ تم بھی خوشی خوشی تیاری کرو۔ تمہیں تیاری کرتے دیکھ کر میں بہت خوش ہوں گا' انجی اور جواد بھی تمہارے ساتھ جائیں گے' یہ خواب ان چھبیس سالوں میں کتنی بار دیکھا ہے میں نے اور تم نے بھی۔"

"لیکن میرے خوابوں میں آپ بھی میرے ساتھ تھے موی! اور مجھے اپنے خواب کی پوری تعبیر چاہیے' آدھی نہیں۔"

عمارہ مسکرائیں اور پھر سے انہیں "الریان" کی تقریبات یاد آگئیں۔

بہت کچھ یاد آکر آنکھیں نم کرگیا تو فلک شاہ تڑپ اٹھے۔

"او کے' ٹھیک ہے لیکن عمو! مجھ معذور کا بوجھ کہاں اٹھاتی پھوگی۔"

اور عمارہ نے ایک ناراض نظر ان پر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے پھر ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

"اچھا ناراض تو مت ہو جو حکم تمہارا۔"

وہی چھبیس سال پہلے والا انداز' وہی لہجہ' وہی جملے۔

"سزا دے لو' لیکن ناراض مت ہوا کرو۔" اور ہمیشہ کی طرح عمارہ کوئی بحث کیے بغیر بولی تھیں۔

"یہ فنکشن ہے کب؟"

"پتا نہیں عثمان بھائی نے بتایا نہیں' لیکن جلد ہی ہوگا۔ انہیں واپس بھی تو جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے' بابا جان گھر لے لیں تو ہم چلیں گے' ایک سے بات ہوئی آپ کی؟"

"نہیں جب سے بابا جان گئے ہیں بات ہی نہیں ہوئی ہم کرو نا۔"

"میں نے کچھ دیر پہلے کیا تھا اس نے اٹینڈ نہیں کیا۔ شاید سو رہا تھا' آپ کے لیے چائے بنا لاؤں' پھر کرتی ہوں۔ اسے تو بابا جان کے لاہور جانے کا بھی نہیں پتا ہوگا' مصطفیٰ بھائی اچانک ہی تو آئے تھے۔"

"آج چائے رہنے دو' جی نہیں چاہ رہا' تمہیں یاد ہے وہ عبدالغفور کا چائے کا کھوکھا۔۔۔ الریان سے نکل کر روڈ پر آنے سے پہلے کونے میں' کبھی کبھی جب میں اور شانی سردی میں وہاں کی کڑک چائے پینے رات نو بجے چپکے سے جاتے تھے تو تم بھی ساتھ چل پڑتی تھیں اور پھر چائے پی کر کتنے برے برے منہ بناتی تھیں۔

"اتنا میٹھا ہونٹ چپک گئے۔۔۔ اتنا دودھ یہ چائے ہے یا دودھ کا شربت۔"

"ہاں۔۔۔" عمارہ مسکرائیں۔ "پتا نہیں آپ کو اور شانی کو وہ عبدالغفور چاچا کی چائے اتنی پسند کیوں تھی۔"

"ہمیں عبدالغفور چاچا پسند تھا' اس کی سادگی' اس کا خلوص' اس کی محبت۔"

چائے کے ساتھ پتا نہیں اور کیا' کیا کچھ یاد آگیا تھا اور وہ جیسے کسی خواب کے عالم میں بول رہے تھے۔

"یاد ہے نا عمو! شانی کے ساتھ کبھی کبھی تم بھی تو زبردستی زارا کا ہاتھ تھام کر ساتھ چل پڑتی تھیں اور زارا کو تو ہم انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔ شاہ عالمی کی قلفی اتنی بار کھائی کہ پھر مزا ہی نہیں رہا' لکشمی کے دال چاول اور کڑاہی اور سبز چائے' انار کلی میں بانو بازار کی چاٹ اور نیشنل لاء کالج کی الحمرا آرٹ کونسل کے باہر مٹکے والے سے شکر اور ستو کا شربت اور۔۔۔"

"اور اماں جان کی ڈانٹ؟" عمارہ ان کی بات کاٹ کر کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔

اور وہ مسرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ کتنے سالوں بعد وہ اس طرح پورے دل سے ہنسی تھیں۔

"ایک سے کہوں گا' مجھے ان ساری جگہوں پر لے جائے جہاں میں شانی کے ساتھ جایا کرتا تھا۔"

کیا' کیا یاد آگیا تھا' ریگل سینما کی انگلش فلمیں' گلشن اقبال کے فوارے' شادمان کی شوخ و چنچل نوعمر لڑکیاں' جناح پارک کے اونچے درخت' اسٹیج ڈرامے' ماڈل ٹاؤن کے سیخ کباب۔ اور ماڈل ٹاؤن میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا گھر اور اس میں آرٹ کی نمائندگی کرتے پیتل سلیج گلیکسی شاپنگ پلازہ کی پھسلواں ماربل کی سیڑھیاں۔

کیا' کیا کچھ یاد آرہا تھا' وہ ایسے یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب عمارہ گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے کا کپ ان کے پاس رکھ کر چلی گئی تھیں۔ چائے کی خوشبو ان کے اطراف پھیلی ہوئی تھی اور وہ لاہور کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔

اور یہ مسلسل فون کی بجتی گھنٹی تھی' جو انہیں ان گلیوں سے باہر لائی تھی۔ وہ چونک کر کچھ دیر یوں ہی خالی خالی نظروں سے پاس پڑے فون کو تکتے رہے۔ بیل بند ہوگئی تو انہیں خیال آیا کہ انہیں ریسیور اٹھانا چاہیے تھا' جانے کس کا فون تھا۔ عمارہ ضرور ادھر ادھر ہوگئیں' ورنہ باہر والا فون اٹھا لیتیں۔ بیل دوبارہ ہونے لگی تھی' اب انہوں نے فوراً" ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!" ان کے ہیلو کہنے پر دوسری طرف سے کوئی اجنبی آواز سنائی دی تھی' بولنے والی کوئی خاتون تھی۔

"مجھے فلک شاہ سے بات کرنا ہے۔"

"جی میں فلک شاہ ہی بول رہا ہوں۔ آپ کون۔"

دوسری طرف لمحہ بھر کے لیے خاموشی چھا گئی' پھر ایرپیس سے آواز آئی۔

"مائرہ۔۔۔" "مائرہ احسان شاہ۔۔۔"

"مائرہ۔۔۔" انہوں نے بے حد حیرت سے ہاتھ میں پکڑے ریسیور کو دیکھا۔ بھلا مائرہ نے اب اتنے سالوں بعد کیوں فون کیا ہے یہاں' کیا وہ شرمندہ ہے' کیا اب سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے۔ اتنے سالوں بعد۔ کیا وہ احسان شاہ کو سب کچھ بتا دے گی' جو سچ تھا وہ۔

ایک دم ہی بہت ساری خوش فہمیوں نے انہیں گھیر لیا اور انہوں نے سوچا آج کی صبح واقعی بہت خوب صورت ہے اور جب وہ بولے تو ان کی آواز سے خوشی

کا تاثر ملتا تھا۔

"مائرہ بھابھی! آپ کو ہمارا نمبر کہاں سے اور کیسے ملا؟"

"یہ نمبر تھا فلک شاہ! تم نہیں تھے' جو نہ ملتے۔"

اور وہ ششدر رہ گئے۔ ان کا ریسیور والا ہاتھ کانپ گیا۔

یہ مائرہ اتنے سالوں بعد کیا کہہ رہی تھی' جب ان کے بچے جوان ہوگئے تھے۔

"مائرہ بھابھی۔۔۔!" وہ کچھ کہنا چاہتے تھے کہ مائرہ نے سختی سے ٹوک دیا۔

"میں نے اس رشتے کا حق تمہیں کبھی نہیں دیا موی! میں تمہاری بھابھی نہیں ہوں اور نہ ہی احسان شاہ تمہارا بھائی ہے۔ شاید کبھی اس نے بھائی کہا ہو لیکن اب وہ تمہیں اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔ اس کی بیوی پر بری نظر ڈالنے والا اس کا بھائی نہیں ہو سکتا۔"

"شٹ اپ مائرہ! اس سے آگے ایک لفظ بھی کہا تو۔"

"تو کیا کرو گے؟" وہ عجیب طرح سے ہنسی۔

"مائرہ۔۔۔!" ان کی آواز کانپنے لگی تھی' ان کے اندر مسلسل الارم بج رہا تھا۔

فلک شاہ اپنے غصے پر کنٹرول رکھو' اس غصے نے ان کی زندگی میں سے چھبیس سال نکال دیے تھے۔

"چپ کیوں ہوگئے' بولو' کہو۔" مائرہ کی آواز انہیں مذاق اڑاتی ہوئی سی لگی' تاہم انہوں نے بہت تحمل سے کہا۔

"آپ اصل بات کریں مائرہ! آپ نے فون کیوں کیا ہے؟"

"میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتی فلک شاہ! ہم سے دور رہو' میں تم سے نفرت کرتی ہوں' اتنی شدید کہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میری بات اچھی طرح سن اور سمجھ لو' میرے اندر یہ جو نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے' یہ بجھی نہیں ہے' ایسا نہ ہو کہ اب کے یہ آگ تمہیں جلا کر بھسم کر دے' تمہارا رہا سہا بھرم بھی ختم ہو جائے۔"

"ضروری تو نہیں مائرہ احسان کہ جیت ہمیشہ تمہاری ہی ہو۔" انہوں نے حیرت انگیز تحمل سے کہا۔

"لوگ تو وہی دیکھیں گے جو انہیں دکھایا جائے گا' فلک شاہ! کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ اور حفصہ اور عادل کی منگنی میں شرکت کرنے کے لیے مت آنا۔ بابا جان عمارہ سے اور تم سے مل لیے' مصطفیٰ بھائی بھی مل لیے' اسی پر اکتفا کرلو' میں سر عام تمہارا پول کھول دوں گی' بتا دوں گی سب کو کہ تم کیا تھے۔"

"وہ سب جھوٹ تھا' ڈراما تھا جو تم نے کیا' تم جانتی ہو کہ حقیقت کیا ہے۔" وہ بے حد برداشت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

"ہاں میں جانتی ہوں' لیکن لوگ نہیں جانتے فلک شاہ! میری گواہی احسان دے گا' تمہاری گواہی کون دے گا؟" وہ پھر ہنسی تھی۔

"میری گواہی اللہ دے گا مائرہ احسان شاہ۔" ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

ایک لمحہ کے توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔

"میری بات کو مذاق مت سمجھنا فلک اور مت آنا یہاں' ورنہ اپنے بچوں سے بھی نظر نہ ملا سکو گے۔"

اس نے ایک دم ہی فون بند کر دیا تھا۔ ریسیور سے ٹوں ٹوں کی آواز آنے لگی۔ وہ کچھ دیر تک یوں ہی ریسیور ہاتھ میں تھامے رہے' پھر ایک گہری سانس لے کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور چائے کی طرف دیکھا جو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

"تو تم چاہتی ہو مائرہ احسان شاہ! کہ ہم عادل اور حفصہ کی منگنی میں شرکت کے لیے نہ آئیں۔ شاید میں پہلے نہ آتا' لیکن اب میں ضرور آؤں گا' چاہے بابا جان الگ گھر لیں یا نہ لیں۔"

وہ جیسے دل ہی دل میں فیصلہ کر رہے تھے اور پھر فیصلہ کرنے کے بعد جیسے وہ مطمئن سے ہو گئے تھے۔ وہ اپنی وہیل چیئر کے پہیے گھماتے ہوئے وہ باہر آئے۔ عمارہ کچن میں تھیں۔

"عمارہ!" انہوں نے باہر سے آواز دی۔ عمارہ صافی سے ہاتھ پونچھتی ہوئی باہر آئیں۔

"چائے ٹھنڈی ہو گئی تھی' عمارہ پلیز' اگر ہو سکے تو ایک کپ بنا دو۔"

اور عمارہ خوشی سے نہال ہو گئیں۔ کتنے سالوں بعد انہوں نے کوئی فرمائش کی تھی' ورنہ ان چھبیس سالوں میں انہوں نے خود سے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں کہا تھا' بس ہمیشہ شرمندہ سے نگاہیں جھکائے رہتے تھے۔

"آپ چلیں' میں ابھی لے کر آتی ہوں۔"

عمارہ کو بھی آج کی صبح بہت روشن اور چمک دار لگی تھی۔

وہ وہیل چیر اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے کوریڈور میں رکھے فون اسٹینڈ کے پاس ٹھہر گئے۔ فون کی بیل ہو رہی تھی' انہوں نے جھک کر سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔

یہ وہی نمبر تھا جس سے ابھی کچھ دیر پہلے کال آئی تھی۔ لمحہ بھر سوچنے کے بعد انہوں نے ریسیور اٹھا لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑی روانی سے فون پر عربی میں باتیں کرتا ہوا اچانک اپنے پیچھے آنے والے شخص کی طرف مڑا' مسکرایا اور فون پر الوداعی جملے کہہ کر فون کر دیا۔

"سوری طیب خان! میں تمہیں ایرپورٹ پر لینے نہیں آسکا۔ کچھ مہمان آگئے تھے دبئی سے۔ ان کے لیے کچھ انتظام کرنا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" طیب خان مسکرایا۔

وہ اپنے مخصوص لباس میں تھا۔ سر پر پنجول سبز رنگ کی افغان جیکٹ اور کلاشنکوف زیب تن کیے ہوئے تھا۔ داڑھی پہلے کی نسبت زیادہ لمبی تھی۔

"میرا ارادہ تو بائے روڈ آنے کا تھا لیکن پھر تمہارا پیغام ملا کہ بائی ایر پہنچو۔ سب خیریت تو ہے نا۔ کوئی پرابلم؟"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔" اب دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

پورچ بہت بڑا تھا۔ بیک وقت دس بارہ گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ اس وقت بھی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک وہی تھی جس میں وہ ایرپورٹ سے آیا تھا۔

طیب نے سراہتی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ گیٹ میں بائیں طرف وسیع پورچ تھا اور دائیں طرف بہت خوبصورت اور وسیع لان' جس میں پلاسٹک کی چند کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ مالی لان میں مصروف تھا۔ پھولوں کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو طیب خان؟"

"بہت خوبصورت' بہت شان دار گھر ہے تمہارا۔"

"گھر نہیں' عارضی ٹھکانہ کہو۔ آج یہاں ہیں کل نہ جانے کہاں ہوں گے۔"

پورچ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ ایک لمحہ کے لیے رکا تھا۔ پانچ سیڑھیوں کے بعد لکڑی کا منقش دروازہ تھا' جو زمین سے چھت تک تھا۔ دروازے کے سامنے پہنچتے ہی دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ شاید کوئی اندر سے دیکھ رہا تھا جس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی طیب خان نے دروازہ کھولنے والے کو دیکھنا چاہا' وہ ایک دبلی پتلی سانولی سی لڑکی تھی شاید ملازمہ۔

یہ سٹنگ روم تھا' یہاں سے ایک محراب ٹی وی لاؤنج کی طرف تھی' جس پر جالی کا بے حد خوب صورت پردہ تھا' جبکہ ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی سٹنگ روم میں ہی کھل رہا تھا' یہ بھی لکڑی کا ایک منقش بھاری دروازہ تھا۔ طیب خان اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا اور بیٹھتے ہی بولا۔

"کمال کا بھیس بدلا ہے تم نے رچی! میں پہلی نظر میں تو تمہیں پہچان ہی نہیں سکا اور پھر تمہارا عربی لب و لہجہ۔ جو شخص تمہیں پہلے سے نہ جانتا ہو وہ تمہیں عرب ہی سمجھے گا۔"

رچی اس وقت مکمل عربی لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں سچے موتیوں کی تسبیح تھی' جسے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کلائی پر لپیٹ لیا تھا۔

رچی مسکرا دیا۔

"میں ایک بار پہلے بھی ضلع رحیم یار خان آیا تھا صادق آباد میں باس سے ملنے۔ بہت خوب صورت جگہ ہے' ویسے ایک بات ہے' پاکستان ایک بہت خوب صورت ملک ہے۔"

"واقعی اس میں سب کچھ ہے۔ ندی' نہریں' پہاڑ' وادیاں' میدان' صحرا' معدنیات۔"

"تب ہی تو تم اس پر دانت لگائے بیٹھے ہو۔" طیب ہنسا۔

"رال تو تمہاری بھی ٹپکتی ہے۔"

"ہا۔ ہا۔" اب کے طیب بہت زور سے ہنسا تھا۔

"ہمارا معاملہ اور ہے رچی میڈ! ہمیں لگتا ہے کہ اس ملک پر ہمارا حق ہے' یہ ہمیں واپس ملنا چاہیے۔"

"اچھا۔" رچی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "تو تم یہ خواب بھی دیکھتے ہو۔"

"تم یہ بتاؤ کہ آخر تم نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا ہے۔ میں اپنے بہت سے کام ادھورے چھوڑ کر آیا ہوں۔"

رچی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا' وہ کچھ دیر تک عربی میں بات کرتا رہا۔ بات ختم کرنے کے بعد اس نے طیب کی طرف دیکھا' جو ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمہارے مہمان کیا عرب ہیں؟"

"ہاں!"

"کوئی خاص؟" طیب نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں لبے ضرر سے دبئی کے شیخ ہیں۔ تیل کی دولت خرچ کرنے آئے ہیں۔" وہ ہنسا۔

"میں نے سنا تھا یہاں رحیم یار خان میں عرب شیخ نے محل وغیرہ بنا رکھے ہیں اور شکار کھیلنے آتے ہیں۔"

"صحیح سنا تم نے' اچھا یہ بتاؤ تمہارا مشن کیسا رہا؟"

"کامیاب!" طیب خان مسکرایا۔

"ہاں تو رچی!"

"رچی نہ کہو۔" رچی نے اسے ٹوک دیا۔

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

"تو کیا کہوں' لارنس آف عربیا؟"

"ہشت۔" رچی نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "شیخ عبدالعزیز۔ کئی سال پہلے پاکستان آیا تھا اور یہیں کا ہو کر رہ گیا' مسقط میرا وطن ہے اور کوئی دو سال پہلے میں نے رہائش کے لیے ضلع رحیم یار خان کے اس شہر صادق آباد کو اپنے لیے پسند کیا۔"

رچی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' طیب بھی مسکرا دیا۔ ملازم ٹرے میں جوس کے گلاس رکھے اندر آیا۔ رچی نے جوس کا گلاس لیتے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا۔

"جیسے ہی چک والے مہمان آئیں' مجھے اطلاع دو۔"

لڑکا سر خم کرتا ہوا چلا گیا۔

"میرا خیال تھا کہ تم اس وقت آرام کرتے' رات میں تفصیل سے بات ہوتی' لیکن تم کچھ بے چین نظر آرہے ہو تو مختصراً کچھ بتا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" طیب خان نے جوس کا گھونٹ لیا۔

"تم لوگوں نے صادق آباد کو ہی اپنا ہیڈ کوارٹر کیوں بنایا' لاہور میں نہ سہی' آس پاس ادھر ادھر کئی چھوٹے بڑے شہر تھے۔"

رچی مسکرایا۔

"یہ پانچ سال پہلے ہی طے ہو گیا تھا' جب ہم نے عارضی طور پر پاکستان چھوڑا تھا کہ اب ہم ضلع رحیم یار خان میں ٹھکانا بنائیں گے اور صرف صادق آباد میں ہی نہیں' رحیم یار خان سٹی اور ایک دو اور جگہوں پر بھی ہمارے ٹھکانے ہیں' رہی صادق آباد کی بات تو یہ دیکھو۔"

اس نے چغے کی جیب سے ایک رول کیا ہوا چھوٹا سا نقشہ نکالا اور اسے سامنے موجود ٹیبل پر پھیلا دیا۔

"یہ دیکھ رہے ہو۔ یہ ضلع رحیم یار خان کا نقشہ ہے اور یہ اس کی تحصیل صادق آباد ہے۔ یہ دیکھو! اس کے جنوب میں انڈیا کا بارڈر ہے اور یہ مغرب میں گھوٹکی ہے۔"

رچی بتا رہا تھا اور طیب خان معنی خیز انداز میں سر ہلا

رہا تھا۔

"مان لیا شیخ عبدالعزیز! تمہارے بڑوں کی سوچ بہت دور تک ہے۔"

"ہوں!" رچی سیدھا ہوا اور جوس کا گلاس اٹھا کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"احمد رضا کیسا جا رہا ہے؟"

"حیرت انگیز۔۔۔ ونڈر فل۔ ایک سال میں اس نے بے شمار نوجوان طلبا اور طالبات کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، کھنچے چلے آرہے ہیں اس کی طرف۔"

"پائیڈ پائپر۔" وہ ہولے سے ہنسا۔

"کمال ہے، میں نے پشاور سے لاہور تک اس ایک سال میں کئی چکر لگائے ہیں، لیکن میری اس سے ملاقات نہیں ہوسکی۔"

"اس بار کام کرنے کا طریقہ مختلف ہے۔ ہم سب الگ الگ ہیں، الویرا، نتاشا، جان سوات میں ہیں۔ رباب حیدر ان کے ساتھ ہے اور۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر گلاس میں بچا آخری گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور خالی گلاس میز پر رکھا۔

"میٹنگ میں کل شام تمہاری سب سے ملاقات ہوگی۔"

"او تو کیا سب کو بلایا ہے؟"

"ہوں!" رچی نے سر ہلایا۔

"نیویارک سے باس بھی آرہے ہیں۔"

"اچھا!" تب ہی ملازم لڑکے اندر آیا، لڑکے کی عمر پندرہ، سولہ سال تھی۔

"سر! چک والے مہمان آگئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، انہیں ادھر ہی لے آؤ اور چائے وغیرہ۔"

"یس سر! لا رہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد دو جوان اندر داخل ہوئے۔

"مرحبا، مرحبا!" رچی نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ طیب غور سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک کی عمر کوئی تیس سال کے قریب ہوگی اور دوسرا اس سے کچھ چھوٹا ہوگا، دو تین سال۔

"یہ عظمت یار ہیں اور یہ اسفند یار۔" رچی نے تعارف کروایا۔

"اور یہ ہمارے دوست ہیں طیب خان۔ افغانستان سے تعلق ہے ان کا، مجاہد ہیں، جہاد افغانستان میں حصہ لیا، بہت نیک اور پرہیزگار ہیں اور اب پھر امریکا نے چڑھائی کی تو تب بھی انہوں نے بھرپور حصہ لیا، اسامہ کے ساتھیوں میں سے تھے۔"

"آپ نے اسامہ کو دیکھا ہے، ملے ہیں، وہ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟"

نسبتاً" کم عمر والے نے بڑے جوش سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"ملاقات تو نہیں ہوئی، البتہ دور سے دیکھا تھا اور زندہ ہیں یا مر چکے ہیں، علم نہیں ہے۔"

طیب خان نے بھی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور دوسرے لڑکے سے مصافحہ کرنے لگا۔

"یہ دونوں بڑے محب وطن اور مخلص لڑکے ہیں۔ چک نمبر 151 سے تعلق ہے ان کا۔ یہ اپنے گاؤں کے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں، ہم نے ان سے ان کی کچھ زمین خریدی ہے۔ بنجر تھی، وہاں ہم ایک ادارہ بنا رہے ہیں، جو دنیا کی خواتین کی مدد کرے گا، وہاں ہم ورکشاپ کروائیں گے، خواتین کو سلائی کڑھائی اور دوسری دستکاریاں سکھائی جائیں گی اور اگر ان کے کوئی مسائل ہیں تو وہ بھی حل کیے جائیں گے۔ بغیر کسی سود کے، گھریلو دستکاریوں کے لیے قرضے دیے جائیں گے۔"

"اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔"

اسفند یار کی آنکھوں میں عقیدت اور ممنونیت تھی۔

"یہ دنیا تو عارضی ٹھکانہ ہے بھائی! ہم سب نے ایک دن چلے جانا ہے۔ یہ صدقہ جاریہ ہے۔ جس کا اجر صرف اس خدائے عظیم کے پاس ہے۔"

طیب نے دیکھا کہ تسبیح کلائی سے اتر کر نہ جانے کب اس کے ہاتھوں میں آگئی تھی اور اب دانے مسلسل نیچے گر رہے تھے۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اس کار خیر میں ہمیں بھی اپنا حصہ شامل کرنے دیتے۔ ہم نے تو کہا تھا کہ زمین ہم یوں ہی اس ادارے کے لیے دے دیتے ہیں۔" عظمت یار نے بھی عقیدت میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"ارے نہیں میرے بھائی!" رچی نے پاس بیٹھے عظمت یار کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"یہ کیا کم ہے جو آپ کر رہے ہیں اور عمارت کی تعمیر کی نگرانی بھی کر رہے ہیں۔ بہت مواقع ملیں گے آپ کو راہ خدا میں خرچ کرنے کو، ابھی تو ہمیں کچھ کرنے دیں، ہم تو مسافر پنچھی ہیں، ہم چلے جائیں گے تو سب کچھ آپ کو ہی کرنا ہوگا۔"

"ارے نہیں شیخ صاحب! جانے کی بات مت کریں۔" اسفند یار نے بے اختیار کہا تھا۔ "آپ جیسے لوگ تو قوموں کا سرمایہ ہوتے ہیں۔"

"ابھی تو یہاں ہیں۔ جب حکم ہوا تب ہی رخت سفر باندھیں گے، ہم تو اس کی مرضی اور اشارے پر چلتے ہیں۔" اس نے ہاتھ کی انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔

لڑکا سامان سے بھری ٹرالی لیے اندر آیا اور پیش کرنے لگا، ٹرالی میں کیک، نگٹس، روسٹ، بٹیریں، کباب اور کئی طرح کے بسکٹ تھے۔

اسفند یار اور عظمت یار نے ایک ایک کباب اپنی پلیٹ میں رکھا۔

"تکلف بالکل نہیں چلے گا جناب!" رچی نے خود ایک ایک بٹیر اٹھا کر ان کی پلیٹ میں رکھا۔

"میرا کک بہت بہترین بٹیر روسٹ کرتا ہے، میرے ملکی اور غیر ملکی مہمان فرمائشیں کر کے بنواتے ہیں اور آج تو بطور خاص میں نے آپ کے لیے روسٹ کرنے کو کہے تھے۔"

دونوں کی آنکھوں میں تشکر نظر آیا اور وہ بے حد رغبت سے کھانے لگے۔ رچی کا فون ایک بار پھر بج اٹھا تھا۔ دوسری طرف شاید اس کے وہی مہمان تھے، کیونکہ وہ عربی میں بات کر رہا تھا۔ اسفند یار اور عظمت یار کھانا چھوڑ کر یوں مؤدب ہو کر بیٹھ گئے، جیسے رچی قرأت کر رہا ہو۔ طیب نے سر جھکا کر اپنی ہنسی چھپائی۔ بات ختم کر کے رچی ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"ون منٹ پلیز۔۔۔ میں ابھی آیا، آپ لوگ کھائیں، پلیز۔۔۔ طیب خان! میرے مہمانوں کا خیال رکھنا، یہ تکلف نہ کریں۔"

وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا، فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سٹنگ روم سے گزرتا ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔

"سوری سر!"

"یہ کیا حماقت تھی؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

اب گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی اور وہ فون پر موجود شخص کو اسفند یار اور عظمت یار کے متعلق بتانے لگا۔ اندر طیب خان انہیں دلچسپی سے کھاتے دیکھ رہا تھا۔

"یہ نگٹس لیں۔" اس نے پلیٹ ان کی طرف بڑھائی۔

اسفند نے ایک نگٹس اٹھا لیا اور پلیٹ میں کیچپ ڈالتے ہوئے طیب خان سے پوچھا۔

"آپ نے جب سے روسیوں کے خلاف جنگ کی اور اب جب نائن الیون کے بعد امریکیوں کے خلاف لڑے تو کچھ اس کا احوال بتائیے۔ مجھے بہت شوق تھا جہاد میں شرکت کرنے کا۔ میرا ایک دوست تھا، اس کا بھائی جہاد میں شرکت کے لیے گیا۔ وہ شہید ہو گیا تھا تو ابا نے مجھے منع کر دیا تھا ورنہ۔۔۔"

اور طیب خان نے دل ہی دل میں رچی کو سراہا۔ وہ ہمیشہ صحیح بندے ڈھونڈتا تھا۔

یہ دونوں لڑکے ان کے بہت کام آسکتے تھے۔ رچی واپس آگیا تھا۔ وہ معذرت کرتا ہوا بیٹھ گیا تھا۔ ملازم لڑکا چائے لے آیا تھا اور چائے سرو کر رہا تھا، جب رچی نے پوچھا۔

"آپ کو ڈرائیونگ آتی ہے؟"

"نہیں! گاڑی تو کبھی ڈرائیو نہیں کی۔" عظمت نے جواب دیا۔ "موٹر بائیک ہے ہمارے پاس، ابھی میں نے لی ہے سال بھر پہلے۔" اسفند کے لہجے میں فخر تھا۔

"میرا جو بندہ ہے ناوہاں گاؤں میں، وہ سکھا دے گا آپ کو۔" رچی نے اپنے چغے کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر عظمت کو دی۔

"یہ کیا ہے جناب؟"

"نئی زیرو میٹر گاڑی کی چابی ہے۔ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ آپ ہمارے لیے کام کریں گے تو آپ کو ادھر ادھر آنے جانے میں آسانی رہے گی۔"

"لیکن ہمیں کیا کام کرنا ہوگا جناب! ہمارا اپنا زمینوں کا کام بھی ہوتا ہے۔"

"آپ کا زمینوں کا کام متاثر نہیں ہوگا عظمت صاحب! جب بھی آپ فارغ ہوں گے ادارے کا کام بھی دیکھ لیجیے گا۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا، ہم آپ کو تنخواہ بھی دے دیں گے۔"

"نہیں... نہیں تنخواہ کی کیا ضرورت ہے۔" اسفند جلدی سے بولا تھا، جبکہ عظمت نے تنبیہی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو یہ چابی رکھ لیں محترم اور گاڑی آپ کو وہاں چک میں ہی مل جائے گی مع کاغذات کے۔"

"لیکن..." عظمت نے پھر کچھ کہنا چاہا تو رچی نے اسے ٹوک دیا۔

"پلیز کچھ مت کہیے گا۔" اور اس کا ہاتھ پکڑ کر چابی اس کے ہاتھ میں دے کر اس کی مٹھی بند کر دی۔ طیب نے دیکھا، دونوں بھائیوں کے چہرے چمک اٹھے تھے۔

"عمارت کی تعمیر مکمل ہو جائے تو ہمیں کچھ پڑھی لکھی خواتین کی بھی ضرورت ہوگی جو وہاں کا انتظام وغیرہ دیکھیں۔ ایک، دو ٹیچر تو ہم ہائر کر لیں گے کسی بڑے شہر سے، لیکن کچھ مقامی لڑکیاں بھی ہوں تو..."

"جی... جی ہمارے گاؤں میں کافی لڑکیاں ہیں، جو میٹرک تک پڑھی ہوئی ہیں، کالج میں بھی پڑھ رکھا ہے کئی لڑکیوں نے۔" اسفند نے جواب دیا۔

"تو پلیز آپ دیکھیے گا، تیار کیجیے گا۔"

"جی ضرور۔"

کچھ دیر بعد اسفندیار اور عظمت یار رخصت ہوگئے تو طیب نے پوچھا۔

"یہ کیا چکر ہے بھئی۔"

"یہ حکم ملا ہے اوپر سے اس طرح کے خواتین کی فلاح و بہبود کے ادارے بنانے کا۔ ہم نے یہاں "ویمن ایکشن فورم" کے نام سے ایک این جی او بھی بنائی ہے، جو انسانی حقوق، حقوق نسواں، جینڈر بیلنس اور خواتین کے خلاف امتیازی قوانین کے خاتمے کے لیے کام کرے گی۔"

"گویا اس بار تم کثیر مقاصد کے ساتھ آئے ہو۔"

"کہہ سکتے ہو۔" رچی مسکرایا۔ "ویسے یہ سب نیا نہیں ہے، کافی پہلے سے ان پر کام ہو رہا ہے یہاں۔ خیر... مجھے ابھی اپنے مہمانوں کی طرف جانا ہے، وہ چولستان کا کچھ حصہ دیکھنا چاہ رہے ہیں۔"

"چولستان میں کیا ہے؟" طیب بھی کھڑا ہو گیا۔

"دیکھنے والوں کے لیے بہت کچھ۔ باذوق لوگوں کو تو مسحور کر دیتا ہے۔ تم چاہو تو آرام کرو۔ ملازم تمہیں تمہارا کمرا دکھا دے گا، کہیں گھومنا چاہو تو گاڑی اور ڈرائیور موجود ہے۔"

"ویسے رچی! سوری، شیخ عبدالعزیز صاحب! آج جب تم ان لڑکوں سے بات کر رہے تھے تو مجھے اسماعیل خان یاد آگیا، وہی انداز، وہی اسٹائل۔"

"آہا..." رچی نے قہقہہ لگایا۔ "کمزور ایمان کا آدمی تھا۔ جلدی ہمارے جھانسے میں آگیا تھا۔ بلکہ اب تو سچ مچ ہی خود کو پیغمبر سمجھنے لگا تھا۔ خواب آنے لگے تھے، خواب میں وحی نازل ہونے لگی تھی اس پر۔" دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنسے۔

"مجھے تو ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے، جو پڑھے لکھے، سمجھ دار ہوتے ہیں اور پھر ان جیسے لوگوں پر ایمان لے آتے ہیں۔ یقین کر لیتے ہیں، ان پڑھ اور کم علم لوگ اگر ان کے پیروکار ہوں تو ماننے والی بات ہے۔ لیکن... اس جھوٹے نبی کے بھی تو ہزاروں پیروکار ہیں جو انگریزوں نے کھڑا کیا تھا۔ آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور سوچنے سمجھنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے، دراصل ان کے لیے ہدایت کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

"ہاں جیسے احمد رضا۔۔۔" طیب خان نے احمد رضا کو یاد کیا۔

"احمد رضا ان لوگوں میں سے تھا جو وقتی طور پر متاثر ہوتے ہیں لیکن جلد سنبھل جاتے ہیں۔ ویسے وہ شکوک کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ تو ہمارا جال اس کے گرد مضبوط تھا' ورنہ جلد یا بدیر وہ ہمارے پنجے سے نکل جاتا۔ ہمیں ایسے نوجوانوں کی بہت ضرورت تھی اور ہمیں اس سے بہت کام لینا تھا اور لیا۔" رچی نے کہا۔

"بے چارہ اسماعیل خان۔۔۔ سنا ہے جیل میں چیخیں مار مار کر روتا تھا اور الوینا اور نتاشا اور دوسری لڑکیوں کو آوازیں دیتا تھا۔ شراب طہور کی طلب میں پاگل ہو کر قیدیوں سے لڑتا تھا اور ان سے کہتا تھا وہ اس کا ادب کریں' جھک جائیں اس کے سامنے' کیونکہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے۔ ایسے ہی ایک روز ایک سزائے موت کے قیدی نے اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اس روز اس نے (نعوذ باللہ) خود کو اللہ کا سچا اور آخری نبی کہا تھا۔ برا انجام ہوا اس کا۔" طیب خان نے رچی کو بتایا۔

"ہاں! دو سال پہلے یہ ساری تفصیل باس نے وہاں نیویارک میں بتائی تھی۔"

"سوچتا ہوں رچی! کہیں ہمارا بھی انجام ایسا ہی نہ ہو۔" طیب خان نے پتا نہیں کیوں کہا' رچی نے بغور اسے دیکھا۔

"نہیں! ہمارا انجام ایسا نہیں ہو گا' اس لیے کہ ہم اپنے وطن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اپنے مذہب کے لیے جو سچا ہے' تم جو جگدیش ہو پچھلے کئی سال سے طیب خان بنے ہوئے ہو اور میں۔۔۔"

"لارنس آف عریبیا" جس کے بہت سے نام ہیں اور بہت سے چہرے۔"

طیب ہنسا تو رچی بھی ہنسنے لگا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے پورچ تک آ گئے تھے۔

"اوکے۔۔۔ پھر کل ملاقات ہو گی۔"

رچی نے ہاتھ ملایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ طیب خان وہیں کھڑا گاڑی کو گیٹ سے باہر جاتے اور پھر گیٹ بند ہوتے دیکھتا رہا اور پھر واپس جانے کے بجائے وہیں لان میں بیٹھ گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے احمد رضا کا خیال آ گیا تھا۔

اسے اس سے اپنی آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔ اس روز وہ بے حد مضطرب اور بے چین تھا۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اندر سے کوئی احساس اسے روکتا تھا اور خوف اسے رکنے سے منع کر رہا تھا۔ تب ہی تو اس نے طیب خان سے کہا تھا۔

"رچی مسلمان نہیں ہے' تم مسلمان ہو۔ مجھے لگتا ہے' یہ غلط کہہ رہا ہے' میرا کوئی قصور نہیں ہے' وہ بھلا مجھے کیوں ماریں گے۔"

"بے چارہ نہیں جانتا تھا کہ میں بھی۔۔۔" طیب خان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"یہ رچی بھی پورا شیطان ہے' جانے کہاں ہو گا اس وقت احمد رضا' ہے بھی یا نہیں۔"

رچی نے کبھی ان ڈیڑھ سالوں میں اس کا ذکر نہیں کیا تھا' وہ احمد رضا کے متعلق سوچنے لگا۔



احمد رضا اس وقت دونوں ہاتھ پیچھے موڑے سر ہاتھوں پر رکھے لیٹا تھا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

یہ فروری 2005ء تھا اور وہ آٹھ جنوری 2000ء کی صبح تھی' جب اس نے اس ملک کو چھوڑا تھا۔ اس روز جب وہ الوینا کے ساتھ چلتے ہوئے ایر پورٹ کی عمارت میں داخل ہوا تھا تو اس نے سوچا تھا' اگر وہ یہاں سے بھاگ جائے' کہیں چھپ جائے' کسی چھوٹے سے گاؤں میں چلا جائے' وہاں کچھ عرصہ چھپا رہے' اس نے کسی کو قتل نہیں کیا' ڈاکا نہیں ڈالا' بس اسماعیل کذاب کو سمجھنے کی غلطی ہوئی تھی اس سے' اس نے اسے سچ مچ ایک پرہیزگار اور نیک آدمی سمجھا تھا۔ وہ عدالت میں جا کر اعتراف کر لے گا کہ اس سے اس شخص کو سمجھنے میں غلطی ہوئی' اسے معاف کر دیا جائے' لیکن نہیں۔

وہ چونکا تھا۔

"رچی نے بتایا تھا وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا اور اگر عدالت نے مجھے اس کا ساتھی سمجھ لیا تو ملک سے غداری کرنے والوں کا انجام۔" اس نے جھرجھری سی لی اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی الوینا نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"کیا ہوا احمد رضا؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے الوینا کی طرف دیکھا تھا اور پھر اس کی نظریں ان پولیس والوں پر پڑی تھیں جو ایر پورٹ کی عمارت میں کھوجتی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔ غیر ارادی طور پر الوینا کے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہو گئی تھی۔

"ساری زندگی جیل کی کوٹھڑی میں سڑتے رہو گے احمد رضا!" رچی کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

"جیل کے اندر کی زندگی بہت اذیت ناک ہوتی ہے احمد رضا۔"

رچی کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں آ رہی تھی' اگر وہ اسے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ الوینا کی اوٹ میں چلتا ہوا خود کو ان پولیس والوں کی نظروں سے بچانے کی کوشش کرتا ہوا اب ایک لگژری زندگی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ فی الحال وہ یوکے جا رہے تھے اور پھر جلد ہی انہوں نے امریکا چلے جانا تھا۔ رچی نے یہی کہا تھا اور ابو کہتے تھے وہ اسے اعلا تعلیم کے لیے باہر اپنے خرچ پر بھیجنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا اسے خود محنت کرنا ہو گی' تاکہ اسے اسکالر شپ مل سکے اور اب۔۔۔ اب وہ وہاں جا کر اپنی پڑھائی شروع کر سکتا ہے۔

ابو نے جب اس کا سامان پیک کیا تھا تو اس کے تمام تعلیمی کاغذات بھی رکھ دیے تھے۔ وہ پڑھے گا' ابو کا خواب پورا کرے گا اور پھر کچھ عرصہ بعد سمیرا اور امی' ابو کو بھی وہیں پر اپنے پاس بلا لے گا' تب تک ابو کا غصہ بھی ختم ہو جائے گا۔

وہ جانتا تھا کہ ابو اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ وہ زیادہ دن اس سے ناراض نہیں رہ سکتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ان کے مذہبی جذبات پر ضرب پڑی تھی' وہ اسے مرتد سمجھ رہے تھے اور حالات نے اسے اس طرح اپنے شکنجے میں جکڑا تھا کہ اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

رچی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بہت جلد اس کی فیملی کے متعلق پتا کروا لے گا۔ امریکا' انگلینڈ اور دوسرے یورپی ممالک میں جانے کی اسے ہمیشہ خواہش رہی تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ جب بھی موقع ملا تو وہ ضرور باہر جائے گا اور ہو سکا تو وہیں سیٹل ہو جائے گا اور اب خود بخود قسمت سے موقع مل گیا تھا تو۔۔۔ اس نے قدرے مطمئن ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ پولیس والے لوگوں کے ہجوم میں کہیں چھپ گئے تھے۔

اس نے الوینا کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور اب بڑے اعتماد سے چل رہا تھا۔ آگے ایک خوب صورت زندگی اس کی منتظر تھی۔ اس زندگی میں کیا کچھ ہونے والا تھا۔ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بہت سارے خواب تھے۔ ایک اچھی خوب صورت اور لگژری زندگی کے خواب۔

وہ لاہور سے لندن تک ایسے ہی خواب دیکھتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ طیارہ ہیتھرو ایر پورٹ پر اتر گیا۔ انہیں لینے کے لیے جینفر آئی تھی اور اگلے ایک سال تک وہ اس کی میزبان رہی تھی۔ الوینا سے زیادہ مہربان۔

رائل ہوٹل کے سامنے بنے عربوں کے فلیٹوں میں سے ایک فلیٹ میں اس نے ایک سال کا عرصہ گزارا تھا۔ جینفر نے اسے بتایا تھا کہ یہ سارے فلیٹس عربوں نے خرید رکھے ہیں۔

ایک سال اس نے لندن میں گزارا تھا۔ دریائے ٹیمز اس کے کنارے پر ایستادہ دو بڑے ستون اور بڑے بڑے مجسمے' نیچی نیچی سی کائی زدہ عمارتوں کے باہر جرنیم اور ڈیفوڈل کے پھول۔

ہائیڈ پارک کا کونا۔

آکسفورڈ اسٹریٹ کو مڑنے والی سڑک۔

لندن آئی، مادام تساؤ۔ سرپنٹائن لیک۔
اور جھیل کے صاف شفاف پانی میں تیرتی بطخیں، برمنگھم کا واٹرمال۔
ماربل آرچ کے کونے والا اسٹاپ۔
نیلسن کا سیاہ فام مجسمہ۔
ٹیوب کی گرم گرم فضا۔
مہنگے بوتیک، ارلز کورٹ کا بازار۔
لندن کے سب سے مہنگے اسٹور ہیرالڈ میں شاپنگ، ایک سال میں ہی وہ ان سب سے اوب گیا تھا۔ اسے لاہور یاد آتا۔ لاہور کی رونقیں اسے تڑپاتیں۔ وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکا تھا، اس ایک سال میں اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس ایک سال میں رچی سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ الوینا بھی صرف دو، تین بار ملی تھی۔

وہ اکثر اپنے فلیٹ میں خاموش لیٹے غور کرتا تھا کہ ایسا کیا تھا اسماعیل خان میں کہ وہ اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ چند خوب صورت لڑکیاں.... یہ ان کی کشش تھی یا پھر اس کی مذہب سے لاعلمی، وہ مذہب کے متعلق اتنا نہیں جانتا تھا، جتنا اسے جاننا چاہیے تھا۔
یا پھر اسماعیل خان کا انداز گفتگو۔
شروع شروع میں جب وہ اس کی محفلوں میں جاتا تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے عشق و محبت کی باتیں کرتا تھا اور انہیں درود شریف پڑھنے کی تلقین کرتا تھا پھر.... نہیں، شاید کہیں کچھ غلط ہے، کسی نے اسماعیل خان کے متعلق غلط افواہ پھیلادی تھی۔
اس کا یقین پھر متزلزل ہو جاتا۔ وہ شکوک کا شکار ہو جاتا، آخر لوگ کیوں اس کے دیوانے ہو رہے تھے۔ وہ گوالمنڈی کا تاجر اسحاق کشمیری جس نے اپنی دکانیں فروخت کر کے سارا پیسہ اسماعیل کو دے دیا تھا۔ اور وہ کتنا بڑا عقیدت مند تھا اس کا۔
پورا ایک سال اس نے وہاں گزار دیا تھا۔ رچی اور الوینا کا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا اس سے۔ اس ایک سال میں اسے یقین ہو گیا تھا، وہ یقیناً" اس کے ساتھ مخلص ہے۔

رچی جو مسلمان ہو گیا تھا، جس نے اسماعیل خان کے سامنے اسلام قبول کیا تھا اور جس کے متعلق وہ کبھی کبھی شکوک کا شکار ہو جاتا تھا۔ وہ ایک اچھا آدمی ہے۔
یہ اس کی رائے تھی۔ اس نے بغیر کسی غرض کے اسے جیل میں جانے سے بچایا تھا۔ اس ایک سال میں وہ پرتعیش زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا تھا اور سہل پسند بھی ہو گیا تھا۔ بغیر کسی محنت کے اس کے پاس سب کچھ تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں لاکھوں پونڈز جمع تھے اور یہ سب رچی نے جمع کروائے تھے۔
جینفر ہمہ وقت اس کی دلجوئی کے لیے اس کے ساتھ تھی۔ اس کے فلیٹ کے پارکنگ ایریا میں اس کی شان دار گاڑی تھی۔ کیا زندگی میں انسان کسی اور چیز کی بھی خواہش کر سکتا ہے، کئی بار اس نے سوچا تھا، شاید نہیں... اور جواب بھی خود ہی دے دیتا تھا، لیکن کبھی کبھی اس کا دل گھبرا جاتا تھا، اسے لاہور یاد آتا۔ اسے سمن آباد والا اپنا گھر یاد آتا۔ اسے ابو، امی اور سمیرا یاد آتے۔
اور ایک سال بعد جب وہ یہاں کی ہر چیز سے تنگ آگیا تو اس نے جینفر سے کہا تھا۔
وہ پاکستان جانا چاہتا ہے، وہ اب یہاں مزید نہیں ٹھہرے گا۔ گھومنا، پھرنا، کھانا پینا اور سو جانا وہ اس طرح کی بے مقصد زندگی کا عادی نہیں ہے۔ اس طرح کی زندگی آدمی کو بہت جلد تھکا دیتی ہے، وہ بھی تھکنے لگا ہے۔
اس نے جینفر سے کہا تھا کہ وہ کل اس کے ساتھ چلے، وہ پاکستان کے لیے ٹکٹ خریدنا چاہتا ہے۔ اور اسی رات رچی آگیا تھا۔
رچی نے اسے بتایا تھا کہ اسماعیل خان کے خلاف پاکستان کی عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اس نے ایک اخبار اسے دکھایا تھا۔ اخبار میں لکھا تھا۔
"اسماعیل کذاب جس نے نبوت کا جھوٹا دعوا کیا تھا، اس کے خلاف ختم نبوت (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کمیٹی کی طرف سے کیس رجسٹرڈ کیا گیا تھا۔

اسماعیل کذاب تو جیل میں ہے لیکن اس کا خلیفہ احمد رضا غائب ہے جبکہ اس کا مقرب خاص ارباب حیدر بھی ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ عدالت نے دونوں افراد کو جلد از جلد پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔"
رچی نے ایک اور اخبار دکھایا تھا۔
"اسماعیل کذاب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ "وہ اللہ کا نبی "نعوذ باللہ" ہے اور جس رات اسے نبوت عطا ہوئی تھی۔ احمد رضا اس کے پاس تھا اور وہ اس کا گواہ ہے اور اس کا صحابی ہے اور "ورلڈ اسمبلی" کے ہر اجلاس میں وہ اس کے ساتھ شریک رہا ہے..."
احمد رضا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اخبار دیکھ رہا تھا۔
"نہیں!" اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ "یہ جھوٹ ہے... میں ورلڈ اسمبلی کے ایک دو اجلاسوں میں شریک تھا لیکن نبوت..."
رچی نے اخبار لپیٹ کر رکھ دیے۔
"میں جانتا ہوں احمد رضا! لیکن میں نے تمہیں یہ اس لیے دکھایا ہے کہ جینفر نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ تم پاکستان جا رہے ہو۔ اتنی جلدی مت کرو میرے دوست! کیس کا فیصلہ ہونے دو، پھر بہت شوق سے چلے جانا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے احمد رضا! میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی جوانی جیل میں ضائع کر دو۔ تم پاکستانیوں کو جانتے ہو نا کتنے سر پھرے ہیں۔ کسی طرح جیل جانے سے بچ گئے تو مارے جاؤ گے۔"
اور احمد رضا کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
"تو...؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
"تو کچھ نہیں میری جان! جب وقت آئے گا تو میں تمہیں خود بھجوا دوں گا۔"
"اور میری فیملی کے متعلق کچھ پتا چلا؟"
"ہاں پتا چلا تھا کہ وہ فیصل آباد میں ہیں لیکن جب میرا بندہ وہاں گیا تو وہ وہاں سے جا چکے تھے۔ خیر پتا چل جائے گا۔"
ایک سال کے اندر کچھ نہیں پتا چلا تھا تو..." اس کے اندر مایوسی پھیل گئی تھی۔

"تم جانتے ہو۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"
اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
"ہم ایک ہفتے تک امریکا جا رہے ہیں۔ تم اپنی تیاری کر لو۔"
اور یوں وہ امریکا چلا گیا تھا۔ امریکا میں اسے الوینا ملی تھی لیکن یہاں جو اپارٹمنٹ اسے ملا تھا۔ اس میں وہ اکیلا رہ رہا تھا۔ اب رچی سے اس کی اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ رچی کے علاوہ بھی کئی لوگوں سے وہ ملا تھا۔
رچی کے کہنے پر اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ رچی نے اسے ملازمت بھی دلوا دی تھی۔ آئی سی جی "انٹرنیشنل کرائسز گروپ" یہ ایک بین الاقوامی ادارہ تھا۔
بظاہر یہ ساری دنیا میں مسائل حل کرتے تھے اور لڑائیاں ختم کرواتے تھے لیکن در حقیقت ان کا مقصد اسلامی ملکوں میں اسلام ختم کرنے کی کوشش کرنا تھا لیکن احمد رضا ان کے اندرونی مقاصد کو نہیں جانتا تھا۔
اس نے رچی سے کہا تھا وہ پڑھنا اور جاب کرنا چاہتا ہے۔ اس نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔
رچی نے کہا تھا جیسے ہی کسی یونیورسٹی یا کالج میں ایڈمیشن اوپن ہوتے ہیں، تم ایڈمیشن لے لینا۔ تمہیں نئے سرے سے سب پڑھنا پڑے گا یہاں پہلے گریجویشن کرنا پڑے گا تمہیں۔"
اور پھر رچی اسے اس شاندار آفس میں لایا تھا۔ اسے کمپیوٹر کا کچھ کام دیا گیا تھا۔ مختلف رپورٹس کے پرنٹ نکالنا کچھ میل چیک کرنا وغیرہ۔ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ ان کے مقاصد میں سب سے اہم کام مسلمانوں میں انتشار پھیلانا ہے۔
اسلامی فرقوں اور مسلکوں کے درمیان اختلافات پیدا کرنا۔ قرآن و حدیث میں ترمیم کرنا وغیرہ شامل تھے۔
وہ نہیں جانتا تھا کہ جو احادیث کی کتابیں اور قرآن کے تراجم اس کی نظر سے گزر رہے تھے وہ ترمیم شدہ تھے اور یہ سب کتابیں اسلامی ممالک میں پھیلائی جا رہی تھیں۔ اسے اپنے دینی علم کی کمی کا شدت سے

احساس ہوتا تھا۔ اس لیے وہ ان آسانی سے دستیاب ہونے والی کتب کو بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ وہ اصل احادیث کے متعلق نہیں جانتا تھا' سو وہ انہیں ہی اصل احادیث سمجھ کر پڑھتا تھا۔

جب نائن الیون کا واقعہ ہوا تو وہ نیویارک میں تھا۔ یہ بڑے مشکل دن تھے۔ رچی اسے ایک ایسی جگہ لے گیا تھا' جہاں رہنا اسے عذاب لگتا تھا۔ وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے پُر آسائش زندگی گزار رہا تھا۔ لیکن یہ جگہ جہاں رچی اسے لے کر آیا تھا' ایک تنگ و تاریک کمرا تھا۔ لکڑی کی خستہ سیڑھیاں چڑھ کر وہ اس کمرے میں آئے تھے۔ اندر سیلن اور پرانی بو تھی۔ ایک بیڈ تھا جس کے گدے کے اسپرنگ چبھتے تھے۔ کمرے کے ساتھ ہی چھوٹا سا کچن تھا۔ گندا سا باتھ روم اور نیچے اسٹریٹ پر ہر وقت شراب پی کر ہنگامہ کرتے اور گالیاں دیتے کالے مرد اور عورتیں۔۔۔

رچی نے کہا۔

"لوگ بہت غصے میں ہیں۔ ہو سکتا ہے مسلمان سمجھ کر وہ تمہیں نقصان پہنچادیں۔ جہاں تم رہتے تھے وہاں کچھ متعصب نوجوان تھے۔"

رچی نے ایک بار پھر اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے نیچے اسٹریٹ میں ایک لڑکے کے پوچھنے پر اپنا نام احمد بتایا تھا

اس نے جو دس دن یہاں گزارے تھے وہ بہت اذیت ناک تھے۔ جب کبھی وہ اپنے کمرے سے نکل کر نیچے بیکری تک جاتا تو اسٹریٹ میں موجود لڑکے اس پر آوازیں کستے۔۔۔ اور ہنستے۔

ایک بار تو ایک لڑکا اس کا سامان چھین کر بھاگ گیا تھا۔

ایک بار نشے میں دھت ایک موٹی سیاہ فام عورت اسے کھینچنے لگی وہ زمین پر گر پڑا۔ ارد گرد کھڑے سب ہنسنے لگے۔

ٹھیک دس دن بعد وہ رچی کو فون کر رہا تھا اور اس کے بعد اس نے خود کو مکمل طور پر رچی کے حوالے کر دیا تھا۔ اس نے وہی کیا جو رچی نے اور دوسروں نے کہا۔

"سر! آپ کی فلائٹ ہے دو گھنٹے بعد۔" سانولے رنگ کی دبلی پتلی سی لڑکی ثمینہ حیدر اس کی سیکریٹری ہی نہیں' اس کے گھر کے تمام امور کی بھی نگرانی کرتی تھی۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ٹھیک ہے تم نے کنفرم کر لیا ہے کہ فلائٹ لیٹ تو نہیں ہے۔"

"جی سر!"

"او کے' میں فریش ہو کر آتا ہوں۔ تم نے ڈرائیور کو بتا دیا ہے کہ ایئرپورٹ جانا ہے۔"

"جی سر۔۔۔!"

ثمینہ حیدر چلی گئی تو وہ اٹھا۔ "سب کچھ ہے میرے پاس عزت' دولت' شہرت وہ سب' جو میں نے چاہا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں اداسی پر پھیلائے بیٹھی رہتی ہے۔ اندر کا موسم ہمیشہ کہر آلود ہی رہتا ہے۔"

"تم ناشکرے ہو احمد رضا!" رچی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"تمہارے اللہ نے تمہیں اتنا نوازا ہے کیا تم نے کبھی تصور بھی کیا تھا کہ تمہارے پاس بی ایم ڈبلیو ہوگی' ڈیفنس میں تمہارے پاس چار کینال کا گھر ہوگا۔ لندن اور نیویارک میں تمہارا ذاتی اپارٹمنٹ ہوگا۔"

"ہاں۔۔۔!" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں نے اس سب کا تصور نہیں کیا تھا لیکن یہ سب مجھے کیا کچھ کھو کر ملا ہے۔ جو کھو گیا ہے' وہ کھونے کا کرب مجھے پورے طور پر خوش نہیں ہونے دیتا رچی! تم کیا جانو۔"

وہ وارڈ روب کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے وارڈ روب کھولا۔ اس کے کپڑے تیار تھے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی وہ ایسے برانڈڈ کپڑے پہن سکے گا۔ اس نے ایک سیاہ شرٹ نکالی فوراً" اس کے کانوں میں زبیدہ کی آواز آئی۔

"رضی! تم یہ سیاہ رنگ مت پہنا کرو بہت کھلتا ہے۔ تم پر نظر لگ جائے گی۔"

اور پھر سمیرا کی ہنسی۔

"اوہو امی! کالا رنگ تو بذات خود نظر بھن (نظر توڑنے والا) ہے آپ نے دیکھا نہیں کبھی جب لوگ نیا گھر بناتے ہیں تو اکثر گھروں پر کالی پٹی بندھی ہوتی ہے اور اکثر رکشوں' ٹرکوں اور بسوں پر بھی ایک کالی دھجی لٹک رہی ہوتی ہے تاکہ نظر نہ لگے۔"

"سمو کی بچی! تم نے میرا دل ہی برا کر دیا سنبھالو یہ کالی شرٹ اور کوئی دوسری استری کر دو۔"

لحہ بھر وہ یونہی شرٹ ہاتھ میں پکڑے کھڑا رہا اور پھر اس نے شرٹ واپس لٹکا دی۔

پتا نہیں امی اور ابو مجھے یاد کرتے ہوں گے یا نہیں۔ ایسے جیسے میں یاد کرتا ہوں۔ امی تو مجھے ہر لحہ یاد کرتی ہوں گی اٹھتے بیٹھتے۔ "ابو تو" سے کسی بات پر ٹوک بھی دیا کرتے تھے لیکن امی نہیں۔ وہ اس کی ہر ضد ہر خواہش پوری کرتی تھیں۔

فون کی بیل ہو رہی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنے بیڈ پر پڑے فون کو دیکھا اور اٹھا لیا۔ دوسری طرف کسی نے اس کا پروگرام پوچھا تھا۔

"بس میں ایئرپورٹ کے لیے ہی نکلنے لگا ہوں۔"

فون بند کر کے اس نے پھر بیڈ پر رکھ دیا۔ "پتا نہیں اس وقت امی ابو سمیرا کہاں ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے۔"

اس نے سوچا اور وارڈ روب کی طرف متوجہ ہو گیا۔



زبیدہ بہت دیر سے ٹی وی لاؤنج میں اکیلی بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ ٹی وی پر کیا ہو رہا تھا۔ انہیں خبر نہیں تھی بس وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔

حسن رضا کچھ دیر پہلے ہی اسٹور بند کر کے آئے تھے اور اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت بہت تھکے ہوئے ہوتے تھے۔ زبیدہ انہیں چائے دے کر ٹی وی لاؤنج میں آ گئی تھیں' جب سے سمیرا لاہور گئی تھی' زبیدہ فارغ ہو کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتی تھیں۔ انہیں ٹی وی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اگر اس سے انہیں دوسراہٹ کا احساس ہوتا تھا جیسے وہ اکیلی نہیں ہیں۔

حسن رضا نے زندگی بھر جاب کی ہے' آفس میں ٹیبل کے پیچھے بیٹھ کر فائلیں دیکھنا اور لکھنے پڑھنے کا کام کرنا اور سارا دن اسٹور میں گاہکوں سے سر کھپانا بہت مختلف تھا لیکن زندگی گزارنے کے لیے کچھ کرنا ضروری تھا۔ اس عمر میں جاب ملنا آسان نہ تھا سو انہوں نے اپنے لیے اسٹور کھولنا مناسب سمجھا تھا۔

ان چند سالوں میں آس پاس کے کئی افراد سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ سب ان عزت کرتے تھے۔ پانچوں وقت مسجد میں نماز پڑھنا' ماتھے پر سجدوں کا نشان' خاموش طبع' سب کے دکھ سکھ میں شریک حسن رضا محلے والوں کے لیے ایک معتبر اور پرہیزگار شخص تھے۔

وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نفل پڑھتے اور احمد رضا کے لیے دعا کرتے۔ "یا اللہ! وہ جہاں کہیں بھی ہے اسے سیدھا راستہ دکھا۔"

زبیدہ سمیرا کے جانے کے بعد اور بھی خاموش ہو گئی تھیں ان کے اور حسن رضا کے درمیان بہت کم بات چیت ہوتی تھی۔ بس ضروری باتیں۔

لگتا تھا جیسے ان کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع رہا ہی نہیں ہے۔ اس وقت بھی وہ ٹی وی لاؤنج میں تھیں اور حسن رضا اپنے کمرے میں لیٹے تھے ان کے ہاتھ میں اخبار کا ایک ٹکڑا تھا جسے وہ دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ اسے آنکھوں کے قریب کرتے کبھی ذرا دور کر کے پڑھتے۔ جیسے دور یا نزدیک کرنے سے تحریر بدل جائے گی۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔

اخبار کا ٹکڑا والٹ میں رکھتے رکھتے وہ پھر اسے پڑھنے لگے تھے۔ جب دروازہ زور سے کھلا۔ انہوں نے فوراً" اخبار کا ٹکڑا مٹھی میں بند کر لیا اور آہستہ سے ہاتھ پیچھے کر کے اسے تکیے کے نیچے رکھا اور دروازے میں کھڑی زبیدہ کی طرف دیکھا جن کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ آنکھوں میں نمی تھی۔

"کیا ہوا زبیدہ! کیا بات ہے؟" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔

"وہ۔۔۔ وہ احمد رضا۔ وہ احمد ہے۔۔۔ اپنا رضی۔۔۔ ادھر ٹی وی پر بول رہا ہے۔ بس اس نے داڑھی رکھ لی ہے۔

اس کی آنکھیں اس کے بال۔۔۔"

"وہ۔۔۔ لیکن وہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو۔۔۔" انہوں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے تکیے کی طرف دیکھا۔

"نہیں زبیدہ! وہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں وہم ہوا ہے۔ وہ تو کہیں کسی اور ملک میں چلا گیا تھا۔" انہوں نے پورے یقین سے کہا۔

"آپ آئیں تو۔۔۔ دیکھیں تو۔"

وہ واپس مڑ گئیں حسن رضا بھی اٹھ کر ان کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں آئے تھے۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ ٹی وی پہ اشتہار آ رہے تھے۔

وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے۔ یہ ایک نیا چینل تھا۔ اس وقت پاکستان میں کتنے چینل کام کر رہے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے کبھی ٹی وی نہیں دیکھا تھا جب سے احمد رضا جدا ہوا تھا انہوں نے خبریں دیکھنی بھی چھوڑ دی تھیں۔

"اس چینل پر ایک پروگرام شروع ہوا ہے "کڑوا سچ" وہ اس پروگرام کا اینکر ہے۔ احمد حسن نام ہے اس کا۔" زبیدہ انہیں بتا رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد اشتہار ختم ہو گئے تھے اب احمد حسن نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ زبیدہ صحیح کہہ رہی تھیں۔ وہ ان کے احمد رضا سے بہت ملتا جلتا تھا۔ ویسے ہی براؤن بال، ویسی ہی آنکھیں، وہی پیشانی، وہی اونچی اٹھی ہوئی ناک لیکن یہ احمد رضا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن جو کوئی بھی تھا بہت سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ داڑھی نے جیسے اس کی وجاہت میں اضافہ کر دیا تھا۔ پھر اس کے بولنے کا انداز دھیما ٹھہر ٹھہر کر بولنا بہت متاثر کن تھا۔ صرف ایک بولنے کا انداز اسے احمد رضا سے جدا کرتا تھا۔ بولنے کا انداز بھی اس جیسا ہوتا پھر ہی وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ وہ احمد رضا ہی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہمارے حکمرانوں نے ہمیں امریکا کے ہاتھوں میں بیچ دیا ہے۔۔۔ اس پاکستان کو جسے لاکھوں لوگوں نے جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا اسے امریکا کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ امریکا ہمارے ملک میں گھس آیا ہے۔ یہ پاکستان، پاکستان نہیں رہا۔ را، موساد اور سی آئی اے کے ایجنٹوں کا گڑھ بن چکا ہے۔۔۔ ہمیں اپنی شناخت اپنا تشخص ایک مسلمان۔۔۔"

وہ بہت دھیان سے سن رہے تھے جب زبیدہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ۔۔۔ یہ احمد رضا ہی ہے نا۔ ہمارا رضی۔۔۔ آپ فون کریں ابھی اس چینل پر۔۔۔ اس کا نمبر لیں بات کریں اس سے۔" زبیدہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بہت جوش سے بول رہی تھیں۔

"زبیدہ۔۔۔!" انہوں نے آہستگی سے ان کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لیا اور نرمی سے بولے۔

"زبیدہ! تمہیں وہم ہوا ہے یہ ہمارے رضی جیسا ہے، لیکن ہمارا رضی نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے اس دنیا میں سات بندے ایک ہی جیسی شکل کے ہوتے ہیں۔"

"نہیں! آپ غلط کہہ رہے ہیں یہ محض لوگوں کی بنائی ہوئی باتیں ہیں۔ کوئی کسی سے نہیں ملتا۔ میرا دل کہہ رہا ہے یہ رضی ہے ہمارا رضی۔"

"زبیدہ!"

وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کچلنے لگے۔ وہ سچ جو وہ ڈیڑھ سال سے چھپائے ہوئے تھے، وہ کیسے زبیدہ سے کہہ دیتے۔ انہیں اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں لگ رہا تھا وہ زیادہ عرصہ تک یہ بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے۔ تقریباً" ڈیڑھ سال پہلے۔۔۔ یہ ستمبر 2003ء تھا اور رضی کو ان سے جدا ہوئے تقریباً" تین سال ہو گئے تھے۔ وہ سمیرا کو لاہور ہاسٹل میں چھوڑ کر واپس آ رہے تھے۔ سمیرا کے ای میں پڑھ رہی تھی۔ اس نے شاندار نمبروں میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا اور اب کے ای میں تھی۔ انہوں نے تین سال سے اخبار نہیں پڑھا تھا۔ لیکن اس روز کوچ میں ان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے شخص نے اخبار پڑھ کر ان کی طرف بڑھایا تھا۔

"دیکھیے صاحب! اخبار پڑھیں گے؟"

غیر ارادی طور پر انہوں نے اخبار پکڑ لیا تھا۔ سب سے پہلے ان کی نظر جس خبر پر پڑی تھی اس نے انہیں اندر تک ہلا دیا تھا۔

انہوں نے اخبار میں موجود اس چھوٹی سی خبر کو دو تین بار پڑھا۔

"اسماعیل کذاب کا خلیفہ اور مقرب خاص احمد رضا نام کا لڑکا کل صبح نیویارک میں ایرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا۔ اس نے موقع پر ہی جان دے دی جبکہ اسماعیل کذاب کو چند ماہ پہلے ایک قیدی نے جہنم واصل کر دیا تھا۔ خس کم جہاں پاک۔۔۔ اس کی ڈیڈ باڈی کو وہاں موجود ایک اسلامی تنظیم کے حوالے کر دیا گیا جو لاوارث مسلمانوں کے کفن دفن کا انتظام کرتی ہے۔"

"نہیں۔۔۔" ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

انہوں نے اپنی چیخیں روکنے کے لیے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے اور اپنے ہونٹوں کو اتنے زور سے دانتوں تلے دبایا کہ ان سے خون چھلکنے لگا۔

"اتنی سی زندگی لے کر آئے تھے تم احمد رضا! اور اتنی سی زندگی میں تم نے کیا کیا۔۔۔ ہائے افسوس۔"

وہ اخبار پر نظریں جمائے بیٹھے تھے اور انہیں پتا بھی نہ چلا کہ ساتھ والا مسافر کب کس جگہ اتر گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ سے صبر کی دعا مانگ رہے تھے۔

"یا اللہ! مجھے صبر دے۔۔۔ یا اللہ! مجھے ہمت عطا کر۔۔۔"

ایک دم انہوں نے خوف زدہ ہو کر اخبار بیگ میں ٹھونس دیا۔ یہ اخبار نہیں تھا۔ کوئی تیز دھار خنجر تھا جو اندر اتر گیا تھا۔ باقی سفر کیسے کٹا تھا وہ نہیں جانتے تھے۔ ان کے اندر آنسوؤں کا سیلاب تھا، چیخیں تھیں، سسکیاں تھیں اور وہ ضبط کیے بیٹھے تھے۔

وہ بیگ ہاتھ میں اٹھائے جب گھر میں داخل ہوئے تھے تو زبیدہ لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ وہ خاموشی سے آ کر زبیدہ کے پاس بیٹھ گئے۔ زبیدہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"کوئی خبر، کوئی اطلاع۔۔۔؟"

انہوں نے بے اختیار نفی میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے زبان سے کبھی کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن آج وہ پوچھ رہی تھیں۔

"آپ نے احمد رضا کا پتا کیا کسی سے۔۔۔۔ اس کے کسی دوست سے ملے، کیا خبر وہ لوٹ آیا ہو۔ سلیم صاحب کے پاس گئے تھے آپ؟"

"کیا ماں کے دل کو خبر ہو گئی ہے۔" انہوں نے زبیدہ کی طرف دیکھا۔

کیا وہ اسے بتا دیں کہ اب وہ اس سے سوال نہ کرے احمد رضا اب کبھی نہیں آئے گا، وہ وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ انہوں نے ان کی طرف دیکھا۔ زبیدہ کی آنکھوں میں ایک دم جیسے چمک سی آ گئی تھی۔

"میں نے کل رات خواب میں اسے دیکھا تھا۔ وہ سمیرا کے ساتھ کھڑا ہنس رہا تھا۔

یہ اچھا خواب ہے نا حسن صاحب۔۔۔ شاید وہ وہاں کہیں ادھر ادھر آتے جاتے سمیرا کو نظر آ جائے۔"

انہوں نے یکدم جھک کر بیگ اٹھایا تھا اور تیزی سے لاؤنج سے نکل گئے تھے۔ وہ ان کی امید ختم نہیں کر سکتے۔۔۔

احمد رضا کے لوٹ آنے کی آس ہی زبیدہ کو زندہ رکھے ہوئے ہے اگر امید ختم ہو گئی یہ آس ٹوٹ گئی تو۔۔۔ انہیں لگا تھا اگر وہ کچھ دیر اور وہاں رکے تو وہ ضبط نہیں کر سکیں گے۔ کمرے میں آتے ہی انہوں نے بیگ کو بیڈ کے نیچے چھپا دیا تھا اور پھر بیڈ پر بیٹھتے ہی ان کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے تھے۔ وہ رو رہے تھے، چیخ چیخ کر دھاڑیں مار مار کر۔ زبیدہ ان کے رونے کی آواز سن کر بھاگتے ہوئے اندر آئی تھیں۔

"کیا ہوا۔۔۔ کیا ہوا حسن صاحب! آپ اس طرح کیوں رو رہے ہیں؟"

وہ خود پر قابو نہیں پا رہے تھے۔ زبیدہ ہولے ہولے ان کا کندھا تھپک رہی تھیں۔

"ہمارا احمد رضا لوٹ آئے گا۔ آپ اس طرح مت

روئیں۔ میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔ وہم آتا ہے مجھے۔۔۔"

لیکن وہ زبیدہ کے دونوں ہاتھ تھامے بچوں کی طرح روتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"تمہیں یقین ہے نا زبیدہ! ہمارا رضی ایک دن واپس آ جائے گا۔"

وہ جیسے اس خبر کو جھٹلانا چاہتے تھے۔

"ہاں مجھے یقین ہے۔" زبیدہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی تھیں۔ "ماں کی دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔"

"اچھا! لیکن مجھے یقین کیوں نہیں آتا۔ میرا دل کیوں بجھتا جا رہا ہے۔"

وہ زبیدہ کے کندھے پر سر رکھے اس روز اتنا روئے تھے کہ زبیدہ گھبرا گئی تھیں۔ اور تب سے اس روز سے وہ اس بوجھ کو تنہا اٹھائے ہوئے تھے۔ انہوں نے سمیرا کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ انہوں نے کئی بار ہمت کی تھی کہ وہ سمیرا کو بتا دیں لیکن وہ نہیں بتا سکے تھے۔

"حسن صاحب۔۔۔! حسن صاحب!" انہوں نے چونک کر دیکھا۔

زبیدہ ٹی وی کے بالکل پاس کھڑی تھیں۔ "یہ آپ ذرا قریب آ کر دیکھیں نا یہ ہاتھ دیکھیں اس کے۔"

احمد حسن نے کوئی بات کرتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھایا تھا۔

"اس کے ہاتھ بھی بالکل احمد رضا جیسے ہیں۔ یہ اس کی انگلیاں۔"

وہ ٹی وی کے کچھ اور قریب ہوئی تھیں اور تھوڑا سا جھک کر احمد حسن کو دیکھ رہی تھیں۔

"زبیدہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔ اب ہر شخص تمہیں احمد رضا لگتا ہے۔ یہ احمد رضا نہیں ہے۔"

انہوں نے سختی سے کہا۔ زبیدہ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ انہوں نے تو کبھی اس طرح سختی سے بات نہیں کی تھی۔ وہ تو بہت نرمی اور حلیمی سے بات کرتے تھے۔ وہ ان سے نظریں چراتے ہوئے تیزی سے لاؤنج سے باہر نکل گئے اور اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے تکیے کے نیچے سے

اخبار کی وہ کٹنگ نکالی جو کسی حد تک بوسیدہ ہو چکی تھی۔

"کیا پتا" انہوں نے بے یقینی سے خود سے کہا۔ "کیا پتا میں نے غلط پڑھا ہو۔ احمد رضا کے بجائے کوئی اور نام لکھا ہو۔ ہو سکتا ہے۔ مجھ سے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو۔" اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں۔۔۔ سینکڑوں بار پڑھی جانے والی اس خبر کو وہ پھر پڑھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر ان کے رخساروں کو بھگوتے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں اخبار پر تھیں۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھے دو لڑکے کافی دیر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے سرگوشی کی اور پھر اٹھ کر اس کے قریب آئے۔ ان کی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔

"السلام علیکم۔"

اس نے نظریں اٹھائیں اور سلام کا جواب دے کر مسکرایا۔

"آپ احمد حسن ہیں نا؟" ایک لڑکے نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم آپ کے بہت فین ہیں۔ آپ کے پروگرام دیکھتے ہیں۔ آپ کے کالم پڑھتے ہیں۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح کبھی آپ سے روبرو ملاقات ہوگی۔" دوسرا لڑکا بہت پرجوش ہو رہا تھا۔

پہلے لڑکے نے مڑ کر پیچھے دیکھا اور آواز دی۔

"ہے نمرہ! ادھر آؤ' یہ احمد حسن ہیں۔ کڑوا سچ۔ کے اینکر۔"

لڑکی تقریباً" دوڑتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

"سر۔ سر السلام' علیکم۔۔۔!"

"وعلیکم السلام۔" احمد حسن کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

"سر! میں آپ کا ہر پروگرام دیکھتی ہوں۔ ہر پروگرام دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ کو بھی ہمارے حکمران امریکا کے حوالے نہ کردیں۔ ہمارا سارا خاندان آپ کے لیے دعائیں کرتا ہے۔"

لڑکے کے بلانے پر ڈیپارچر لاؤنج میں موجود کچھ اور افراد بھی اس کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے۔

"ہم آپ کی تقاریر' تنقید اور تجزیوں کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔"

ایک ادھیڑ عمر شخص نے اس کے کندھوں پر تھپکی دی۔

"ہمیں تمہارے جیسے جوانوں کی ہی ضرورت ہے۔ بے باک' بہادر' سچے کھرے۔ تم جیسے جوانوں نے ہی پاکستان بنایا تھا اور اب تم کو ہی اس کی حفاظت کرنا ہے۔"

احمد حسن احتراماً" کھڑا ہوگیا۔ ادھیڑ عمر شخص نے پرستائش نظروں سے اسے دیکھا۔

"بیٹھو بیٹھو بیٹا اللہ تمہارا نگہبان ہو۔" اس شخص نے احمد حسن کے بازو پر تھپکی دی۔ پاس ہی کھڑے ایک اور شخص نے بھی اسے سراہا۔

"بلاشبہ آپ جیسے مرد مجاہد کی زبان و بیان سے اسلام اور مسلمانوں کی ترجمانی لق و دق صحرا میں کسی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے یا شجر سایہ دار کے مترادف ہے۔"

"آپ کا حسن ظن ہے جناب ورنہ میں تو ایک حقیر بندہ ہوں معمولی انسان بس دل کا گداز اور وطن سے محبت مجھے مجبور کرتی ہے۔"

"آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں جناب آپ کے سچے اور کھرے تجزیے یہود و امریکا کے خلاف بے لاگ تبصرے اور آپ کا علم و فہم اور ذہانت ایک دنیا اس کی معترف ہے۔"

احمد حسن نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔

لوگ اس سے سوال کر رہے تھے' اس کے پروگراموں کے حوالے سے بات کر رہے تھے اور وہ دھیمی آواز میں سب کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔

"سر! آپ کیا کوئی پارٹی بنائیں گے اپنی؟" کسی نے پوچھا۔

"نہیں! میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں' ہم امریکا کے تسلط سے آزاد ہوجائیں۔ ہم کسی امریکا' اسرائیل' بھارت کے غلام نہیں ہیں۔"

وہ بول رہا تھا۔ دھیمی متاثر کن آواز میں۔ اور اس کے اردگرد لوگوں کا ہجوم بڑھتا جارہا تھا۔

"میرے گھر کچھ مخلص' محب وطن لڑکے ہر سنڈے کو آتے ہیں۔ آپ بھی جو آنا چاہیں آسکتے ہیں۔ ہم مل بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ ہم اپنے طور پر اس وطن کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔"

وہ کسی نوجوان کے سوال کا جواب دے رہا تھا کہ اس کی فلائٹ کے متعلق اناؤنسمنٹ ہوئی۔

"رحیم یار خان کی فلائٹ تیار ہے۔"

"رحیم یار خان جانے والے مسافر۔۔!"

اس نے سب سے مصافحہ کیا۔ جھک کر اپنا بیگ اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔ (باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☼

سائرہ غلام نبی

پندرہویں قسط [illegible]



وہ جون کی تپتی دوپہر میں جیسے ہی اندر میں داخل ہوا' اس کی آنکھیں مندی سی گئیں۔ اندر کی فضا مصنوعی ٹھنڈک سے بھری ہوئی تھی۔ اطمینان کا گہرا سانس اس کے سینے سے نکلا۔ دھوپ بھری گرمی کے ساتھ شور مچاتا دن جیسے باہر رہ گیا۔

یہاں موسم کی تھکن کہیں دبکی ہوئی تھی' کہ یکدم دن کی روشنی بجھی اور رات کا تاثر دینے لگی۔ یہ عجیب دنیا تھی۔ مصنوعی روشنیوں کی مرہون منت۔ رات سے دن اور دن سے رات میں بدلنے والی۔ عارضی بنیادوں پر تعمیر ہونے والی یہ دنیا "پیک اپ" کے ایک ہی نعرے پر ملیامیٹ ہوسکتی تھی۔ شاید سچ کی دنیا کی طرز پر تعمیر ہونے والی۔

یہاں ان چہروں کو اہمیت دی جاتی تھی جو فیس ویلیو رکھتے ہیں۔ جن پر لائٹ کا رخ ہوتا ہے۔ جن پر کیمرے فوکس ہوتے ہیں۔ "اسٹارٹ" کے نعرے سے سرد چہرے' اجنبی آنکھیں جذبات چھلکانے لگتیں اور نئے رشتے میں یوں ڈھل جاتیں جیسے انہی رشتوں میں پیدا ہوئے ہوں۔

پھر ان محبت کرنے والوں کے بیچ رخنہ ڈالنے والے لائے جاتے ۔۔۔ ان سیٹ پر نمایاں ہونے والے بنے بنائے ماں باپ اسکرپٹ کے مطابق حلیم الطبع اور مہربان ہوتے مگر پیک اپ کے بعد جب اصل کردار میں واپس آتے تھے تو ان سا سرد مہر چہرہ کوئی نہیں ہوتا۔

اسے عارضی بنیادوں پر تعمیر والی یہ دنیا بہت اچھی لگتی تھی اس سے بھی زیادہ جو طویل المعیاد عارضی دنیا اسے میسر تھی۔۔۔۔ گرچہ یہاں قہقہے' خوشیاں تو تھیں ہی عارضی' پر یہاں پر یہ اطمینان ہی بہت تھا کہ غم کی کیفیت بھی عارضی ہے۔ حقیقی دنیا کی طرح جان سے چمٹی ہوئی نہیں ہے جب تمام سین کیمرے کے لینس سے میموری کارڈ میں منتقل ہوجاتے اور میک اپ اتار دیا جاتا ہے تو لاشیں سانس لینے لگتی ہیں۔ بیماری دور بھاگ جاتی ہے' غربت کا چولا اتار پھینکا جاتا ہے اور زندگی آسان ہوجاتی ہے۔

زندگی آسان کرنے کا یہ نسخہ جانے کس نے بتایا تھا یا وہ خود ہی آگیا تھا۔ فن کی دنیا کی تاریخ اس بات پر خاموش تھی..... برسوں گزرے وہ گمنام سپاہی محاذ پر ڈٹا ہوا تھا اور فرنٹ لائن پر آنے کا منتظر تھا..... فن کی خدمت کا نشہ، اس کو اپنا عادی کر چکا تھا اور اس نشے میں وہ دھت رہنا چاہتا تھا۔

آج کے دن کا پہلا سین شوٹ ہو رہا تھا۔

"سائلنٹ تیرہویں کا چھ سین اسٹارٹ۔"

اے ڈی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر) کی آواز ابھری۔ سب نے خاموشی اوڑھ لی اور ان دو کرداروں کو تنہائی میسر ہونے کا احساس دینے کے لیے کہ یہ لمحاتی رشتے پوری پوری دیانت سے اپنے کردار نبھا جائیں۔ اپنی اپنی لائنیں بولنے والے کہانی کار کی سوچی ہوئی لائن پر چلنے لگے۔ سب کا انہماک غضب کا تھا وہ بہت سنجیدگی سے اس مضحکہ خیز عمل میں مصروف تھے۔ چاق و چوبند ڈائریکٹر کمر پر ہاتھ رکھے اس مضحکہ خیز عمل پر مکمل ارتکاز کے ساتھ چوکس تھا۔

پروفیشنل رویہ رکھنے والی ہیروئن، حسب معمول ہوم ورک کر کے نہیں آئی تھی۔ بار بار ایک ڈائیلاگ پر اٹک رہی تھی۔ وہ ایک کونے میں کھڑا جھنجلاتا رہا، پھر مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ یہ سین اب دو گھنٹے تک ریکارڈ نہیں ہونا تھا۔

"اسٹاپ۔ فریم سے آؤٹ یہ کون ہے؟"

تین دن سے پندرہ کا گیارہواں سین اس سیٹ پر کرنے کا منتظر بے خیالی میں انگڑائی لے بیٹھا تھا، تھکی ہوئی انگڑائی مانیٹر میں لہرائی، کیمرہ مین سے لے کر وہاں بیٹھا ایک ایک شخص بھنا اٹھا۔

بے ساختہ سرزد ہونے والی اپنی بے ادبی سے گھبرا کر وہ اپنے آپ میں سمٹ گیا..... ڈی او پی کو آج تک اس کی شکل یاد نہ ہو سکی تھی..... حالانکہ وہ ان گنت بار کبھی گیٹ اپ میں اور کبھی گیٹ اپ کے بغیر کیمرے کے فریم میں آیا تھا۔

کبھی ہیرو کا رشتہ ہیروئن کے باپ کو پیش کرتے ہوئے۔

کبھی مہمان بن کر ڈرائنگ روم میں چائے پیتے ہوئے۔

کبھی کسی گھر میں نقب لگاتے ہوئے چوروں کا ساتھی بن کر۔

اسے اس بات کا یقین تھا کہ اس کا کردار مختصر سہی لیکن کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ زنجیر کو جوڑنے والی کڑی ہے اگر سیٹ پر موجود ہے تو اس کا کوئی جواز ہے۔ وہ اپنے ہونے بلکہ اہم ہونے کے تصور سے بشاش ہو گیا۔

گرچہ کہ کنٹی نیوٹی کے سین چل رہے تھے پر کہانی بے ربط سی لگ رہی تھی ہیروئن کی دی ہوئی ڈیٹس کے مطابق سین شوٹ ہو رہے تھے، ابا کا انتقال پہلے شوٹ میں ہو چکا تھا، بیمار بعد میں پڑ رہے تھے کہ یہ دنیا بھی عجیب دنیا تھی جہاں کچھ بھی عجیب نہ تھا، وقت کو بھول کر، عجلت کو پرے رکھ کر اپنی لائن سے مطلب رکھنا سب سے اہم تھا۔

اس سیٹ پر پندرہویں کے گیارہویں سین کی کسی کو عجلت اس لیے نہیں تھی کہ اس سین کو ہیرو ہیروئن کے بغیر کرنا تھا..... سیٹ پر اب ڈے لائٹ جل رہی تھی کہ یہ دنیا من مانی تھی۔ دن کو رات بنانا، رات کو دن بنانا، لائٹ مین کی ذمہ داری تھی۔ اور فرض کرنا ان سب کی۔

"لڑکی کہاں ہے؟"

اچانک جھنجلائے ہوئے ڈائریکٹر کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر جلدی جلدی سیل فون پر ٹک ٹک کر کے اس کا نام سوچنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس نے اطلاع دی۔

"سر! شاہراہ فیصل پر آواری کے پاس اس کی گاڑی ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی ہے۔"

"بے وقوف بناتی ہے سالی! آج سی این جی کی ہڑتال میں کیسا ٹریفک جام۔"

"لائن پروڈیوسر کہاں ہے؟"

ڈائریکٹر کی جھلاہٹ سے ماحول پر جھلاہٹ طاری ہو گئی، شاید ڈائریکٹر تھک گیا تھا۔ سیٹ پر موجود ہر چیز پر

تھکن طاری تھی۔

"مجھے ہر حال میں اگلے سین کے لیے پانچ منٹ کے اندر لڑکی چاہیے۔"

"ایکسٹراز کہاں ہیں؟" کسی نے بوکھلا کر اس کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا۔

"ابے الو کے..... یہ تو ساری مردانہ شکلیں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے ڈائریکٹر کی حقارت بھری نظر اس پر پڑی۔ ایک بار پھر وہ خود میں سمٹ گیا۔ اسے اپنے مردانہ چہرے سے کراہیت آئی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنا چہرہ میک اپ مین کے ماہر ہاتھ میں تھما دے جو اسے زنانہ گیٹ اپ دے دے، پر سیٹ پر ایکسٹراز کی خواہش نہیں، ڈائریکٹر کی مرضی چلتی ہے، یہ سوچ کر اس نے اپنا چہرہ جھکا لیا۔

"تم لوگ Props (سیٹ کی مطلوبہ اشیاء) پورا نہیں کرتے ہاتھ ہلاتے ہوئے سیٹ پر آجاتے ہو۔"

ڈائریکٹر جھنجلاہٹ میں لڑکی اور Props کو خلط ملط کر چکا تھا۔ اسے اس بے وقعتی ٹریفک جام پر غصہ آنے کے بجائے لڑکی پر غصہ آنے لگا۔

"لڑکی چاہیے..... لڑکی!"

سیٹ پر بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ Props کے نعم البدل کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ مگر لڑکی..... سیٹ پر سوائے ہیروئن کے دوسری لڑکی نہ تھی..... ڈائریکٹر کی شکل سے لگ رہا تھا جیسے ہی لڑکی داخل ہو گی وہ اس کا منہ نوچ لے گا۔

"سر! ان دونوں کو تو فارغ کریں..... لڑکی آتی ہے تو cheat کر لیں گے۔"

ڈائریکٹر ہذیانی بمع طنزیہ ہنسی ہنس دیا۔ "تم سمجھتے ہو کہ پبلک اب تک اسٹار پلس دیکھتی ہے۔ جانی دودھ پیتا بچہ بھی یہ بھنڈ پکڑ لے گا اور آئندہ کوئی پروڈیوسر مجھے پراجیکٹ نہیں دے گا۔ میرے بچے۔" یہ کہہ کر اپنا مکالمہ خود ہی روک لیا کہ یہ کلیشڈ ڈائیلاگ پبلک ڈیمانڈ نہیں تھے کسی کے بھی بچے بھوکے مریں کسی کو کیا۔

اچانک دروازہ کھلا۔

ٹھنڈی ٹھار فضامیں باہر کے حبس کی لپک آئی۔

"سوری۔" کی آواز پر ڈائریکٹر کا چہرہ کھل گیا۔ ایکسٹرا لڑکی اس کے گالوں پر بوسہ دے کر میک اپ کروانے لگی، ڈائریکٹر ہنسی مذاق کرنے لگا، سیٹ پر خوشی اور شادمانی کا دور دورہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بھی اطمینان اور خوشی چھا گئی۔ اس سین کے بعد اس کا سین شوٹ ہونا تھا۔ وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا اور ہشاش بشاش ہو کر اپنی پرفارمنس کے بارے میں ہمیشہ کی طرح سوچنے لگا کہ یقیناً" آج اس سے وہ پرفارمنس سرزد ہو جائے گی کہ زندگی بھر کی محنت وصول پائے گی۔ اور اِن کریڈٹس میں اس کا نام سب سے اوپر ہو گا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سین ریکارڈ ہو گیا۔ وہ جو دن بھر کا منتظر بیٹھا تھا۔ اپنے چہرے پر کیمرہ آنے کے خیال سے تازہ دم ہو گیا۔ پندرہویں کا گیارہواں سین ریکارڈ ہونے کا وقت قریب آگیا تھا۔ ڈائریکٹر مطمئن انداز میں سیل فون پر قہقہے لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔

وہ اسے باہر جاتا دیکھ کر اطمینان سے ہو گیا کہ بھنائے ہوئے ڈائریکٹر (یعنی قائم مقام خدا) کی غیر موجودگی میں سہولت سے سین ریکارڈ کروائے گا کہ اے ڈی (قائم مقام خدا) نے پیک اپ کا نعرہ لگا دیا۔

مصنوعی دنیا ایک بار پھر پل بھر میں سمٹ گئی اور وہ حق دق دیکھتا رہ گیا۔ لیٹ آنے والی لڑکی اسے "ہیلو" کہہ کر آگے بڑھ گئی تو وہ جیسے ہوش میں آگیا۔

اور آج پہلی بار اسے سیٹ سے غیر حاضر اسکرپٹ رائٹر پر غصہ آگیا۔ احتجاجاً" ہلکی سی ٹھوکر مار کر دل ہی دل میں پہلی بار ایک شکایت کر بیٹھا۔

"اے خدا! کیا تھا..... جو تو نے مجھے زندگی کے ڈرامے میں "ایک معمولی سی لڑکی" کا کردار دیا ہوتا۔"



جو غیر تھے وہ اسی بات پہ ہمارے ہوئے
کہ ہم سے دوست بہت بے خبر ہمارے ہوئے

کسے خبر وہ محبت تھی یا رقابت تھی
بہت سے لوگ تجھے دیکھ کر ہمارے ہوئے

اب ایک ہجومِ شکستہ دلاں ہے ساتھ اپنے
جنہیں کوئی نہ ملا ہم سفر ہمارے ہوئے

کسی نے غم تو کسی نے مزاجِ غم بخشا
سب اپنی اپنی جگہ چارہ گر ہمارے ہوئے

بجھا کے طاق کی شمعیں نہ دیکھ تاروں کو
اسی جنوں میں تو برباد گھر ہمارے ہوئے

وہ اعتماد کہاں سے فراز لائیں گے
کسی کو چھوڑ کے وہ اب اگر ہمارے ہوئے

فراز احمد فراز

مجھے اُسی گھر میں رہنا ہے

میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا
اور میرا باپ جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا
پھر دونوں نے مل کر آگ جلائی
اور میرے لیے ایک گھر بنایا
کچی مٹی اور پکے رنگوں سے بنے اس گھر میں
میں نے محبت دیکھی
اور اُسے بانٹنے گھر سے باہر نکل گیا
باہر خلوص کی کمی تھی
اور ایمان داری کو بے دخل کر دیا گیا تھا
میں نے کم روشنی اور نیم تاریکی میں
محبت کی شمع جلائی
اور تمہاری طرف آیا
تمہیں روشنی کی نہیں، مکمل تاریکی کی ضرورت تھی
تم نے شمع بجھا دی اور مجھے اندھیرے میں
گھسیٹ لیا
مجھے اندھیرے میں نہیں رہنا
مجھے اسی روشن اور چمکیلے رنگوں والے گھر میں
رہنا ہے
جہاں محبت ہے
اور میری ماں اور باپ کے پسینے کی خوشبو
مہکتی ہے

سید کامی شاہ

ہم اپنے آپ سے بیگانے تھوڑی ہوتے ہیں
سرور و کیف میں دیوانے تھوڑی ہوتے ہیں

تباہ سوچ سمجھ کر نہیں ہوا جاتا
جو دل لگاتے ہیں' فرزانے تھوڑی ہوتے ہیں

کہاں زبان و بیاں کارگر محبت میں
کہ یہ معاملے سمجھانے تھوڑی ہوتے ہیں

براہِ راست اثر ڈالتے ہیں پیار کے بول
کسی دلیل سے منوانے تھوڑی ہوتے ہیں

ہمیشہ ہاتھ میں رہتے ہیں پھول اِن کے لیے
کسی کو بھیج کے منگوانے تھوڑی ہوتے ہیں

کسی غریب کو زخمی کرے کہ قتل کرے
نگاہِ ناز پہ جرمانے تھوڑی ہوتے ہیں

شعور تم نے خدا جانے کیا کیا ہو گا
ذرا سی بات کے افسانے تھوڑی ہوتے ہیں

انور شعور

مرے بے خبر
تجھے کیا خبر
یہ جو لوگ تیرے فراق میں
ہوئے اپنی نیند سے در بدر
یہ جو رہگزاروں میں گم ہوئے
تجھے دیکھ لینے کو اک نظر
یہ دھنک ہیں تیرے جمال کی
یہ شفق ہیں صبحِ وصال کی
یہ کسک ہیں شامِ ملال کی
انہیں چاہتوں کے نگر میں رکھ
انہیں قربتوں کے اثر میں رکھ
انہیں ساری عمر سفر میں رکھ
انہیں لمحہ لمحہ نظر میں رکھ

ارشد ملک

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوالعباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے فرمایا۔

"تیری اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

اس نے کہا "(یہ) معزز لوگوں میں سے ہے۔ اللہ کی قسم! یہ اس قابل ہے کہ اگر کہیں پیغام نکاح بھیجے تو اس کا نکاح کر دیا جائے اور اگر (کسی کی) سفارش کرے تو سفارش قبول کی جائے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یہ جواب سن کر) خاموش رہے۔ پھر ایک اور آدمی (وہاں سے) گزرا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پھر پوچھا۔

"اس کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟"

اس نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس شخص کا تعلق فقرائے مسلمین سے ہے۔ یہ اس لائق ہے کہ اگر نکاح کا پیغام دے تو اس سے نکاح نہ کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو سفارش قبول نہ کی جائے اور اگر کوئی بات کہے تو اس کی بات سنی نہ جائے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یہ فقیر پہلے شخص جیسے دنیا بھر کے آدمیوں سے بہتر ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ ان میں ان فقرائے مسلمین کی فضیلت و عظمت کا بیان ہے جنہیں معاشرے میں ان کی غربت کی وجہ سے نہ کوئی جانتا ہے نہ ان کا احترام ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں ان میں سے ایک ایک شخص دنیا بھر کے انسانوں سے بہتر ہے جو ایمان و تقویٰ سے محروم ہوں۔

2۔ اللہ کے ہاں اصل اہمیت ایمان و تقویٰ کی ہے۔ نہ کہ نسب اور ظاہری شان و شوکت کی۔

3۔ نکاح کے لیے نیک مردوں اور نیک عورتوں کا انتخاب کیا جائے، چاہے وہ غریب ہی ہوں کیونکہ دینی اعتبار سے وہ دوسرے مسلمان کا (ہم پلہ) ہیں۔

یعنی دینی کفاءت (قرب، تناسب اور برابری) دیکھی جائے، محض دنیاوی کفاءت ہی کا خیال نہ رکھا جائے۔

دشمن کی گواہی،

سب جانتے ہیں۔ ابوجہل، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ایک مرتبہ اس کے دوست نے اس سے پوچھا۔

"دوست! یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی اور نہیں جو ہماری باتیں سن سکے۔ یہ بتاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں یا جھوٹے؟"

ابوجہل نے کہا۔

"خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے ہیں۔ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

اس اعتراف کے باوجود ابوجہل نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کی وجہ محض اس کا تکبر تھا۔ چنانچہ وہ شرک ہی کی حالت میں مارا گیا۔

ترکیب نمبر 9،

ایک صاحب نے دیر تک دفتر میں کام کیا۔ پھر وہ اپنی سیکرٹری کو ساتھ لے کر ہوٹل میں کھانا کھانے چلے گئے۔ وہاں سے دونوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے بعد صاحب سیکرٹری کے ساتھ اس کے گھر بھی چلے گئے۔ رات گئے وہ سیکرٹری کے ہاں سے رخصت ہونے لگے۔ تو انہوں نے اس سے ایک پنسل مانگ کر کان پر پھنسا لی۔ گھر پہنچے تو بیوی نے تاخیر کی وجہ پوچھی۔ شوہر نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

"جھوٹ... بکواس!" بیوی فاتحانہ انداز میں بولی۔ "تمہیں تو شو مارنے کی عادت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم دیر تک دفتر میں کام کر کے آ رہے ہو۔ پنسل ابھی تک تمہارے کان پر لگی ہوئی ہے۔"

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

چار بیویاں،

"میں دیکھ رہا ہوں عاطف۔ تم آج کل گھر سے زیادہ باہر پھرتے رہتے ہو۔ آخر کیا وجہ ہے؟"

"کچھ نہیں یار۔ گھر میں چار بیویوں کی وجہ سے ناک میں دم رہتا ہے۔ اس لیے میں زیادہ تر باہر رہتا ہوں۔"

"تو تمہاری چار بیویاں ہیں؟" عدیل نے پوچھا۔

"نہیں بھئی! ابھی تو میں نے شادی بھی نہیں کی۔ یہ دوسروں کی بیویاں ہیں۔ ایک میرے باپ کی، دوسرے میرے بھائی کی، تیسری میرے دادا کی اور چوتھی میرے نانا کی۔"

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

کشش،

٭ کشش ہے کس بلا کی، دیکھنا اس ملک میں یارو
جسے دیکھو، وہ کہتا ہے کہ میں امریکا جاتا ہوں
ادھر اک دل نشیں انداز سے امریکا کہتا ہے
کہ حضرت آپ کیوں زحمت کرتے میں خود آتا ہوں

عنایت علی خان

حل،

میاں نفیس احمد ایک ماہر نفسیات کے پاس پہنچے اور بولے۔

"میں نے اپنے بزنس پارٹنر کو دھوکا دیا ہے جس کی وجہ سے میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا ہے۔"

"اچھا اچھا!" ماہر نفسیات نے کہا۔ "تو آپ کی قوت ارادی کو مضبوط کر دوں تاکہ آپ اپنے بزنس پارٹنر سے معذرت کر سکیں اور غلطی کی تلافی۔"

"نہیں نہیں۔" میاں نفیس جلدی سے بولے۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ضمیر کو کمزور کر دیں۔"

عائشہ۔ گوجرہ

یاد رکھیں،

٭ کوئی آپ کا کتنا بھی قریبی عزیز، دوست، رشتہ دار کیوں نہ ہو، اس کی بات پر تب تک اعتبار نہ کرو، کوئی عمل نہ کرو، جب تک اپنی عقل سے پرکھ نہ لو۔ بعض اوقات حالات ہمارے اپنوں کو بھی ہمارا اپنا نہیں رہنے دیتے۔

٭ "برا وقت"، وہ شفاف آئینہ ہے جو بہت سارے چہرے واضح کر دیتا ہے۔ اور "اچھا وقت" بادلوں کی طرح ہوتا ہے جو سورج کی تپش تک کو روک لیتا ہے۔"

امینہ رؤف۔ جہلم

دھمکی،

٭ یہاں مرغی کسی کی ہو مگر انڈے ہمارے ہیں
اگر گڑبڑ کسی نے کی تو پھر ڈنڈے ہمارے ہیں
سپر پاور ہمیں مانو وگرنہ سوچ لو اتنا
یہ بھارت اور اسرائیل مشنڈے ہمارے ہیں

صائمہ نعیمی۔ کراچی

رنگ چرائے قوس قزح کے،

٭ عادتیں شروع میں کچے دھاگے کی طرح ہوتی ہیں مگر بعد میں یہ لوہے کے تاروں کی مانند ہو جاتی ہیں جن میں انسان جکڑ کر رہ جاتا ہے۔

٭ دریا اور زندگی دونوں پہ بند باندھنا پڑتا ہے تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دریا پہ مٹی کا بند اور پیکر خاکی کو ضبط کا بند درکار ہوتا ہے۔

٭ رشتے اور سودے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ رشتے

قائم کیے جاتے ہیں جبکہ سودے طے کیے جاتے ہیں۔
دعا کبھی بے کار نہیں جاتی البتہ قبول ہونے کی صورتیں مختلف ہیں۔
جن کا کوئی اپنا مر جاتا ہے ان کے پاس سوگ منانے کا واضح جواز ہوتا ہے مگر ان لوگوں کا کیا کیا جائے جو اپنی اداس صورتوں کی وضاحت نہیں کر پاتے کیونکہ ان کے زندہ بھی مردوں جیسے ہوتے ہیں۔
اگر آپ کو کوئی یاد نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ وہ آپ کو فراموش نہ کر دے۔
کمزور لمحے ہر انسان پر آتے ہیں۔ اگر ہم ان کمزور لمحوں کی گرفت سے نکل جائیں تو انسانیت کی معراج کو چھو لیتے ہیں۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ ہانیہ عمران۔ گجرات

پریشانی،

سحر کو دفتر میں ملازمت شروع کیے صرف ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اپنے برابر کی میز پر ساتھی کلرک کی صورت دیکھ کر اس نے ازراہ ہمدردی پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے...؟ آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟"

"میں دراصل یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ جب ہماری شادی ہو گی تو دفتر میں میرے اور آپ کے حصے کا کام کون سنبھالے گا؟"

ساتھی کلرک نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"شادی...؟" سحر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "ہمارے درمیان تو ابھی صحیح طرح سے بات چیت بھی شروع نہیں ہوئی ہے۔ یہ آپ نے شادی کے بارے میں کیسے سوچنا شروع کر دیا؟"

"فرض کرنے میں کیا حرج ہے...؟" ساتھی کلرک نے ذرا شرما کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔

تحریم۔ فیصل آباد

علم،

اندھیرا کسی چیز کا نام نہیں، اس کا کوئی وجود نہیں۔ اندھیرے کا مطلب ہے کہ ابھی تک یہاں علم کی روشنی نہیں پہنچی۔ جونہی روشنی آئے گی اندھیرے کا وجود مٹ جائے گا۔

ثمینہ گوہر۔ ڈوگہ گجرات

قابل دید،

ایک پارٹی میں ایک لڑکی نے نہایت باریک کپڑے کا لباس پہن رکھا تھا۔ جو نوجوانوں کے دل و دماغ پر بجلیاں گرا رہا تھا۔ من چلے بہانے سے اس لڑکی کے گرد چکر لگا رہے تھے۔

ایک خاتون بڑی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ جب ان سے برداشت نہ ہوا تو وہ اس لڑکی کے پاس پہنچیں۔

"سنو لڑکی! میں تمہارے ڈیڈی سے ملنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے بگڑے ہوئے تیور سے کہا۔

"وہ۔ سامنے، جن کو لڑکیاں گھیرے کھڑی ہیں، وہی میرے ڈیڈی ہیں، شہر کے مشہور لیڈیز ٹیلر۔ اوہ میں سمجھ گئی کہ آپ ان سے میرے جیسا ڈریس سلوانا چاہتی ہیں۔ ہے نا...؟" لڑکی نے انداز دل ربائی سے کہا۔

نازش ریحان۔ کراچی

سنہری باتیں،

- کسی تصویر کے اتنا قریب مت جاؤ کہ وہ دھندلی نظر آئے۔
(رابرٹ)
- نہ زیادہ خاموشی اچھی نہ زیادہ گفتگو۔
(جالینوس)
- انسان کا بہترین مطالعہ، انسان کا مطالعہ ہے۔
(پاسموا)
- طنز عینک کی مانند ہے جس کے ذریعے اپنے چہرے کے سوا ہر چیز نظر آتی ہے۔
(لنکن)
- حسن شکر میں لپٹی زہریلی گولی ہے۔
(محمود غزنوی)



امت الصبور

خواتین کی ڈائری

امبر گل کی ڈائری سے

رضی الدین رضی کی ایک نظم "خواہش" مجھے بے حد پسند ہے۔ یہ نظم جب میں نے پڑھی تو اسی وقت اپنی ڈائری کی زینت بنا لیا۔ قارئین کی نذر کر رہی ہوں۔

خواہش،

اُسے انجانے راستوں سے گزر جانے کی خواہش تھی
محبت میں اَمر ہو جانے کی، مر جانے کی خواہش تھی
وہ کہتا تھا جیون تیرگی ہے
اور ہمیں اس تیرگی میں رنگ بھرنے ہیں روشنی کے
اور یہ ہم کو مختصر سے چند لمحے جو میسر ہیں
یہ لمحے ہمیں محبت سے آباد کرنے ہیں
کسی کو دور سے دیکھنا اور کسی سے بات کرنی ہے
جہاں یہ دن گزر جائیں، وہیں یہ رات کرنی ہے
وہ کہتا تھا محبت کا کوئی موسم نہیں ہوتا
یہ ہر موسم کا جذبہ ہے جو کبھی بھی کم نہیں ہوتا
ادھوری سی محبت ہے ہمیں تکمیل کرنی ہے
محبت کو نئے ڈھب سے بسر کرنے کی خواہش
اُسے شب بھر جگاتی ہے
نہ جانے کون سی خواہش اسے ہر پل رُلاتی ہے
شناسا تھا پر ہر ایک سے بہت انجان رہتا تھا
اُسے ہر شخص کو حیران کر جانے کی خواہش تھی
محبت میں امر ہو جانے کی، مر جانے کی خواہش تھی

نغمانہ بٹ کی ڈائری سے

فرحت عباس شاہ کی "سرائے" کتنی ہی بار پڑھ چکی ہوں جذبات و احساسات کی ایسی شدت کہ انسان کانپ اٹھتا ہے۔

ریاضتیں ہوں یا مسافتیں
دیوانگی مانگتی ہیں
محبت عشق میں بدل جائے
تو جنوں میں بدلتے دیر نہیں لگتی

وہ سب مرحلوں سے گزر رہا تھا
اُسے چھپ کے رونا آ گیا تھا
وہ جان گیا تھا
ہمدردی چھپے بہائے ہوئے آنسو امر ہو جاتے ہیں
وہ یہ بھی جان گیا تھا
آنسو ہی صرف اپنے ہوتے ہیں
اور ہنسنا سب کا
اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا
اپنا دُکھ۔ بس اپنا دُکھ ہی ہوتا ہے

فارحہ اقبال کی ڈائری سے

شبنم شکیل اس دارِ فانی کو الوداع کہہ گئیں۔ کسی شاعر اور ادیب کے اس دنیا سے پردہ کر جانے کے بعد اس کی کچھ تحریروں کے معنی یکسر بدل جاتے ہیں اور ان میں ایک پیش گوئی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

شبنم شکیل نے یہ غزل پتا نہیں کب اور کس لہر میں لکھی تھی مگر اس کا ایک ایک شعر آج کا بلکہ ابھی کا کہا لگتا ہے۔

اب مجھ کو رخصت ہونا ہے، کچھ میرا ہار سنگھار کرو
کیوں دیر لگاتی ہو سکھیو، جلدی سے مجھے تیار کرو

یہ کیسا انوکھا جوڑا ہے جو آج مجھے پہنایا ہے
میں حوروں جیسی دلہن بنی، اب اٹھو اور دیدار کرو

اک ہار ہے سرخ گلابوں کا، اک چادر سرخ گلابوں کی
اور کتنا روپ چڑھا مجھ پر، اس بات کا تم اقرار کرو

اک بار یہاں سے جاؤں گی، میں لوٹ کے پھر کب آؤں گی
تم آہ و زاری لاکھ کرو، تم منت سو سو بار کرو

رو رو کر آنکھیں لال ہوئیں، تم کیوں سکھیو بے حال ہوئیں
اب ڈولی اٹھنے والی ہے، لو آؤ مجھ کو پیار کرو

ہاں یاد آیا اس بستی میں کچھ دیے جلائے تھے میں نے
تم ان کو بجھنے مت دینا، بس یہ وعدہ اک بار کرو

سندھو اجن کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر منوّر جمیل کی یہ غزل مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ آپ سب بھی پڑھیے۔

کسے خبر تھی کہ دل کا یہ حال ہونا تھا
تمہیں گنوا کے ہمیں بھی ملال ہونا تھا

ہمارے واسطے رستہ کوئی بچا کب تھا
وہیں تھے زخم، وہیں اندمال ہونا تھا

میں تیرا نام لکھوں خوشبوئیں سی جل اٹھیں
یہ معجزہ بھی مرے خوش جمال ہونا تھا

کبھی گلاب سے مہکیں، کبھی چراغ جلیں
سخن کے باب میں یہ بھی کمال ہونا تھا

کمال سادہ دلی ہے کہ بدگمانی ہے
تمہارے لب پہ بھی کوئی سوال ہونا تھا

ہوائے شہر نے رکھا بہت اداس مگر
مرا یقینِ محبت بحال ہونا تھا

سحرش یوسف کی ڈائری سے

قتیل شفائی ایک بہت خوبصورت شاعر، کہ جن کا انداز بہت منفرد ہے۔ اپنی اس غزل میں انتہائی بے نیازی اور خوبصورت انداز میں اپنے محبوب سے شکوہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اس ادا سے بھی ہوں میں آشنا، تجھے اتنا جس پہ غرور ہے
میں جیوں گا تیرے بغیر بھی، مجھے زندگی کا شعور ہے

نہ ہوس مجھے مئے ناب کی، نہ طلب صبا و سحاب کی
تری چشم ناز کی خیر ہو، مجھے بے پیے ہی سرور ہے

جو سمجھ لیا تجھے بے وفا، تو پھر اس میں تیری بھی کیا خطا
یہ خلل ہے میرے دماغ کا، یہ مری نظر کا قصور ہے

کوئی بات دل میں وہ ٹھان کے، نہ الجھ پڑے تری شان سے
وہ نیاز مند جو کہ سر بہ خم، کئی دن سے تیرے حضور ہے

میں نکل کے بھی ترے دام سے، نہ گروں گا اپنے مقام سے
میں قتیل جور و ستم سہی، مجھے تجھ سے عشق ضرور ہے



سرورق کی شخصیت

ماڈل ________ مہوش
میک اپ ________ روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ________ موسیٰ رضا

خالدہ جیلانی



آسیہ بلوچ ________ نواب شاہ
حال ہمارا پوچھا ہم سے چلتے چلتے تو نے بھی
سیکھ لیے ہیں بیگانوں کے طور طریقے تو نے بھی
شکوہ شکایت کیا دنیا سے، دنیا پیار سے جینا ہے
دکھ تو فقط اس بات کا ہے الزام تراشے تو نے بھی

زنیرہ خان ________ کینرڈ کالج
دل و نگاہ کے ہر امتحاں سے گزرے ہیں
خموش رہ کے بھی حسن بیاں سے گزرے ہیں
حقیقتوں کو نہیں جانتے کہ وہ کیا ہیں
مگر وہ لوگ کہ وہم و گماں سے گزرے ہیں

آسیہ جاوید ________ علی پور چٹھہ
حالِ دل کون سنائے اسے، فرصت کس کو
سب کو اس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھا ہے

رقیہ اسماعیل ________ بزمان
کب نکلتا ہے کوئی دل میں اتر جانے کے بعد
اس گلی کے دوسری جانب کوئی رستہ نہیں
تم سمجھتے ہو بچھڑ جانے سے مٹ جاتا ہے عشق
تم کو اس دریا کی گہرائی کا اندازہ نہیں

عائشہ ارما ________ پشاور
سارے عہد کا بوجھ تھا سر پر، دل میں سارے جہاں کا غم
وقت کا جلتا بلتا صحرا ہم نے جس دم پار کیا
جاگتی گلیوں، اونچے گھروں میں فردا فردا جھانکا ہے
جس لمحے سے ہم ڈرتے تھے، اس نے آخر وار کیا

حنا سلیم اعوان ________ آخون باندی
دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا
وہ دوستی تو خیر اب نصیب دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

نبیلہ خان مون ________ عبدالحکیم
رات اکثر مجھ سے یہ سوال کرتی ہے
کون ہے تیرے دل میں جو تجھے سونے نہیں دیتا

عائشہ ________ گوجرہ
وہ تجھ کو بھولے ہیں تو تجھ پر بھی لازم ہے میر
خاک ڈال، آگ لگا، نام نہ لے، یاد نہ کر

حرا شاہ ________ شجاع آباد
اس نے جب جب مجھے دل سے پکارا محسن
میں نے تب تب یہ بتایا کہ تمہارا محسن
لوگ صدیوں کی خطاؤں پہ بھی خوش بستے ہیں
ہمیں لمحوں کی وفاؤں نے اجاڑا محسن

نوشین اقبال نوشی ________ گاؤں بدو مرجان
ہمارے عجز کو سمجھا نہیں گیا محسن
اب آزما کے ہم اپنی انا کو دیکھتے ہیں

ماریہ الیاس ________ ہارون آباد
رک گئی زندگی بس اک موڑ پر
اس کے بن یونہی موسم گزرتے گئے
دل کے آنگن میں روتی رہیں حسرتیں
آنکھ زندہ رہی، خواب مرتے رہے

ثمینہ اکرم ________ کراچی
شکست و فتح تو اک عارضی حوالہ ہے
ہم اپنے ہونے کا اعلان کرنے نکلے ہیں
یہ کارِ عشق ہے ٹکڑوں میں نہیں بٹ سکتا
دل و دماغ کو یک جان کرنے نکلے ہیں

سمیرا اقبال ________ کراچی
کوچۂ عشق میں اک عمر پھرے خاک بسر
تب کہیں جل کے ہم اس آنکھ میں تصویر ہوئے



خبریں وگیان

تبصیر نشاط

مبارکاں مبارکاں

"اب تو عادت سی ہے مجھ کو ایسے جینے میں
زندگی سے کوئی شکوہ ہی نہیں ہے....."

زندگی سے کوئی شکوہ نہ کرنے والے اور قانع رہنے والے عاطف اسلم کو جب سارہ بھروانہ نظر آئیں تو وہ گنگنا اٹھے۔

"پہلی نظر میں تو نے ایسا جادو کیا
تیرے بن بیٹھا میرا جیا۔"

تاہم اب صرف عاطف کا "جیا" ہی نہیں، بلکہ وہ خود بھی سارہ بھروانہ کے بن بیٹھے ہیں، جی ہاں! گزشتہ دنوں خیر سے دونوں کی شادی لاہور میں انجام پا گئی ہے۔(اس شادی کے ساتھ ہی ملک میں پانی کی قلت دور ہوگئی ہے۔ کیونکہ کئی لڑکیوں نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے ہیں۔ منصوبہ ہے کہ ان آنسوؤں سے نمک الگ کرلیا جائے گا۔توقع ہے کہ یہ نمک کھیوڑہ سے نکلنے والے نمک سے بھی زیادہ ہوگا۔)

سارہ اور عاطف کی شادی نہایت دھوم دھام سے انجام پائی۔ مایوں اور مہندی میں دونوں ہی روایتی علاقائی لباس میں بہت سج رہے تھے۔ شادی والے دن عاطف کریم کلر کی شیروانی اور سارہ روایتی سرخ لہنگا سوٹ زیب تن کیے نہایت شان دار لگ رہی تھیں۔

سارہ بھروانہ کینئرڈ کالج لاہور سے گریجویٹ ہیں۔ وہ ایتھلیٹ بھی ہیں۔(شاید اسی لیے عاطف کو پانے کی دوڑ میں باقی لڑکیوں پر سبقت حاصل کرلی ہے۔)شادی کی تقریب میں کئی نامور فنکاروں نے شرکت کی۔

اداکارہ ماہرہ خان بطور خاص مرکز نگاہ رہیں۔ کیونکہ اپنے شوہر سے طلاق کی افواہوں پر خاموشی اختیار کرنے کے بعد وہ پہلی مرتبہ اپنے شوہر کے ساتھ منظر عام پر آئی تھیں۔(ہاں بھئی! وہی پبلسٹی حاصل کرنے کے طریقے)۔

عاطف اور سارہ اپنی شادی پر بے حد مسرور ہیں۔ سب لوگ، خاص طور پر عاطف کے مداح ان کی خوش گوار زندگی کے لیے دعا گو ہیں۔

محنت

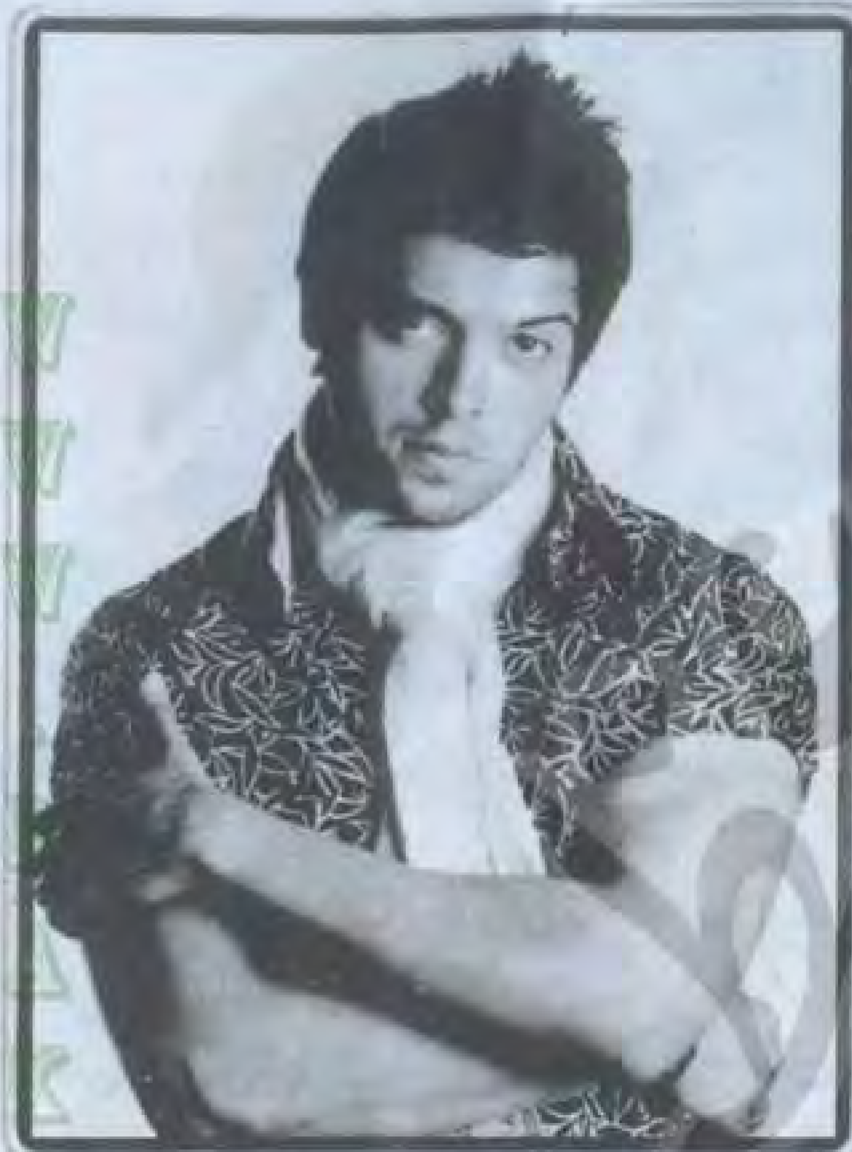
قارئین یا ناظرین کے لیے کسی بھی تخلیق کو مسترد یا قبول ہونے کی سند عطا کرنا لمحوں کا کام ہے۔ تاہم اس تخلیق میں کتنے لوگوں کا خون پسینہ بہا ہے یا کون سا دانہ کس طرح خاک میں مل کر گل و گلزار ہوا ہے، یہ جاننے کی زحمت کوئی نہیں کرتا۔

فہد مصطفیٰ باصلاحیت باپ کے ہونہار بروا ہیں۔ مارننگ شو میں بک بک کرنا ہو یا اداکاری میں جھک مارنا ہو، ہر کام چیلنج سمجھ کر کرتے ہیں اور کیا خوب کرتے ہیں۔

"وینا" فہد مصطفیٰ کی ایک کامیاب سیریل ہے۔ اس میں فہد نے ایک خواجہ سرا کا کردار ادا کیا تھا۔ ناظرین میں تو یہ سیریل مقبول تھا ہی۔ خود فہد بھی اس سیریل کو اپنے کیریر کا ایک اہم سنگ میل سمجھتے ہیں۔ فہد کہتے ہیں کہ.....

"ڈراما سیریل "وینا" میں میرا کردار کافی مشکل تھا۔ یہ ایک ایسے لڑکے کا کردار تھا، جو تھا تو ایک نارمل لڑکا ہی۔ مگر وہ چونکہ خواجہ سراؤں کے درمیان پلا بڑھا تھا۔ لہٰذا وہ ان ہی کا انداز اپنا کر خوشی محسوس کرتا تھا۔ میں نے اس کردار کے لیے بہت محنت کی۔ خواجہ سراؤں کی بستی میں گیا۔ ان کی شخصیت اور ان کے رہن سہن کے انداز کا بغور مشاہدہ کیا۔ کچھ خاص قسم کی معلومات حاصل کیں۔ تب کہیں جاکر یہ کردار نبھا پایا۔"

(لو جی! اتنی دور جانے کی کیا تک تھی بھلا۔ یہ جس چینل کی ڈراما سیریل تھی تو بیگم نوازش علی..... اوہ! اپنے علی سلیم بھی تو وہیں ہوتے ہیں۔ ان ہی سے مل لیتے۔)



عبادت

کہتے ہیں کہ دوسروں کو ہنسانا کسی عبادت سے کم نہیں۔ بقول شاعر.....

"بہت دور ہے گھر سے مسجد، چلو! یوں ہی کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے۔"

معروف مزاحیہ فنکار افتخار ٹھاکر ایک طویل عرصے سے یہ علامتی عبادت کررہے ہیں۔ تاہم اب ان کا رجحان حقیقی عبادت کی طرف بھی ہو چلا ہے۔ کچھ عرصہ قبل ان کے بارے میں اطلاع آئی تھی کہ بیرون ملک کے ایک دورے کے دوران انہوں نے ایک غیر ملکی جوڑے کو مشرف بہ اسلام کیا۔(سبحان اللہ) افتخار ٹھاکر گزشتہ دنوں نیوزی لینڈ کے دورے پر تھے۔ وہ ایک قدیم تاریخی چرچ دیکھنے گئے، تو اسی دوران نماز کا وقت ہوگیا۔ افتخار ٹھاکر کے جی میں نہ جانے کیا سمائی کہ انہوں نے چرچ انتظامیہ سے وہاں اذان دینے کی



اجازت طلب کی۔ اب یہ پتا نہیں کہ انتظامیہ کی سمجھ میں ان کی بات آئی یا نہیں' انہوں نے افتخار ٹھاکر کو اذان دینے کی اجازت بہر حال دے دی۔ اس وقت وہاں ڈھائی سو افراد موجود تھے۔ افتخار ٹھاکر نے اذان دی تو ان تمام لوگوں نے ہاتھ باندھ کے اور کھڑے ہو کر ان کی اذان نہایت عقیدت سے سنی۔ افتخار ٹھاکر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کے یادگار ترین لمحات ہیں۔ اللہ کی طرف سے ملنے والی اس سعادت پر وہ جتنا بھی شکر ادا کریں' کم ہے۔

(بلاشبہ افتخار جی! ہمیں بھی آپ پر بے حد فخر ہے۔ پڑوسی ملک کے اداکاروں اور اداکاراؤں کو اپنا آئیڈیل بنانے والے ہمارے بچے اور نوجوان آپ کو بھی اپنا آئیڈیل بنالیں۔۔۔ اے کاش!)

یہ بیان کالمانہ

سابق جنرل مشرف' ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو امریکیوں کے حوالے کرنے پر راضی تھا۔ وہ اس وقت کے وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی سے یہ کام کرانا چاہتا تھا' لیکن غیور بلوچ سردار نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

(قانون دان ایس ایم ظفر کی سوانح میں انکشاف)

☆ گیلانی ریسرچ فاؤنڈیشن کے ایک حالیہ سروے کے مطابق 71 فیصد پاکستانیوں کے مطابق وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ صرف 2 فیصد اپنی شادی شدہ زندگی سے بہت ناخوش ہیں۔ دلچسپ بات ہے کہ 77 فیصد دیہی علاقوں میں رہنے والے اپنی شادی سے بہت زیادہ خوش ہیں' جبکہ شہری علاقوں میں اس کی شرح 56 فیصد ہے۔

(اسلام آباد۔۔۔ آن لائن)

☆ ریمنڈ ڈیوس جس کے لیے امریکا نے اپنا سب سے عسکری اور سفارتی اتحادی ناراض کر دیا تھا۔ جسے بچانے کے لیے امریکا کو نیٹو سپلائی کی قربانی دینا پڑی۔ وہ ریمنڈ ڈیوس آج امریکا میں ایک معمولی جرم پر جیل میں پڑا ہے۔ امریکا اپنے پاگل شہری کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے' مگر وہ اپنے ملک میں اس شخص کا معمولی سا جرم بھی برداشت نہیں کرتا۔

(جاوید چوہدری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

☆ آسان زبان بولنے والوں کو بلڈ پریشر کے خطرات کم ہوتے ہیں۔ مشکل زبان بولنے والوں کی صحت جلد خراب ہو جاتی ہے۔

(نیٹ نیوز)

☆ پانچ برس کی جمہوریت میں کراچی میں ایک سو پچاس تاجر قتل اور سو ارب سے زائد بھتہ لیا گیا۔ پندرہ سو ارب کا نقصان پہنچا۔ تاجروں نے ٹیکس سے زائد تاوان ادا کیا۔

(آل کراچی تاجر اتحاد کے چیئرمین عتیق میر کا بیان)

☆ آج مشرف جو پاکستان بچانے کا نعرہ لگا رہا ہے۔ اس کے حامیوں سے کوئی پوچھے کہ جب امریکی وزیر دفاع کے ایک فون پر انہوں نے امریکا کی افغان جنگ میں امریکی اتحادی ہونے کا اقرار کیا تھا تو اس وقت وہ پاکستان بچا رہے تھے یا اسے پتھر کے دور میں دھکیل رہے تھے۔

(زاہدہ حنا۔۔۔ نرم گرم)

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37-اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com



مائرہ چوہدری۔۔۔ صادق آباد

اس ماہ کا شمارہ ملا۔ تو پہلے سرورق پہ نظر دوڑائی، اچھا لگا ٹائٹل، اب جب خط لکھ ہی لیا ہے تو عنیزہ سید کے ناول "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اب اصل بات جس کی وجہ سے خط لکھا وہ یہ کہ نازیہ جمال کا ناولٹ "محبت معتبر میری" دراصل شازیہ چوہدری کے ناولٹ "دیوار کے اس پار" کی نقل تھی جو کہ جولائی 1999ء کے خواتین میں شائع ہوا۔ تقریباً وہی اسٹوری اور وہی سین تھے۔

ج ۔ پیاری مائرہ! کبھی کبھی کہانی میں اتفاقیہ مماثلت ہو جاتی ہے۔ کچھ واقعات اور کہانی ایک جیسی ہوتی ہے، لیکن اگر ڈائیلاگ اور الفاظ بھی ملتے جلتے ہوں تو کہانی کو نقل کہا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں اور بھی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اس کی وضاحت نازیہ جمال ہی کر سکتی ہیں۔

مدثرہ فردوس قریشی۔۔۔ جہلم

"یقین کامل" نے بہت متاثر کیا۔ سلسلہ وار ناول "زمین کے آنسو" بھی بہت اچھا جا رہا ہے اور نمرہ حیات کے کردار نے تو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دیا۔ رشک حبیبہ کا ناولٹ "خمیازہ" بہت زبردست تھا۔ باقی تمام ناولٹ اور افسانے بھی بہت پسند آئے۔ ناولٹ یا افسانہ لکھ کر بھیجوں تو پہلے کس شمارے میں بھیجوں؟

ج ۔ مدثرہ! آپ ناولٹ یا افسانہ خواتین ڈائجسٹ کے نام پر بھجوائیں۔ افسانہ لکھنے کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔ ایک سطر چھوڑ کر صفحے کے ایک جانب لکھیں، اپنی شاعری بھی بھجوا دیں، قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

شاہدہ ظفر۔۔۔ گاؤں ڈیرہ مستی راولپنڈی

سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" پڑھتی ہوں کہ اس میں قرآنی آیات اور مستند احادیث کے حوالے سے ہر موضوع پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ فیورٹ ناول "میرے خواب لوٹا دو" اس دفعہ غائب، عنیزہ سید جی بہت اچھے طریقے سے کہانی کو آگے لے جا رہی ہیں۔ "زمین کے آنسو" موضوع کے اعتبار سے زبردست ہے۔

اس دفعہ سائرہ رضا کے بیاسی صفحات پر مشتمل ناول پر جس نے طوالت کے باوجود دلچسپی برقرار رکھی، خوب صورت الفاظ اور برجستہ جملوں کا استعمال اتنی روانی سے لگتا تھا الفاظ مصنفہ کے قلم کے آگے بھاگ رہے ہیں۔ لفظوں کا استعمال ایسے کہ بات بات اقوال کے اقوال جو یقیناً "مصنفہ کے اپنے تھے کچھ فقرے، جو بہت پسند آئے۔

جو دعا کرتا ہے وہ خدشہ نہیں پالتا۔

ہر انسان کے پاس اچھائی و برائی کا تناسب کم و بیش ہوتا ہے۔

بیٹیاں کوکھ سے نکل جائیں تو پٹتی رہتی ہیں، ہاتھوں سے، جملوں سے اور تقدیر کے فیصلوں سے۔

55 صفحات پڑھ لیے کہ مصنفہ کے ایک فقرے نے۔

"آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی ماموں؟" ایک دم چونکا دیا اور یہ رائٹر کے قلم کا خاصہ ہوتا ہے۔ ویل ڈن سائرہ جی، منفرد موضوع کے ساتھ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر بہت مبارک باد، ہم کتنا ہی اچھا کام کریں اس کے رزلٹ کے لیے متزلزل کیفیت کا شکار رہتے ہیں، کہانی کا نچوڑ یقین کامل ہو تو ان شاء اللہ رزلٹ مثبت آتا ہے۔

ج ۔ شاہدہ! بہت اچھا خط لکھا آپ نے بہت شکریہ!

تہنیت احمد۔۔۔ غازی پور

صغیرہ نذر کا خط پڑھ کر حیرت ہوئی کہ خواتین ڈائجسٹ کی اتنی پرانی قارئین بھی ہیں جو مسلسل اس کی ساتھی رہی ہیں اور اس کے ہر اتار چڑھاؤ سے واقف ہیں۔

صغیرہ نذر کی "موسم کے پکوان" کے بارے میں جو رائے ہے، میں یہ کہوں گی کہ ستر فیصد قارئین جو ہماری طرح دیہات میں رہتی ہیں۔ وہ کھانوں کی تراکیب ان ہی رسالوں سے سیکھتی ہیں۔

سائرہ رضا کا ناول دل کو چھو گیا، لیکن ایک بات کا مجھے یقین نہیں آتا کہ اولاد جیسی بھی ہو کیا باپ اولاد کے لیے اتنا سخت ہو سکتا ہے؟ ماموں کو اپنے بھائی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوا، یہ تھوڑی کمی سی لگی۔

فی الحال افسانہ لکھا ہے، اگر آپ کے معیار پر پورا اترا تو ان شاء اللہ ناول لکھوں گی۔

ج ۔ پیاری تہنیت! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سائرہ رضا کے ناول میں ایک وضاحت ضروری ہے۔ ابصار کا طریقہ کار غلط تھا، لیکن وہ ظالم نہیں تھا مونس کو ادارے میں بھجوانا غلط نہیں تھا لیکن اسے مریم کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا اور پھر کسی اچھے ادارے کا انتخاب کرنا چاہیے تھا۔ اسپیشل بچوں میں کچھ بچے تو بے ضرر ہوتے ہیں، لیکن کچھ بچوں کی ذہنی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس طرح کے بچوں کو گھر میں رکھنا گھر کے دوسرے افراد کے لیے خطرہ کا باعث بن سکتا ہے۔ مونس بھی گھر کے دیگر لوگوں کے لیے خطرہ بن چکا تھا۔ جہاں تک اور بچے نہ چاہنے کا تعلق ہے مریم کے دو بچے ابنارمل ہو چکے تھے۔ اس لیے ابصار مزید بچے نہیں چاہتا تھا۔ ایک باپ کے نظریہ سے سوچیں تو وہ بار بار معذور بچوں کی اذیت کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ مریم نے یہ تصور کر لیا کہ وہ ظالم ہے اور اس نے ماموں کے ذہن میں بھی یہ بات راسخ کر دی۔ جس نے ماموں کے ذہن پر غلط اثرات مرتب کیے۔

سمیرا انور۔۔۔ جھنگ

خوب صورت لفظوں کے پیراہن میں لپٹا "خواتین ڈائجسٹ" ہاتھ آیا، تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سائرہ رضا میری فیورٹ رائٹر نے "یقین کامل" میں واقعی یہ ثابت کر دیا کہ یقین سے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں "مونس اور عون" جیسے بچوں کو وہ اصل مقام نہیں دیا جاتا، جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں میں بہت سی ایسی خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو دیگر بچوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اگر انہیں مناسب توجہ ملے تو وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر معاشرے میں اپنا نام اور مقام بنا سکتے ہیں۔ میں نے ایک ٹی وی پروگرام میں دیکھا کہ ایک بچہ جس کے ہاتھ بالکل معذور تھے لیکن وہ اپنے پاؤں کی انگلیوں سے کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا۔ ایسے والدین کی ہمت کو داد دینی چاہیے کہ وہ اپنے ذہنی صلاحیتوں سے محروم بچوں کو احساس کمتری کا شکار نہیں ہونے دیتے۔ سائرہ رضا تھینکس آپ نے ایک اہم موضوع کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کروائی۔

اب آتے ہیں نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" کی طرف احمد رضا کے بارے میں بہت مختصر لکھا شانی کو اتنا سخت دل نہیں بننا چاہیے۔ اتنا اندھا یقین بھی اچھا نہیں ہوتا۔ "دل کے آس پاس" میں عنادل کی بہادری اور اعتماد اچھا لگا۔ "رشک حبیبہ" کا خمیازہ پسند آیا۔ افسانے سب اچھے اور بہترین تھے مگر "آج کے بعد" افسانہ بہت اچھا تھا۔ پلیز "توثیق حیدر" کا انٹرویو شائع کریں۔

ج ۔ سمیرا! بچوں کی معذوری والدین کے لیے بہت اذیت ناک ہوتی ہے اسے برداشت کرنا بہت آسان کام نہیں ہے لیکن کوشش اور محنت سے ان کو معاشرے کا کارآمد شخص بنایا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ ایسے والدین مبارک باد کے مستحق ہیں جو ہمت نہیں ہارتے اور اپنے بچوں پر پوری توجہ دیتے ہیں۔

صفیہ کوکب گوندل۔۔۔ اسلام آباد

شازیہ جمال نیر کا ناولٹ "دل کے آس پاس" کا موضوع پرانا تھا لیکن کرداروں کے نام نئے تھے جیسے عنادل اور غزین وغیرہ، آپ کا باورچی خانہ میں ثمرین اکرام کی دی گئی ڈش انڈا کڑاہی پسند آئی۔
ماڈل واداکارہ یمنی جعفری سے ملاقات اچھی رہی۔
ج - پیاری صفیہ! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ کسی بھی سلسلے میں آپ کا نام شامل نہ ہوسکا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شمائلہ نصیر عاجز۔۔۔ گاؤں کرپا اسلام آباد

میرا گاؤں کرپا اسلام آباد ہر قسم کے وسائل سے مالا مال ہے، سب ہی سہولتیں موجود ہیں ماسوائے سوئی گیس کے۔
سب سے پہلے تو "یقین کامل" سائرہ رضا میں تو آپ کے سحر میں کھو گئی۔ اتنی گہرائی اور گرفت (کاش میں بھی ایسا لکھ پاؤں)۔ "زمین کے آنسو" دن بہ دن دلچسپ ہوتی جارہی ہے۔ ایک شاہ اور اریب فاطمہ کا ملن ہم سے حساس دلوں کے لیے ناگزیر ہے نگہت جی۔ ناولٹ تینوں مجھے پسند آئے۔ خاص طور پر "خمیازہ" واقعی لڑکیوں کو اتنا بے وقوف نہیں ہونا چاہیے۔ افسانے سب ہی سبق آموز تھے۔ "میں پیتل تو سونا" کا تحریری انداز بہت بھایا اور پونا عشرت مہلی کی "ہار" جانے کیوں بار بار پڑھی۔ دل سے کہہ رہی ہوں اس دفعہ میں نے کچھ نیا پن، نئی تازگی محسوس کی، بہار کی نوید ہو جیسے ٹائٹل گرل کے حسین چہرے سے لے کر بیوٹی بکس تک کچھ نیا تھا۔
ج - شمائلہ! آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں گیا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لئے شکریہ۔

شمائلہ رحمٰن ہاشمی۔۔۔ بھاول پور

مجھے خواتین ڈائجسٹ اور شعاع بہت پسند ہیں۔ مجھے نمرہ احمد، نایاب ملک، نگہت سیما، بشریٰ رحمٰن، نایاب جیلانی، رائٹرز پسند ہیں اور ہاں عمیرہ احمد بھی۔ میری ان سب رائٹرز سے گزارش ہے کہ پلیز ایسے ناول لکھیں جو قرآن پاک اور قانون کے حوالے سے لکھے ہوئے ہوں تاکہ تفریح کے ساتھ ساتھ معلومات میں اضافہ ہو۔
ج - شمائلہ جی! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی فرمائش مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

فائزہ محمود۔۔۔ بھاول پور

خواتین بہت زبردست جارہا ہے۔ اس کے تمام سلسلے بہت دلچسپ ہیں مجھے "ہمارے نام" پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے۔ سب لوگ بہترین تجزیے کرتے ہیں جب کوئی ہمارے دل کی بات کہہ دے تو دل کو بہت خوشی ملتی ہے (میں تعریف کے سلسلے میں کہہ رہی ہوں)۔ آپ مجھے یہ بتا دیں کہ اگر میں نے ناول منگوانا ہے تو میں پیسے اس خط والے لفافے میں رکھ کر بھیج سکتی ہوں؟ کیونکہ منی آرڈر کوئی کروا کر نہیں دے گا (مجھے تو خط پوسٹ کرنے کا بھی بہت مسئلہ ہوتا ہے) میں نے "وہ خبطی سی دیوانی سی" منگوانا ہے تو 500 بھیج دوں اس لفافے میں؟
ج - پیاری فائزہ! آپ لفافے میں پیسے ڈال کر بھجوائیں گی تو اس میں پیسے گم ہونے کا خطرہ ہے۔ آپ اپنا ایڈریس بھجوا دیں ہم آپ کو ناول وہ "خبطی سی دیوانی سی" وی پی کردیں گے۔ آپ کو ڈاکیہ کو 600 روپے دینا ہوں گے۔ ناول آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

سرورق شاندار بلکہ بہت اعلا لگا۔ تفصیل بعد میں، پہلے بتا دوں کہ مجموعی طور پر خواتین ایک دم پرفیکٹ تھا۔ افسانے سب اچھے تھے مگر جی "میں پیتل تو سونا" کی تو کیا ہی بات ہے۔ بہت ہی گہرائی سے لکھا آئمہ نے۔۔۔ نگہت جی احمد رضا کو جلد از جلد اس دلدل سے نکال لیجیے گا۔ ناولٹ کی بات کی جائے تو جمال سسٹرز نے دھوم مچا دی۔ ہمارے نام میں مجھے صغیرہ آنٹی کا خط پسند آیا۔۔۔ "کوہ گراں تھے ہم" واہ بھئی مزہ آگیا۔۔۔ رابعہ ہی شاید سعد کی ماں شہناز ہے جب ہی تو کبھاری سعد کو دیکھ کر چونکا تھا۔۔۔ کیونکہ سعد کی شکل اپنی ماں سے ملتی ہوگی۔ یمنی جعفری کی باتیں بھی اچھی لگیں۔
نمرہ بخاری ہمیں شبلی جوادی بہت یاد آرہے ہیں۔
فائزہ، راحت پلیز کوئی ناولٹ لکھونا۔۔۔ ثروت نذیر تو ٹی وی کو پکی پکی پیاری ہوگئیں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ اور رابعہ انجم کا انٹرویو شائع کریں۔ ہو سکے تو جیو اینکر ماریہ میمن کا بھی۔
ج - پیاری عائشہ! آپ کا انتخاب شائع نہ ہوسکا۔ اس کے لیے معذرت ہمیں احساس ہے کہ آپ مصروفیت میں

سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھتی ہیں اور جب خط شامل نہ ہوں تو بہت افسوس ہوتا ہے۔ شاہین رشید قارئین کی فرمائش ضرور پوری کرتی ہیں لیکن کچھ لوگ انٹرویو دینا پسند نہیں کرتے تو مجبوری ہوتی ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عفت فاطمہ۔۔۔ جھنگ

سب سے پہلے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کو اس کی سالگرہ پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ محمود ریاض صاحب نے جو پودا لگایا تھا وہ اب پھل پھول کر تناور درخت بن چکا ہے۔ تقریباً" 19 سال پہلے 1994ء میں جب میری شادی ہوئی تو شادی کے پانچ دن بعد میں نے اپنے شوہر سے خواتین ڈائجسٹ کی ہی فرمائش کی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن چاند نگر سے جو رشتہ جڑا تو جڑا ہی رہا۔ زندگی میں ہزاروں نشیب و فراز آئے مگر اس ادارے کے پرچوں سے جڑا ناتہ نہ ٹوٹا۔ اس ادارے نے پاکستانی ڈراموں کو اپنا کھویا ہوا مقام دلایا۔ ایک وقت تھا کہ جب انڈین ڈراموں کا وقتی گلیمر ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اس ادارے کے ناولز پہ بنائے جانے والے ڈراموں کی وجہ سے ڈراموں کو ایک نئی زندگی ملی۔ پچھلے دنوں ایک میگزین میں امجد اسلام امجد کا انٹرویو پڑھ رہی تھی۔ انہوں نے کہا، اب پاکستانی ڈرامہ آہستہ آہستہ اپنی اصل شکل میں آرہا ہے۔ یہ صرف چاند نگر کے ادارے کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ آپ کے پرچوں کی کہانیاں اتنی سبق آموز ہوتی ہیں۔ میری سب ماؤں سے گزارش ہے کہ وہ اپنی بچیوں کو یہ رسالے پڑھانے کے لیے دیں تاکہ وہ زندگی گزارنے کے اچھے اصول سیکھیں۔ باقی آپ سے ایک گزارش ہے۔ کرکٹرز اور دیگر شعبہ زندگی مثلاً" ٹی وی رائٹرز نیوز کاسٹرز اور کھیلوں سے متعلق افراد کا انٹرویو لیں۔
ج - پیاری عفت! آپ کو بھی مبارک ہو۔ خواتین ڈائجسٹ اور ادارے سے نکلنے والے دوسرے پرچوں کی کامیابی میں آپ قارئین کا بہت بڑا حصہ ہے اور ہم اپنی قارئین کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

ع۔ل۔۔۔ کراچی

آپ کو ایک تجویز دینی تھی اگر اس پر عمل ہوجائے تو کتنی ہی لڑکیوں کا فائدہ ہو جائے جو اپنی پڑھائی کی وجہ سے اور کچھ کاہلی اور لاپروائی کی وجہ سے کچن سے دور ہیں اور جنہیں چائے تک صحیح بنانی نہیں آتی۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں کھانا پکانا سکھایا جائے بالکل اس طرح جیسے کسی اناڑی کو سکھایا جاتا ہے۔ کتنے افراد کے لیے کیا چیز، کتنی مقدار، کتنی تعداد میں ڈالنی ہے کب، کس طرح، کتنی آنچ میں پکانا ہے۔
ج - اچھی بہن! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تجویز سمجھ میں نہیں آئی۔ پکوان کی جو ترکیبیں دی جاتی ہیں۔ ان میں چیزوں کی مقدار اور پکانے کا طریقہ دیا جاتا ہے۔ آنچ کا صحیح پیمانہ دینا ممکن نہیں۔۔۔ یہ تو ہم بتا دیتے ہیں کہ دھیمی آنچ پر پکائیں۔

ثوبیہ رحمٰن

تمام مصنفین بہت اچھا لکھتی ہیں۔ میں نے بھی اپنے پانچ افسانے بھیجے تھے۔ جن کا کوئی جواب نہیں ملا۔
ج - پیاری ثوبیہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ نے پانچ کہانیاں بھجوائی تھیں جس میں سے دو کہانیاں ناقابل اشاعت ہیں اور تین کہانیاں ابھی پڑھی نہیں گئیں آپ 32721666 پر فون کرکے اپنی کہانیوں کے بارے میں پتا کرسکتی ہیں۔

آپ کا باورچی خانہ

عاصمہ احمد علی



ہر خاتون خانہ کی طرح مجھے بھی گھرداری سے شغف ہے۔ کیونکہ کچن کو کسی بھی گھر کا "دل" قرار دیا جاتا ہے اور اس کی دھڑکن ٹھیک رہے تو سمجھیں تمام گھر کی صحت ٹھیک ہے۔ لہٰذا ایک ماں ایک اچھی باورچن ہی نہیں آدھی پونی ڈاکٹرنی بھی ہوتی ہے اور بچیوں کی اتنی تربیت ہونی چاہیے کہ ان کو کم از کم کچن سنبھالنا آتا ہو ڈھنگ سے۔

آیئے تشریف لایئے "میرے باورچی خانے میں"

(1) سچ کہوں تو کھانا پکاتے ہوئے میں غذائیت اور پھر صحت کا خیال رکھتی ہوں۔ پسند کا نمبر آخر میں آتا ہے۔ کیونکہ میرے اور ماہرین غذا کے مطابق ہر سبزی غذائیت کا خزانہ ہے۔ متوازن غذا کو ذہن میں رکھ کر مینو بنتا ہے اور چاہے میرے گھر والے نخرے کریں، میں دسترخوان پر ہر نعمت خداوندی شامل رکھتی ہوں۔ ویسے میرے گھر والے میرے بچے سب بہت اچھے ہیں۔ ہر چیز دال ہو یا سبزی کلیجی ہو یا گوشت بغیر ناک بھوں چڑھائے کھا لیتے ہیں کیونکہ پتا ہے یہی ملے گا۔ میں نے یہ گر اپنی دادی اماں سے سیکھا تھا۔ شروع سے بچوں کو سبزی دال سلاد مٹن سب کی عادت ہونی چاہیے۔

(2) اچانک مہمان آجائیں تو سو بسم اللہ۔ ہم لاہوری کھانے پینے میں ہی تو ماہر ہیں۔ عام طور پر بھی گھر میں ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک دسترخوان لگا ہوتا ہے۔ گھبرائے بغیر کولڈ ڈرنک سرو کرتی ہوں پھر کچن میں آجاتی ہوں۔ سچی بات ہے کہ جب میں چکن یا مٹن منگواتی ہوں تو کچھ چکن فریز کر لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ فریز نہیں کرتی۔ ہاں شامی کباب یا برگر پیٹز ضرور کرتی ہوں۔ یہاں میں جلد بننے والے ایک مزے دار سے کھانے کی ترکیب شیئر کرتی ہوں۔ کوکنگ ٹائم پندرہ منٹ۔

چکن پراٹھا رول

اجزا :

چکن بون لیس	آدھا کلو (کیوبز کاٹ لیں)
دہی	3 چمچ بڑے
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	1 چائے کا چمچ
اگر ہو تو تکہ مسالا	1 چائے کا چمچ
تیل	تھوڑا سا
ہری چٹنی	1/2 پیالی (ہرا دھنیا + پودینہ اور نمک ملا کر تیار کریں)
چلی گارلک ساس	1/2 پیالی

ترکیب :

چکن اور دہی میں سب مسالے ملا کر چولہے پر پکنے رکھ دیں۔ جب پانی خشک ہو تو اتار لیں۔ عام گوندھے آٹے کی چھوٹی چھوٹی روٹی بیل لیں۔ توے پر احتیاط سے پکائیں کہ سفید سفید ہی رہے۔ اطراف میں ہلکا سا آئل لگا کر سینک لیں۔

پراٹھے اتار کر بنا ہوا چکن اوپر پھیلائیں۔ ہر رول پر تھوڑی ہری چٹنی (ویسے یہ آپشنل ہے) اور چلی گارلک ساس پھیلا کر ٹائٹ رول کر دیں۔ یقیناً" چکن پراٹھا رول آپ کے مہمان پسند کریں گے۔ کیونکہ سالن اور چاول بنانے کی تراکیب تو بہت شائع ہو چکی ہیں۔

(3) یقیناً" کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہے اور میں بھی اس معاملے میں بہت خیال رکھتی ہوں۔ صاف ستھرا چمکتا کچن، صاف چولہے حتیٰ کہ کچن میں استعمال ہونے والے ڈسٹر بھی صاف ستھرے ہونے چاہئیں کہیں کسی گوشے سے بو نہ آئے۔



واشنگ پاؤڈر 2 چمچ میں 2 چمچے ہی سرکہ ملا کر اس میں تولیہ بھگو لیں اور اندر سے کیبنٹس صاف کر لیں۔ اگر رات کو کچن بند کرنے سے پہلے کچن کو مکمل صاف کر لیں تو صبح خوشگواریت لیے ہوتی ہے۔ میں روزانہ ہاتھوں ہاتھ مسالوں کے ڈبے کبھی درازیں، کبھی برتنوں کی ٹوکری صاف کرتی رہتی ہوں۔

برتن دھونے کی جالی کو رات کو سرف + سرکے میں بھگو دیں۔ جالی ہو یا اسفنج صاف ہو جائے گی۔ ڈرین پائپ کو صاف رکھیں۔ کچن صاف رہے گا۔

(4) صبح کا ناشتا صحت کے اعتبار سے جتنا ضروری ہے ہمارے یہاں اس کے بارے میں اتنی ہی لاپروائی ہے۔ میرا لیکچر چلتا ہی رہتا ہے۔ ویسے ہمارے یہاں ناشتے میں زیادہ تر انڈا ڈبل روٹی اور نان چنے چلتے ہیں۔ میں اکثر بچوں کو پراٹھے اور چھٹی والے دن پوریاں گھر پر بنا دیتی ہوں۔ اب تو سینڈوچ ہی بچے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ویسے ہمارے بڑے کہتے ہیں کہ ناشتے میں نمکین کم اور میٹھی چیزیں زیادہ لینی چاہئیں۔ جیسے حلوہ سویاں اور فرنچ ٹوسٹ اور دہی لسی وغیرہ۔ میں یہاں آپ کو ایک روایتی میٹھی روٹی کی ترکیب بتانے جا رہی ہوں۔

امید ہے پسند آئے گی۔

سادہ عام آٹا	2 پیالی
انڈے	2 عدد
چینی	1 پیالی
میٹھا سوڈا	2 چٹکی یا بیکنگ پاؤڈر لے لیں 1/4 چائے کی چمچی
گرم دودھ	1 پیالی
گھی	1/2 پیالی

ترکیب :

آٹے میں میٹھا سوڈا یا بیکنگ پاؤڈر ملا کر چھان لیں۔ چینی اور انڈوں کو آٹے میں ملا کر ہاتھوں سے مکس کر کے پھر نیم گرم دودھ سے گوندھ لیں۔ دودھ اندازے سے لکھا ہے، کم یا زیادہ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس آٹے کو بہت زیادہ نہیں گوندھنا۔ تھوڑی دیر رکھ کر چھوٹے سائز کی روٹی بیل لیں۔ ذرا سی موٹی رکھیں۔ آٹا گوندھتے ہوئے اصلی دیسی گھی 1/2 پیالی شامل کر لیں تو اور مزے دار ہو جائیں گی۔ توے پر سینک کر اطراف میں گھی لگا لیں۔ خستہ میٹھی روٹی تیار ہے۔

(5) نہیں جی، ہمارے گھرانے میں باہر جا کر کھانے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ کیونکہ بھائی لوگ باہر سے پیک کروا کر گھر لے آتے ہیں، وہ بھی بہت کم۔ میرے میاں صاحب کی خواہش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ بچوں کو گھر پر ہی سب بنا دوں۔ کیونکہ وہ باہر کا کھانا پسند نہیں کرتے۔ سو شاذ و نادر ہی باہر جا کر کھانے کا موقع ملا ہے۔

(6) جی ہاں ہمیں کھانے اور پکانے دونوں میں موسم کو مد نظر رکھتی ہوں۔ مجھے گرمیوں میں فریز شدہ سبزیاں اور سردیوں میں فریز شدہ پھل پسند نہیں ہیں۔ مجبوری کی اور بات ہے لیکن آج کل فریزر کے غلط استعمال کا رواج چل پڑا ہے۔ بھائی! اللہ پاک نے جس سبزی اور پھل کو جو موسم کا مزاج عطا کیا ہے تو آپ کیوں اسے الٹا چلاتے ہو؟ مجھے موسمی سبزیاں اور پھل پسند ہیں۔ گرمی میں ٹھنڈی سبزیاں ہیں تو سردیوں میں ڈرائی فروٹ، پائے، مچھلی، بھنے ہوئے سالن اور حلوہ جات۔ یہ سخت سردی میں ہی کھانا مناسب ہے۔ جبکہ گرمی میں جب پسینہ بہہ نکلے تو رائتہ، ہرا بھرا سلاد، نمکین ٹھنڈی لسی، گھیا توری، ٹھنڈے میٹھے پھل، جوسز، فروٹ ڈیزرٹ وغیرہ کا اپنا مزا ہے۔ سو کھانے پینے کی عادات فطرت کے مطابق اپنائیں۔ سردیوں میں فریز شدہ آموں کا ملک شیک اور گرمیوں میں فریز شدہ مٹر کا پلاؤ بہت عجیب سے لگتے ہیں۔ (معذرت کے ساتھ) اپنی اپنی پسند ہے بھئی۔

(7) بہت ساری مجھے کوکنگ کا شوق ہے اور جب کسی نئی ڈش کو بنانے کا جنون ہوتا ہے تو میں ہر چیز بھول جاتی ہوں اور میں جی جان سے جت جاتی ہوں۔ چاہے نرگسی کوفتے ہوں یا حیدر آبادی بریانی۔ زردہ ہو یا کیک اور سب سے بڑی بات جو میں بہنوں سے کہنا چاہوں گی کہ میں نے کبھی کسی چیز کو جان کا روگ نہیں بنایا۔ بیکنگ میرا شوق ہے بلکہ جنون ہے۔ لیکن میرے پاس اوون سمیت بہت سارے لوازمات نہیں تھے۔ مگر میں متبادل طریقے ڈھونڈ کر کسی بھی طرح کام چلا لیتی تھی۔ جہاں تک چل سکے۔ آہستہ آہستہ میں نے سب سامان خریدا ہے۔ محنت کا اجر تو ملتا ہی ہے۔

(8) کچن کی ٹپ تو جناب بہت سی ہیں۔ ہمارے میڈیا کی بدولت اب تو گھر بیٹھے ٹپس اینڈ ٹوٹکاز، ایک ڈھونڈ ہزار ملتے ہیں۔ مگر میں آج بہنوں کو یہ مشورہ دوں گی کہ زندگی کی شاہراہ پر اپنے لیے اپنے کچن میں دلچسپی ڈھونڈ لیں۔ جو کریں گھر والوں کے لیے محبت، اخلاص اور خوشی سے کریں۔ کام کو بوجھ نہ سمجھیں۔ جب اپنا آپ منوانا ہو تو یہ میدان بھی کچھ کم نہیں۔ اپنی ذہانت یہاں آزمائیں۔ ہر خاتون کے اندر ایک نہ ایک ٹیلنٹ چھپا ہے سو دل چھوٹا نہ کریں۔ اپنے کچن کو نئی لک دیں۔ چھوٹی چھوٹی بچت کر کے سہی کبھی گل دان تو کبھی نئے طریقے کی باسکٹ تو کبھی نیا واٹر سیٹ اور کبھی نیا ٹکور ہاٹ پوٹ سیٹ۔ خوش رہیں، خوش رکھیں۔ تندرست رہیں گی۔

اس کے ساتھ اللہ حافظ۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

پائن ایپل کیک

اجزا :

میدہ	ایک کپ
انڈے	تین عدد
چینی	ایک کپ
کریم	پانچ سو گرام
آئسنگ شوگر	دو سو گرام
پائن ایپل ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
پائن ایپل ٹن	ایک عدد
گھی	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب :

میدے میں چینی اور انڈے خوب اچھی طرح پھینٹ کر یکجان کر لیں۔ آمیزہ جتنا اچھا پھینٹیں گی۔ کیک اتنا ہی نرم بنے گا۔ سانچے میں گھی لگا کر اسے چکنا کر لیں۔ آمیزہ سانچے میں ڈال کر اسے 80 سینٹی گریڈ پر تیس منٹ تک بیک کر لیں۔ اگر اوون نہیں ہے تو ایک بڑے پتیلے میں بہت سارے چکنے پتھر ایک گھنٹے تک دہکائیں۔ پھر کیک کا سانچہ پتھروں پہ رکھ کر ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے پکائیں۔ کریم اور آئسنگ شوگر کو پھینٹ لیں پھر تھوڑا سا پائن ایپل ایسنس بھی ملا لیں۔ کیک پر پائن ایپل ٹن کا سیرپ ڈال کر نرم کریں اور پائن ایپل کے ٹکڑے سیٹ کریں۔ تیار کریم سے کیک پر لیپ کریں پائن ایپل کے چند ٹکڑوں سے اوپر سجاوٹ کر دیں۔ مزے دار پائن ایپل کیک تیار ہے۔



بقیہ شنا میر

آپ کو بتاؤں کہ یہ چالیس، پچاس سال کا ریکارڈ ٹوٹا ہے۔ آج تک پاکستان نے کبھی بھی ورلڈ کپ میں انڈیا کو نہیں ہرایا تھا اور یہ اعزاز ہمیں حاصل ہوا تو آپ اس چیز کو ہائی لائٹ کیا کریں اور تنقید کے ساتھ ساتھ تعریف بھی کیا کریں۔ اس چیز کا ہمیں بہت زیادہ کریڈٹ ملنا چاہیے تھا۔ مگر اتنا ملا نہیں۔ پی سی بی کی طرف سے ہمیں شاباشی ملی۔ مگر ہم میڈیا اور عوام کی سپورٹ بھی چاہتے ہیں۔"

"صرف شاباشی ملی یا کچھ انعام و اکرام بھی ملے تھے؟"

"ہمیں انعام و اکرام نہیں ستائش، حوصلہ افزائی اور سہولیات چاہئیں۔ ہمیں پیسوں کا اتنا لالچ نہیں ہے۔"

"کچھ اپنی فیملی اور اپنے بارے میں بتائیے؟"

"میرا تعلق ایبٹ آباد سے ہے۔ میرے والد آرمی میں تھے۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں 5 جنوری 1986ء کو پیدا ہوئی اور میں نے بی ایس سی تک تعلیم حاصل کی ہے۔"

"کیا بچپن سے ہی کرکٹر بننے کا شوق تھا؟ لڑکے تو سڑکوں پہ کھیل کے کھلاڑی بنتے ہیں اور آپ؟"

"شروع سے ہی شوق تھا کہ ملک کی نمائندگی کرنی ہے۔ نام کمانا ہے ملک کے لیے۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے میرے خواب پورے کیے اور جناب! میں بھی سڑکوں پہ ہی کھیل کے کھلاڑی بنی ہوں کیونکہ لڑکیوں کے لیے اکیڈمیز تو تھیں نہیں اور نہ ہی اسکول میں کرکٹ تھی۔ نہ کلب لیول پہ کچھ تھا۔ جس طرح کا سیٹ اپ آج ہے، پہلے نہیں تھا تو بھائی کے ساتھ کھیلتی تھی۔ ہم کنٹونمنٹ ایریاز میں رہے ہیں۔ آرمی کی وجہ سے کافی اچھا ماحول تھا۔ جس کا فائدہ اٹھایا اور بہت زیادہ کرکٹ کھیلی۔"

"پھر سفر کیسے شروع ہوا؟ قومی کرکٹ تک کیسے رسائی ہوئی اور کیا کیا ٹورنامنٹ کھیل چکی ہیں؟"

"میں نے دو ٹرائلز دیے تھے۔ ایک کراچی میں اور ایک لاہور میں۔ جب انڈر 21 کی انڈیا کی ٹیم آرہی تھی۔ اس میں میرا اسلیکشن ہوا، ٹاپ 16 میں پورے پاکستان سے۔ پھر میں نے اپنی باؤلنگ سے ٹیم میں جگہ بنائی۔ جب باؤلنگ اچھی ہوگئی تو بیٹنگ پہ توجہ دی اور نمبر گیارہ سے بیٹنگ شروع کی۔ اب ٹاپ آرڈر میں بھی کھیلنا شروع کردیا ہے۔ میری پرفارمنس میرے پہلے ہی ٹورنامنٹ میں بہت اچھی تھی۔ ہمارا پہلا ٹورنامنٹ ایشیا کپ 2005ء میں کراچی میں ہوا تھا۔ اس میں مجھے "بیسٹ پلیئر آف پاکستان" ملا تھا۔ پھر 2008ء میں کوالیفائنگ راؤنڈ میں "پلیئر آف دی ٹورنامنٹ" تھی۔ میری پرفارمنس شروع سے ہی بہت اسٹرونگ رہی ہے۔ 2006ء سے لے کر 2009ء تک میں کراچی ٹیم کی کپتان رہی اور بغیر کوئی میچ ہارے ہم تقریباً 3 سال تک نیشنل چیمپئن رہے۔ ان ساری پرفارمنسز کو دیکھتے ہوئے 2009ء میں آسٹریلیا کے ورلڈ کپ سے پہلے پی سی بی نے مجھے کپتانی کی آفر کی تو کھلاڑی سے کپتانی کا یہ سفر ہے میرا۔ اس چار پانچ سال کے عرصے میں میں نے نئی لڑکیوں کو بھی متعارف کرایا ہے۔"

"بحیثیت وومن کرکٹر کے آپ کو کیا مشکلات پیش آتی ہیں؟ کیا مسائل درپیش ہوتے ہیں؟"

"مختلف شہروں کی لڑکیوں کے مختلف مسائل ہوتے ہیں۔ بڑے شہروں میں سہولیات ملتی ہیں۔ چھوٹے شہروں میں نہیں ملتیں۔ گراؤنڈز بالکل نہیں ہوتے۔ بہت ہی مخصوص گراؤنڈز ہوتے ہیں۔ وومن کرکٹرز کے لیے کوئی اکیڈمی نہیں ہے۔ لڑکیوں کی اپنی اکیڈمی کی بہت ضرورت ہے۔ گراؤنڈز کا ہمیں بہت مسئلہ ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں پریکٹس کے لیے بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"عمر کی کوئی قید بھی ہوتی ہے کہ اس عمر تک کھیلنا ہے اور پھر ریٹائرمنٹ لے لینی ہے؟ اور میڈیا کوریج کے لیے آپ کیا کرتے ہیں؟"

"عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ آپ جب تک فٹ ہیں کھیل سکتی ہیں اور میڈیا کوریج بھی آہستہ آہستہ ملنی شروع ہوگئی ہے۔ ابھی جیو سپر میں ہمارا پورا ٹورنامنٹ لائیو آیا ہے۔ میڈم بشریٰ اعتزاز احسن اس پہ بہت کام کررہی ہیں۔ آہستہ آہستہ کافی بہتری آتی جارہی ہے پی ٹی وی اسپورٹس نے بھی ہمارے کچھ میچز دکھائے ہیں۔"

"میل کرکٹرز کو اچھے معاوضے، رہائش، ہوٹلز اور پلاٹ ملتے ہیں۔ آپ کو یہ سب کچھ ملتا ہے؟"

"ہمیں بھی اچھا معاوضہ، رہائش اور ہوٹلز بھی ملتے ہیں۔ مگر ہمارا اور لڑکوں کا بنیادی فرق یہ ہے کہ ہمیں انٹرنیشنل ٹورز کم ملتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم تھوڑا پیچھے رہ جاتے ہیں، ہم جتنے انٹرنیشنل میچز اور ڈومیسٹک میچز کھیلیں گے، ہماری اتنی ہی اچھی کارکردگی ہوگی۔"

"کن کھلاڑیوں کو آؤٹ کرکے آپ نے شکر کیا کہ میں نے اس کو آؤٹ کرکے کمال کردیا؟"

"کھلاڑی تو ہر ٹیم میں ہی بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ سب کو ہی آؤٹ کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی انڈیا کی ٹیم میں متالی راج (کپتان) کو آؤٹ کرکے بہت سکون ملا۔ ویسٹ انڈیز میں ڈوٹن کو آؤٹ کرکے بہت اچھا لگا اور انگلینڈ میں شارلٹ کو آؤٹ کرکے بہت خوشی ہوئی۔"

"جیت کو سیلیبریٹ کس طرح کرتی ہیں اور پاکستان کے بارے میں، حالات کے بارے میں سوالات ہوتے ہیں؟"

"شور مچا کر، ہلا گلا کرکے، دو نفل شکرانے کے پڑھ کر اور سب کے ساتھ شاپنگ کرکے اور پھر اگلے میچ کی تیاری میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کے سفیر ہوتے ہیں اور جو مشکلات ہمارا ملک فیس کررہا



ہے اس سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا ہمیں باہر کے میڈیا کے سامنے کرنا پڑتا ہے۔ کافی مشکل سوالات ہوتے ہیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے بڑا اچھا امیج پیش کیا ہے اپنے ملک کا اور ان کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ ساری باتیں سچ نہیں ہوتیں۔ پاکستان میں عورتوں کو آزادی ہے اور وہ ہر فیلڈ میں آگے آگئے ہیں۔"

"گھر والے آپ پر فخر کرتے ہیں؟"

"بہت فخر کرتے ہیں گھر والے اور یہ مقام حاصل کرنے کے لیے، بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور اس میں ہمارے گھر والوں کا ہی ساتھ ہوتا ہے۔"

"پاکستان آکر پریکٹس پہ زیادہ زور ہوتا ہے یا دعوتیں کھانے کا؟"

"پاکستان میں ہوتی ہوں تو پریکٹس پہ ہی زیادہ زور دیتی ہوں۔ اپنوں سے ملاقات بہت کم ہی ہوتی ہے۔ گزشتہ پانچ عیدیں ہم نے اپنے گھر والوں کے ساتھ نہیں گزاریں۔ یا تو ہم ٹور پہ ہوتے ہیں یا کیمپ میں۔ خاندان میں بہت سی شادیاں ہوئیں... اور بھی بہت

سے ایسے مواقع ہوتے ہیں جن میں ہم نہیں ہوتے بہت قربانیوں کے بعد یہ مقام ملتا ہے۔ ہم گھر آ بھی جاتے ہیں تو دعوتیں نہیں اڑا سکتے کہ ہمیں روز پریکٹس پہ جانا پڑتا ہے۔"

"خاندان میں شادیوں کی بات کی تو آپ اپنے بارے میں کچھ کہیں گی؟ شادی کے بعد کرکٹ جاری رکھیں گی؟"

"جو بھی وقت مقرر ہے اس پہ شادی ہو جائے گی مجھے تو اسی پہ یقین ہے۔ بہت سی باتیں انسان پلان نہیں کرتا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی پلان کرتا ہے اور شادی کے بعد کرکٹ کو جاری رکھنے والی بات پہ میں کہوں گی کہ بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو اپنی زندگی اور اپنے پروفیشن کو ساتھ لے کر چل رہی ہیں۔"

"ڈائٹ کا خیال رکھتی ہیں؟ خواتین کو تو اپنے رنگ و روپ کا بہت خیال ہوتا ہے؟"

"ڈائٹ کے لیے تو میں آپ کے ڈائجسٹ کے ذریعے خواتین کو یہ کہنا چاہوں گی کہ دودھ اور کیلشیم خواتین کے لیے بہت ضروری ہے۔ کیونکہ عورت خواہ ہاؤس وائف ہو یا کھلاڑی اس کی لائف بہت ٹف ہوتی ہے۔ اس لیے پانی، سبزیوں اور پھلوں کا استعمال بہت کیا کریں ..... اگر رنگ و روپ کا خیال ہوتا تو کم سے کم کرکٹ تو کبھی نہ کھیل سکتی ..... اگر ملک کو ری پریزنٹ کرنا ہو تو پھر رنگ و روپ کا خیال نہیں کرنا چاہیے۔ سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ رنگ خراب ہو جاتا ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ جو رنگ خدا نے دے دیا ہے۔ اس کو کوئی خراب نہیں کر سکتا اور پھر بندے کو اچھا انسان ہونا چاہیے۔ میں رنگ کو اتنی اہمیت نہیں دیتی۔"

"لباس کے معاملے میں آپ کی کیا چوائس ہے؟"

"ہمارا آفیشل ڈریس شلوار قمیص ہے اور کرکٹ ڈریس ٹراؤزر اور شرٹ ہے جو کہ بہت ڈیسنٹ ہے۔"

"آپ اب تک کتنے "وومن آف دی میچ" حاصل کر چکی ہیں اور عالمی رینکنگ میں ہماری ٹیم کون سے نمبر پر ہے؟"

"کافی ہیں۔ بین الاقوامی طور پر پانچ چھ ایوارڈز تو حاصل کر ہی چکی ہوں اور ڈومیسٹک تو اتنے ہیں کہ اب تو مجھے یاد بھی نہیں ہیں۔ انٹرنیشنلی تو "پلیئر آف دی ٹورنامنٹ" بھی رہی ہوں "پلیئر آف دی میچ" بھی رہی ہوں اور رینکنگ میں ٹی ٹوئنٹی میں ہم نمبر سات ہیں جبکہ ون ڈے میں ہم نمبر آٹھ ہیں۔ مگر ان شاء اللہ ہم بہت جلد اپنی رینکنگ اچھی کر لیں گے۔ لیکن ایک اچھی بات یہ ہے کہ ہماری چار پلیئرز ٹاپ 20 کی ر میں ہیں۔ ان میں بسمہ معروف وائس کپتان بیٹنگ میں اور ندا ڈار، سعدیہ یوسف اور میں باؤلنگ میں ..... میرا نمبر دسواں ہے۔ سعدیہ کا چودہواں اور ندا کا پندرہواں ہے۔ پہلی مرتبہ پاکستان کی چار لڑکیاں آئی سی سی کی رینکنگ میں آئی ہیں۔"

"فیوچر پلاننگ کیا ہے؟ جب کرکٹ چھوڑیں گی تو پھر کوچنگ کرنی ہے یا کمنٹری؟"

"بہت آ گے کا نہیں سوچتی۔ ابھی تو کرکٹ کھیل رہی ہوں۔ لیکن کوشش کروں گی کہ کسی نہ کسی طریقے سے کرکٹ سے وابستہ ضرور رہوں۔ ویسے سوشل ورک کی طرف بھی میرا کافی رجحان ہے تو اس طرف آنے کا بھی ارادہ ہے۔"

"چلیں جی! کرکٹ کی تو بہت باتیں ہو گئیں۔ اب یہ بتائیں کہ مزاج کی کیسی ہیں؟ غصہ آتا ہے کہ نہیں؟ اور دوران میچ بھی غصہ آتا ہے؟"

"میں ایک نارمل انسان ہوں، اس لیے غلط بات پہ غصہ بھی آتا ہے ـــ نہ بہت کم آتا ہے، نہ بہت زیادہ آتا ہے۔ غصے میں خاموش ہو جاتی ہوں۔

اور کپتان کی جاب کافی ٹف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ ہر کھلاڑی کو مختلف انداز میں ڈیل کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ سب کی نفسیات میں فرق ہوتا ہے۔ کسی کو تھوڑی سختی سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ کسی کو پیار کی بات سمجھ

میں آتی ہے۔ کسی کو اعتماد دے کر سمجھ میں آتی ہے ... تو پچویشن کے حساب سے سب کو لے کر چلتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوں اور میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ سینئرز کی بھی مجھے سپورٹ حاصل ہے، جیسے کراچی کی نین عابدی، بتول، بسمہ معروف، ماویہ میری اچھی دوست پلیئرز ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا ہے۔ اس طرح میڈم بشریٰ اور ذکا اشرف صاحب یہ سب مل کر ہمیں ایسا ماحول دیتے ہیں کہ ہم اپنی پرفارمنس کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔"

"کچن سے کتنی دوستی ہے؟ سب سے اچھی چیز کیا پکا لیتی ہیں؟"

"بس جی! کھانے کی حد تک لگاؤ ہے۔ پکانے کی حد تک گھر میں مدد ضرور کرتی ہوں۔ مگر سچی بات ہے کہ اتنا ٹائم ہی نہیں ملتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ بالکل کچھ نہیں آتا۔ کچھ نہ کچھ اپنے شوق کی چیزیں پکا ہی لیتی ہوں۔ میں پاستا بہت اچھا پکا لیتی ہوں۔"

"کون سے چینلز دیکھتی ہیں یا ٹی وی دیکھنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا؟"

"ٹی وی جب دیکھنے کا ٹائم ملتا ہے تو پھر زیادہ تر اسپورٹس چینل یا پھر کوئی مووی دیکھ لیتی ہوں۔"

"جس طرح میل کرکٹرز مختلف برانڈز کے کمرشلز کرتے ہیں۔ آپ کیوں نہیں کرتیں؟ مطلب آپ اور دیگر لڑکیاں؟"

"نہیں! ہمیں ایسی کوئی آفرز نہیں آتیں۔ لیکن اگر اس طرح کی آفرز ہمیں بھی آئیں تو ہم بھی ضرور کریں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پتا چلے کہ لڑکیوں کی بھی ایک کرکٹ ٹیم ہے پاکستان میں۔"

"کرکٹ کے علاوہ کون سا کھیل آپ کو پسند ہے اور اپنے کھلاڑیوں میں کون پسند ہے؟"

"کالج لیول پہ میں نے باسکٹ بال کافی کھیلی ہے۔ ٹینس بہت پسند ہے مگر صرف دیکھنے کی حد تک۔ کھلاڑیوں میں سب اچھے ہیں۔ عمران خان تو شروع سے ہی آئیڈیل رہے ہیں۔ یونس خان بہت اچھے کپتان رہ چکے ہیں۔ ان کی شخصیت بہت اچھی ہے۔ باقی بھی اچھے ہیں۔"

"زندگی کو کس طرح دیکھتی ہیں اور کبھی کرائسز سے گزریں؟"

"زندگی کو ڈے بائے ڈے دیکھتی ہوں اور کرکٹ کے کرائسز سے بہت مرتبہ گزری ہوں۔ کبھی پرفارمنس خراب ہو جاتی ہے۔ کبھی ٹیم کی پرفارمنس خراب ہوتی ہے۔ مشکلات بھی آتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی کچھ رکاوٹیں بھی آتی ہیں تو بس یہی کرائسز ہوتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں کہ ہوم ورک کریں اور بہت اچھا کھیل پیش کریں۔ کیونکہ پورے ملک کی ذمہ داری ہم پر ہوتی ہے۔"

"گھر سے باہر کھانا کھانے جاتی ہیں تو کون سی جگہ جاتی ہیں؟ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں، ڈھابے پہ یا سمندر کے کنارے؟"

"ہر طرح کی جگہوں پر جانے کو دل چاہتا ہے پاکستانی ڈھابوں کی بھی اپنی ہی ایک کشش ہے۔ مجھے ہر طرح کا کھانا پسند ہے۔ چونکہ ہم کشمیری ہیں تو ویسے ہی کھانے کے شوقین ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ثنا میر سے اجازت چاہی۔

عدنان

نفسیاتی اور ذہنی الجھنیں

ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ بیماریاں یا الجھنیں انسانی جسم پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ بھوک نہیں لگتی یا کم لگتی ہے۔ نتیجے کے طور پر غذا یا خوراک کم ہو جاتی ہے اور غذا کی کمی کے باعث جسم کمزور ہو جاتا ہے اور جب جسم کمزور ہو جاتا ہے تو الجھنیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے...... میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ ذہنی اور نفسیاتی مریض ہیں یا آپ کا کوئی عزیز یا دوست مریض ہے تو اس کی خوراک پر خاص توجہ دیں۔ پوری یا اچھی خوراک سے الجھنوں میں کمی ہوگی۔ بھوک کے علاوہ قبض یا دست' آنتوں کی سوزش کا مرض بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ خوف و ہراس کی صورت میں معدہ کی جھلی خشک ہو جاتی ہے بلکہ اگر ذہنی بیماریاں شدت اختیار کر جائیں تو السر کی بیماری بھی ہو سکتی ہے۔ دماغ میں ایک دھواں سا اور دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کو دمہ بھی ہو جاتا ہے۔ ذہنی الجھنوں کا اثر دانتوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ دانتوں کے ماہرین کے مطابق خوف' ناکامی اور فکرات کے مریض اکثر دانتوں کے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے انسان نسیان (بھولنے کا مرض) کا شکار ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ طبیعت میں غیر مستقل مزاجی آجاتی ہے۔ غصہ بھی جلدی آجاتا ہے۔ سستی اور کاہلی بھی آجاتی ہے۔ دوسروں سے ملنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان بیماریوں سے چھٹکارا پانے کا آسان طریقہ القاء النفسی ہے کہ انسان کو جو کچھ میسر ہو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔ حسد سے تو الجھنیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ مقصد میں ناکامی کی صورت میں مقصد کا معیار کم کر لینے میں کوئی ہرج نہیں اور نہ ہی اس کا متبادل قبول کرنے میں کوئی ہرج ہے' کسی مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا اندازہ بھی کر لینا چاہیے۔ اپنی ذات سے باہر نکل کر دوسروں کے ساتھ گھل مل کر رہنے سے بھی بہت سی الجھنوں سے نجات مل سکتی ہے۔

ساجدہ صاحبہ

آپ کا خط پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے پاس بہت فالتو وقت ہے اور بیشتر اوقات خالی اور خالی دماغ رہتی ہیں اور سوچ سوچ کر خود کو خوف زدہ کرنے کا شوق ہے' ورنہ نہ آپ کو کوئی الجھن ہے اور نہ ہی کوئی پریشانی۔ بس یہ سب آپ کے شوق کی پیداوار ہے۔

آپ کی دلچسپیاں کم ہیں' ان میں اضافہ کریں۔ ڈیل کارنیگی کہتا ہے کہ پریشانیوں کا بہترین علاج مصروفیت ہے۔ آپ اپنا جائزہ لیں کہ آپ اپنے آپ کو کس قدر مصروف رکھتی ہیں۔ آپ اپنی سوچوں کا رخ پلٹیں' اپنے گھر کے لوگوں کو محبت دیں' ان میں' ان کے مسائل میں دلچسپی لیں۔ اس کے بعد جو وقت آپ کے پاس بچے' اس وقت میں اپنی ڈگری کا استعمال کریں۔ ٹیوشنز پڑھائیں اور حالات ٹھیک ہوں تو مفت پڑھائیں۔ اپنے آپ کو اتنا مصروف کر لیں کہ آپ کی الجھنیں اپنی موت آپ مر جائیں۔ باقی رہا خدا...... تو خدا تو وہی ہے جو آپ کے نہ چاہنے کے باوجود آپ کے سانس کو جاری رکھتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ج۔ل۔ شیخوپورہ

مجھے بچپن ہی سے پڑھنے اور نام بنانے کا شوق ہے۔ میں خود ہی پڑھائی کرتی اور اپنے پیپروں کی تیاری بھی خود ہی کرتی۔ بہت محنت کرتی' مگر ہر بار رزلٹ صفر ہی ہوتا۔ میں نے بہت ہی شوق سے سائنس لی تھی' لیکن رزلٹ میں مر کر ہی پاس ہوئی۔ پھر میں نے حوصلہ کر کے بی اے میں داخلہ لیا' وہ بھی نامکمل رہا۔ مسئلہ جو میری سمجھ میں آتا ہے وہ یہی کہ مجھ میں کانفیڈنس نہیں ہے اور یہ کہ میرے دماغ کا لیول بہت ہی چھوٹا ہے' یعنی کمزور' جو بھی یاد کروں جلدی ہوتا نہیں اور ہو بھی جائے تو رہتا نہیں۔ اب پھر بی اے کے امتحان میں انگلش کا سپلی پیپر دینا ہے۔ آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں۔ اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی بے مقصد ہی لگتی ہے۔ اب تو مجھے شادی سے بھی ڈر لگتا ہے کہ اس کا رزلٹ بھی ایسا ہی ہوگا' شاید میں کسی چیز کے قابل نہیں ہوں۔

اک بات جو میں پڑھائی کے وقت نوٹ کرتی ہوں کہ مجھے اک دم سستی' غنودگی سی محسوس ہونے لگتی ہے' آنکھیں جلنے لگتی ہیں اور دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ گردن کے پٹھے میں بھی درد ہوتا ہے اور پڑھا نہیں جاتا ہے۔ چوتھی کلاس سے ہی میں نے کچھ بننے کا خواب دیکھا۔ حالانکہ سب خواب ٹوٹ گئے' مگر پھر بھی ہمت نہیں ہارتی ہوں۔

اچھی بہن! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ دل سے یہ بات نکال دیں کہ آپ ذہین نہیں ہیں' آپ کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ایک ذہین' سمجھ دار لڑکی ہیں۔ البتہ قوت حافظہ کم ہو سکتی ہے۔ پڑھتے ہوئے جو بے زاری ہوتی ہے۔ اس کی وجہ مضمون میں عدم دلچسپی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ آپ نے جو مضامین منتخب کیے تھے۔ ان میں آپ کو کتنی دلچسپی تھی۔ ممکن ہے اگر آپ اپنی دلچسپی کے مضامین لیتیں تو آپ کو اتنی مشکل نہ پیش آتی۔

اگر آپ کو یاد نہیں ہوتا یا یاد کیا ہوا بھول جاتی ہیں تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ یاد کریں اس کو بار بار لکھتی رہیں۔ ذہن پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں' روزانہ دو یا چار صفحات پڑھیں اور انہیں یاد کر کے لکھنے کی کوشش کریں۔

شادی اور امتحان تو بالکل دو مختلف باتیں ہیں۔ شادی کی کامیابی کے لیے خلوص' محبت' ایک دوسرے کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے یہ بات دل سے نکال دیں کہ آپ کی شادی کامیاب نہیں ہوگی۔ آپ ایک بہترین اور خوش گوار زندگی گزار سکتی ہیں اور اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہیں۔ آپ میں بہت ساری خوبیاں بھی ہیں۔ آپ محنتی ہیں۔ آگے بڑھنے کی جستجو اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ بار بار ناکامی کے باوجود آپ نے ہمت نہیں ہاری' یہ بہت بڑی خوبی ہے اور کامیابی کی اولین شرط یہی ہے کہ حوصلہ نہ ہارا جائے۔

انگلش کے پیپر میں کامیابی کے لیے ممکن ہو تو کسی کوچنگ سینٹر سے مدد لے لیں۔ دراصل امتحانی نقطۂ نظر سے تیاری بہت اہم ہے' وہ آپ کی مناسب رہنمائی کریں گے اور تیاری میں مددگار ثابت ہوں گے۔

ش۔ ز۔ لاہور

جو صورت حال آپ نے لکھی ہے' اس کے مطابق آپ کے شوہر بے راہ روی کا شکار ہیں۔ طلاق کا مشورہ نہیں دیا جا سکتا کہ بچوں کا مسئلہ ہوگا۔ آپ اللہ سے دعا کریں کہ اللہ انہیں سیدھا راستہ دکھائے۔ لیکن آپ مایوس نہ ہوں۔ صورت حال کسی وقت بھی بدل سکتی ہے' لیکن ایک کام آپ کو بھی کرنا ہے' آپ خود کو تھوڑا سا بدلیں۔ مناسب میک اپ اور جدید فیشن کے لباس سے خود میں کشش پیدا کریں' تاکہ آپ کے شوہر آپ پر توجہ دینے کے لیے مجبور ہوں۔ اپنے شوہر کو بھرپور توجہ اور محبت دیں' گھر کے ماحول کو بہتر بنائیں' کیونکہ بعض اوقات وہ انداز' وہ برتاؤ' وہ گرم جوشی' وہ استقبال گھر پر مل جائے تو بھی بہتر نتائج سامنے آتے ہیں۔

☼



امت الصبور

بیوٹی بکس

فائزہ عثمان..... گوجرانوالہ

س : میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں تو کافی حد تک سفید ہیں مگر چہرے کا رنگ ذرا کالا ہے' بہ نسبت ہاتھ پاؤں کے اور میرے ماتھے پر چھوٹے چھوٹے دانے ہیں۔ جو بعد میں کیل بن جاتے ہیں اور بہت برے لگتے ہیں۔ مہربانی فرما کر کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میرے چہرے کا رنگ کچھ ہی دنوں میں صاف نظر آئے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ میری کمر بے حد پتلی ہو اور میں بالکل اسمارٹ اور صحت مند رہوں کوئی ایسی ایکسرسائز بتائیں جس سے کمر پتلی ہی رہے اور مزید نہ بڑھے۔ میری عمر اٹھارہ برس ہے۔

ج : چہرے کی خوب صورتی میں اضافہ کرنے کے لیے روزانہ دو تین چمچے شہد پانی میں ملا کر پئیں۔ اس سے چہرے کی رنگت نکھر جائے گی۔ رات کو سونے سے پہلے بلیچنگ کریم لگائیں۔ اس سے بھی چہرہ نکھر آتا ہے۔ ماتھے کے دانوں پر n - Betnovate کریم لگائیں۔

درج ذیل ورزش کے ذریعے آپ کی کمر پتلی ہو سکتی ہے۔ دونوں پاؤں ایک سیدھ میں کر کے کھڑی ہوں۔ کمر سے بائیں جانب جھکنے کی کوشش کریں۔ پھر اصلی حالت میں لوٹ آئیں۔ اس کے بعد دائیں جانب جھکنے کی کوشش کیجیے۔ پھر اپنی اصلی حالت میں لوٹ آیئے۔ اس طرح یہ عمل روزانہ دس بار کریں۔

رانی مختار سید..... سوہاوہ ضلع جہلم

س : میری عمر اکیس سال ہے۔ میری جلد بہت زیادہ خشک ہے۔ اس حد تک خشک ہے کہ اگر گرمیوں میں بھی کولڈ کریم نہ لگاؤں تو چہرہ اکڑ جاتا ہے۔ میک اپ صحیح نہیں کر سکتی۔ میرے چہرے پر آنکھوں کے نیچے اور ناک کے اردگرد چھائیاں ہیں۔ چہرے پر دانے اور داغ بھی ہیں۔ دانے تو چار' پانچ دنوں بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ داغ نہیں جاتے۔ ہونٹوں کے اردگرد آنکھوں کے نیچے ناک کے پاس بہت زیادہ باریک باریک لائن یعنی لکیریں جھریوں کی طرح ہیں۔ یہ بتائیں کہ خشک جلد والے کون کون سے میک اپ لوں اور خشک جلد سے میک اپ اتارنے کے لیے کون سی کریم لگاؤں اور یہ بھی کہ چہرے کو جھریوں سے بچانے کے لیے کون سی کریم لگاؤں؟

ج : رانی بہن! آپ چہرے پر تمام چیزیں لگا کر دیکھ چکی ہیں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اب آپ اپنی غذا پر توجہ دیں۔

خوراک میں دہی شامل کریں۔ روزانہ کم از کم آدھا کلو دہی لسی بنا کر یا کسی اور طریقے سے کھانے میں ضرور شامل کریں۔ دہی میں نمک مرچ اور زیرہ ملا کر روٹی کے ساتھ بھی کھا سکتی ہیں۔ ہونٹوں کے گرد جھریاں بھی خشک جلد کی وجہ سے ہیں۔

آپ ایک چمچہ شہد میں لیموں کے چند قطرے اور خالص عرق گلاب آدھا چمچہ ملا کر چہرے پر لگائیں اور پندرہ منٹ بعد دھو لیں۔ اس سے چہرے کی خشکی دور ہو گی اور رنگت نکھر آئے گی۔

میک اپ کرنے سے پہلے موسچرائیزر یا موسچرائزنگ لوشن لگائیں۔ یہ لوشن جلد کو نمی اور روغن فراہم کرتا ہے۔ میک اپ اتارنے کے لیے کوئی سی بھی کولڈ کریم استعمال کر سکتی ہیں۔